قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

دسمبر 2018 قیمت ₹15

ماہنامہ

اردو دنیا

نئی دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

کے لیے اردو کی تاریخ کا سب سے خوب صورت، خوب سیرت شاندار رسالہ

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ

بچوں کی دنیا

دہلی

Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں

قسط وار ناول

دل چسپ کہانیاں

معلوماتی مضامین

ہنسنے ہنسانے کی باتیں

ان کے علاوہ:

کہکشاں ♦ سیاحتی مقامات

اردو فیس بک ♦ دماغی ورزش

ننھے فنکار ♦ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

سب سے زیادہ چھپنے والا بچّوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے　　سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002 فون: 24415194 - 040

اُردو دُنیا

ماہنامہ

دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:20،شمارہ:12،دسمبر 2018

مدیر : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

نائب مدیر : ڈاکٹرعبدالحی

ناشراورطابع

ڈائرکٹر،قومی کونسل برائے فروغِ اردوزبان

وزارت ترقی انسانی وسائل،محکمۂ اعلیٰ تعلیم،حکومتِ ہند

مطبع:

ایس نارائن اینڈسنز،بی۔88،اوکھلاانڈسٹریل ایریا

فیز-II،نئی دہلی-110020

مقامِ اشاعت: دفترقومی اردوکونسل

کمپوزنگ:محمداکرام

ڈیزائننگ:محمدزید

قیمت-/15روپے سالانہ -/150روپے

Total Pages:**100**

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردوکونسل NCPULاور اس کے مدیر کا متفق ہوناضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL,New Delhiکے نام ارسال کریں

صدردفتر

فروغِ اردوبھون،ایف سی 33/9،انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ،۔

نئی دہلی-110025

فون:49539000 شعبۂ ادارت:49539009

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in

E-mail: editor@ncpul.in

urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8،ونگ-7 آر کے پورم،نئی دہلی۔110066

فون: 26109746، فیکس:26108159

ای میل:sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com

شاخ:110-7-22،تھرڈفلور،ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی،حیدرآباد۔500002

فون:040-24415194

اداریہ

ہماری بات 4

خطوط

آپ کی بات — قارئین کے خطوط — 5

رپورٹ

مہاتما گاندھی اورنظریہ قومی زبان — مسرت وحمیراخاتون — 7

زبان و تعلیم

ہندوستان میں اردوذریعہ تعلیم — مصباح انظر — 11

نقد و نگاہ

جنوبی ہند کے معمارِادبِ اطفال مولانا حافظ عبدالرزاق حافظ باقوی — راہی فدائی — 13

مسلم شعرا کے کلام میں امام الہند رام — اسدرضا — 16

اردوشاعری میں ذکرگرونانک — ریحان حسن — 18

چکبست کی شاہکار نظم ’رامائن‘ کا ایک سین — سنجے کمار — 22

سندی تحقیق کے ارکانِ ثلاثہ — شاذیہ تمکین — 25

علی جوادزیدی کی خاکہ نگاری — گل جبین اختر — 30

اخترمسلمی کی شاعری میں موضوعاتی تنوع — ارشداحمد کوچھے — 35

گوشہ یوسفی

طنزومزاح کا عہدزرّیں: مشاق احمد یوسفی — منظوروقار — 38

مشتاق احمد یوسفی: بات برگ گلاب — غفنفراقبال — 40

مشتاق احمد یوسفی: لطیفہ گوو پرمزاح نثرنگار — سیدالفت حسین — 42

خراج عقیدت

ڈپٹی نذیراحمد — محمداحمد دانش روانوی — 45

قاضی عبدالستار: ایک منفردفنکار — محمدشارب — 47

ہم نے جنھیں بھلا دیا

ڈاکٹر ہیرالال چوپڑہ عشرت حافظ آبادی: بحیثیت غزل گو — کمار پانی پتی — 49

تاریخ و ثقافت

ابراہیم نامہ میں بیجاپور — محمدسمیع الدین — 52

چراغ دل

حاجی امداداللہ مہاجرمکی — ندیم احمدانصاری — 54

شہربین

کوکن کتنا حسین ہے! — محمددانش غنی — 58

سائنس/ٹکنالوجی

انٹرنیٹ کی تعریف،تاریخ اوروائرس — عبدالمغنی صدیقی — 61

فلم

ندافاضلی فلمی وادبی دنیا کی مشترکہ وراثت — معصوم زہرا — 64

کریئر

مسابقتی امتحانات — فہیم احمدعبدالباری — 66

کمپیوٹر

ایم ایس آفس 69

کتابوں کی دنیا

تعارف وتبصرہ — ادارہ — 72

خبرنامہ

اردودنیا کی خبریں — ادارہ — 81

ہماری بات

دنیا کی بہت ساری زبانیں مرتی جارہی ہیں۔ زبانوں کی موت ہمارے عہد کا ایک گمبھیر مسئلہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ دنیا میں سات ہزار زبانیں بولی جاتی ہیں جن میں سے آدھی زبانیں خطرے سے دوچار ہیں۔ خاص طور پر جن زبانوں کے ذریعے علم وعرفان کی کی روشنی پھیلی اور ان زبانوں نے بہت سی زبانوں کو جنم دیا آج وہ زبانیں بھی رفتہ رفتہ معدوم ہوتی جارہی ہیں۔ دوسری شکل میں ان زبانوں کو زندگی ضرور مل گئی ہے۔ مگر اب ان کا کوئی فنکشنل کردار نہیں رہ گیا ہے جس کی وجہ سے ان زبانوں سے عام لوگوں کی دلچسپی ختم ہوتی جارہی ہے۔ ہمارے قدیم رسم الخط بھی ختم ہوتے جارہے ہیں اور جن زبانوں میں علوم وفنون کا بیش بہا ذخیرہ تھا وہ زبانیں بھی اب بتدریج سکڑ رہی ہیں۔

زبانوں کی کثرت کے اعتبار سے ہندوستان دوسرے نمبر پر ہے۔ یہاں تقریباً 778 زبانیں بولی جاتی ہیں جن میں بہت سی بولیاں اور زبانیں اب ایسی ہیں جن کے بولنے والوں کا تناسب تیزی سے گھٹ رہا ہے اور وہ دوسری غالب یا حاوی زبانوں کا حصہ بنتی جارہی ہیں۔ اس میں زیادہ تر قصور لسانی استعماریت کا ہے۔ زبان اور تہذیب کی تاریخ پر نگاہ ڈالی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ثقافتی بالادستی کے جذبہ نے بھی زبانوں کو ختم کرنے میں بہت منفی کردار ادا کیا ہے۔ جہاں جہاں تہذیبی بالادستی کی جنگ ہوئی ہے وہاں چھوٹی زبانوں اور بولیوں کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑا ہے۔ آج بہت سی پرانی زبانوں کے نام ونشان اس لیے مٹ گئے کہ دوسری بڑی زبانوں نے اپنا تسلط جما لیا ہے اور ان کے تہذیبی نشانات کو بھی مٹا دیا ہے۔ تہذیبی یا لسانی بالادستی نے جس طرح بہت سی زبانوں کو ختم کیا ہے یہ ہمارے لیے بہت تشویش ناک ہے کیونکہ یہ مسئلہ صرف زبانوں کی موت کا نہیں ہے بلکہ یہ انسانی وراثت کے تحفظ سے جڑا ہوا ہے۔ کیونکہ انسانی وراثت صرف ایک تہذیب یا زبان میں محفوظ نہیں بلکہ مختلف زبانوں اور تہذیبوں میں انسانی وراثت کا گراں قدر سرمایہ موجود ہے اور اسی سے ہمیں انسانی رویے، کلچر اور جذبات کا بھی پتہ چلتا ہے۔ بہت سے جذبے اور رویے ایسے ہوتے ہیں جن کا دوسری زبانوں میں اظہار ممکن نہیں ہوتا۔ بہت سے الفاظ اور محاورے ایسے ہیں جن کا دوسری زبان میں کوئی متبادل نہیں ہے اور یہاں اس حقیقت کو بھی یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ انسانی ذہانت پر کسی ایک زبان یا کلچر کی اجارہ داری نہیں ہے۔ ساری زبانوں میں تہذیب و ثقافت کے بہت سے مظاہر محفوظ ہیں۔ اگر یہ چیزیں ختم ہوجائیں گی تو نسل انسانی تاریخ وتہذیب سے محروم ہوجائے گی۔ کیونکہ جب بھی کوئی زبان مرتی ہے تو تاریخ اور تہذیب سے اس کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے۔ ہماری انسانی تاریخ نہ صرف لکھی ہوئی زبان میں محفوظ ہے بلکہ بولی جانے والی زبان میں بھی ہے۔ اس طرح اگر ہم نے زبانوں کو معدوم ہونے سے نہیں روکا اور زبانوں کے تحفظ کے لیے کوئی حکمت عملی تیار نہیں کی تو رفتہ رفتہ بہت ساری زبانیں دم توڑ جائیں گی اور ہم علوم وفنون اور تاریخ وتہذیب سے محروم رہ جائیں گے۔

دراصل جو زبانیں مرتی ہیں اس کی بہت ساری وجوہات ہیں۔ سب سے بڑی وجہ تو یہ ہے کہ اس زبان کے بولنے والوں کا تناسب گھٹنے لگتا ہے۔ تعلیم اور خواندگی کے مواد میں کمی کی وجہ سے بھی بہت سی زبانیں مر رہی ہیں اور جس طبقے یا برادری کی زبان ہے اس طبقے کی عدم دلچسپی بھی اس زبان کی موت کا باعث بن جاتی ہے۔ سماج، سیاست اور معاش بھی زبان کو زندہ رکھتے ہیں اور جب زبان کا رشتہ ان سے کٹ جاتا ہے تو وہ زبان مرنے لگتی ہے۔ اس لیے آج سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ لسانیاتی تنوع کا تحفظ کیسے کیا جائے، زبانوں کو کیسے زندہ رکھا جائے، بولی جانے والی زبانوں کا احیا کیسے کیا جائے، زبانوں کی موت کو زندگی میں تبدیل کس طرح کیا جائے، اس طرح زبانوں کی موت کے مسئلے پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ ماہرین لسانیات سے اس سلسلے میں خاص طور پر مدد لی جاسکتی ہے کہ کس طرح معدوم ہوتی زبانوں کو محفوظ رکھا جائے۔ آج محفوظ رکھنے کی ایک اچھی شکل تکنالوجی کی صورت میں ہمیں مل گئی ہے اس لیے بہتر ہوگا کہ آڈیو اور ویڈیو ٹیپس کے ذریعے ان زبانوں کے تحفظ کی کوشش کی جائے اور ان زبانوں میں لکھے ہوئے دستاویزات کو محفوظ کیا جائے ورنہ آنے والے زمانے میں ہماری تاریخ اور تہذیب کے بہت سارے نشانات معدوم ہوجائیں گے۔ آج پوری دنیا میں جب حیاتیاتی تنوع کے تحفظ کی بات کی جارہی ہے تو لسانیاتی تنوع کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ خاص طور پر ہمیں اپنی مادری زبانوں کے تعلق سے زیادہ بیدار ہونے کی ضرورت ہے۔ ہمیں یہ سوچنا ہوگا کہ ہماری اردو زبان آج کس صورتِ حال سے دوچار ہے۔ کیا اس کے بولنے والوں کا تناسب گھٹ رہا ہے، کیا اس زبان میں تعلیم، خواندگی اور دیگر سائنسی، سماجی مواد کی کمی ہے، کیا اس زبان کے بولنے والے دوسری غالب زبان کا حصہ بنتے جارہے ہیں۔ اور اس طرح کے بہت سے سوالات اردو زبان کے تعلق سے جنم لے رہے ہیں۔ جیسا کہ لسانیاتی سروے سے پتہ چلتا ہے کہ کہ اردو بولنے والوں کی تعداد گھٹ رہی ہے تو یقیناً یہ ہمارے لیے بہت تشویش ناک ہے کیونکہ اگر ہماری زبان کسی اور غالب زبان کا حصہ بن گئی تو پھر ہمارا تاریخی، تہذیبی سرمایہ ختم ہوجائے گا۔ اس لیے ہمیں بڑی سنجیدگی کے ساتھ ہندوستان کی دوسری زبانوں کے ساتھ ساتھ اپنی زبان کے تحفظ کے طریقہ کار پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

عقیل احمد

شیخ عقیل احمد

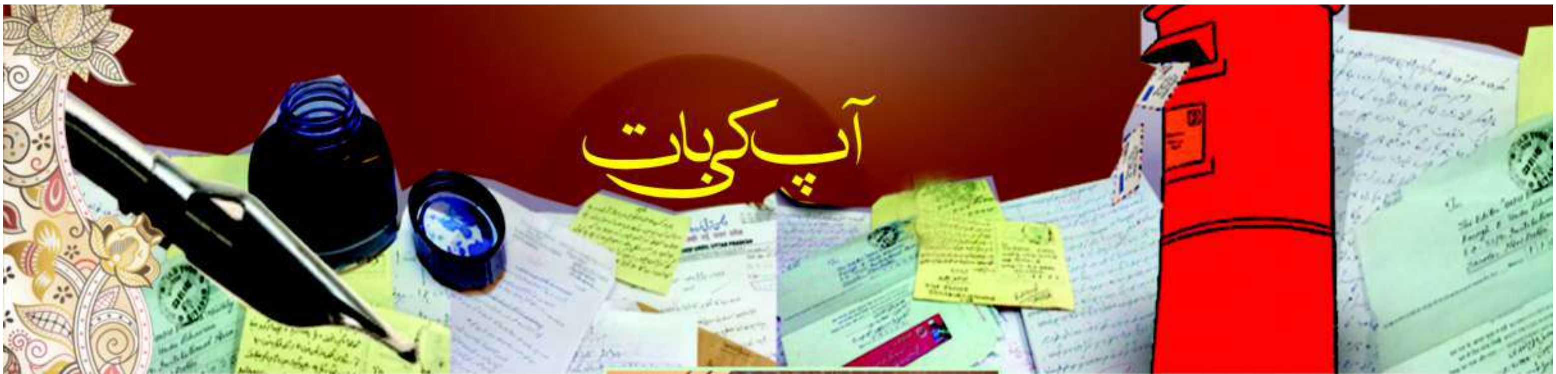

آپ کی بات

'اردو دنیا' نومبر کا شمارہ ملا۔ ابھی تو میں اکتوبر کے شمارے کی ورق گردانی کے بعد تاثر بھی نہ لکھنے پایا تھا۔ خیر نقاش بہتر کشد نقش ثانی! نومبر کے پرچے میں اداریہ پڑھ کر نئے ڈائرکٹر صاحب کے خیالات سے آگہی ہوئی۔ ہاتھوں میں کسی قدر لرزش مگر آنکھوں میں دم برقرار ہے لہٰذا ہر شے میں خوبصورتی دیکھنے کی تمنا زندہ وتابندہ ہے۔

❖ **مقصود الٰہی شیخ**: بریڈفورڈ، برطانیہ

ماہ نومبر کا شمارہ ڈاکٹر شیخ عقیل احمد کی ادارت میں شائع ہوا۔ بطور ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان آپ کی آمد ہمارے لیے نئے راستے کھولے گی جیسا کہ ہماری بات کے تحت آپ نے وہ ساری باتیں بتادیں جو کہ ہمارے دل میں تھیں۔ شخصی نوعیت کے انٹرویو پر بھی آپ کی رائے حق بجانب ہے۔ محبوب خاں اصغر کا انٹرویو قطب سرشار سے 'ترجمہ ایک وجدانی عمل ہے' خوب ہے۔ بڑے عمدہ سوالات کے ذریعہ انھوں نے انٹرویو لیا اس وقت اردو ترجمہ کرنے والوں کو انگلیوں پر گنا جاسکتا ہے۔ وجیتا پرویز کا مضمون سوال کے بعد اردو زبان اور مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی (انجم پروین) پڑھ کر ایسا لگا کہ محترمہ نے حقائق تو بیان کردیے مگر سوالیہ نشان رہ گیا۔ اس یونیورسٹی کا معیار کیا ہے۔ کیا اسٹڈی سنٹر صحیح چل رہے ہیں۔ صفی لکھنوی پر حکیم عبدالناصر فاروقی کا مضمون عمدہ ہے۔ شاید یہ بھی صفی لکھنوی کا شعر ہے۔

شاعری کیا ہے دلی جذبات کا اظہار ہے
دل اگر بیکار ہے تو شاعری بیکار ہے

اسی طرح صفی اورنگ آبادی پر بھی مضمون شائع کریں۔ وہ دکن کے نامور شاعر تھے۔

❖ **ڈاکٹر م۔ق۔ سلیم**: صدر شعبۂ اردو شاداں کالج، حیدرآباد، تلنگانہ

اردو دنیا ہمیشہ کی طرح نت نئے مشمولات لے کر آیا۔ جناب محبوب خان اصغر نے جناب قطب سرشار سے تفصیلی انٹرویو لیا ہے۔ انٹرویو مختصر اور جامع ہوتو اچھا لگتا ہے۔ غیر ضروری طوالت ذہنی کوفت کا باعث بنتی ہے۔ آپ نے اپنی بات میں لکھا ہے۔ ''... ادارے کی طرف سے سوالنامہ تیار کیا جائے گا اور تمام محبان اردو کی خدمت

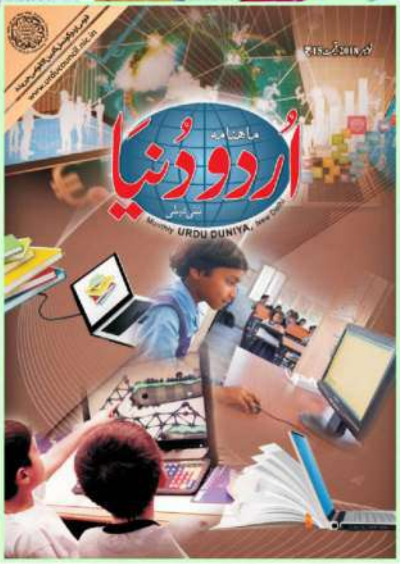

میں پیش کیا جائے گا۔'' یہ بہت اچھی بات ہے۔ آپ نے ایک بات اور کہی کہ ''... گاؤں اور قصبات میں بھی بہت سی ذہانتیں ہیں۔ جن کا مرکزی سطح پر اعتراف نہیں کیا گیا۔'' آج کل ایسا ہوتا آیا ہے کہ دیہات اور قصبات کو نظر انداز کرکے جو ادبی رسالے کونسل کی جانب بھیجے جاتے ہیں وہ بڑے شہروں اور تعلقہ، ضلع جیسے مقامات پر ہی بھیجے جاتے ہیں۔ بہت سارے ایسے چھوٹے چھوٹے دیہات ہیں جہاں اردو کے پرائمری اسکول، ہائی اسکول، جونیئر کالج ہیں وہاں تک رسالوں کی رسائی نہیں ہوتی۔ جناب یحیٰ جمیل (امراوتی) کا مضمون 'ذولسانی ہندو شعرا ایک نظر' بھی خوب ہے۔ کرشن چندر کو ادبی دنیا نے بھلا دیا لیکن 'اردو دنیا' نے یاد رکھا۔ ڈاکٹر صدیق محی الدین نے بھی جاں نثار اختر کی طویل نظم پر اچھی نظر ڈالی ہے۔

❖ **احمد عثمانی**: جونا آزادنگر، گلی نمبر 1، جیلانی چوک، مالیگاؤں

میرے خیال سے تو 'اردو دنیا' جیسا کوئی رسالہ نکل ہی نہیں رہا ہے جو اتنی پابندی سے شائع ہوتا ہو۔ ایک شمارہ پورا نہیں پڑھ پاتے کہ دوسرا آجاتا ہے، اور سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ آرٹ پیپر پر اتنے بڑے سائز کو دیکھ کر ہی دل خوش ہوجاتا ہے۔ ایک 'آجکل' اور دوسرا 'اردو دنیا' دو ایسے رسالے ہیں جو بڑی پابندی سے شائع ہوتے ہیں۔ 'اردو دنیا' کی تو ہر ایک تخلیق قابل مطالعہ ہوتی ہے اور جو تخلیق مجھے سب سے زیادہ بور کرتی ہے اسے میں دوبارہ پڑھتی ہوں تاکہ آخر میں کوئی نہ کوئی نتیجہ ضرور نکل آئے۔ اس شمارے میں آپ کا اداریہ عمدہ ہے۔ آپ نے بالکل درست کہا ہے کہ اردو زبان ہر ملک ہر قوم میں پھیلی ہوئی ہے۔ کیا امریکہ کیا لندن۔ اردو مقبولیت حاصل کرتی جارہی ہے، لیکن ابھی بھی کچھ ایسے علاقے ہیں جہاں لوگ اردو زبان سے واقف نہیں ہیں۔ آج کے دور میں جتنے اردو داں اردو پڑھ رہے ہیں اس سے کہیں زیادہ غیر اردو داں بھی اردو کی شیرینی اور مٹھاس کے دیوانے ہوگئے ہیں۔ علیم صبا نویدی نے خط میں لکھا ہے کہ حالات بدلتے ہیں، وقت بدلتا ہے، لیکن زبان کو بدلنے میں صدیاں لگ جاتی ہیں۔ اس بات نے بے حد متاثر کیا۔ قطب سرشار صاحب سے لیا گیا انٹرویو معلوماتی ہے۔ اس سے کافی معلومات ہوئی۔ سالک جمیل براڑ کا 'بچوں کے ناول نگار کرشن چندر' بہت پسند آیا۔ رفیع الدین ناصر کا ماحول اور موسمی تبدیلی معلوماتی مضمون ہے۔ ویسے تو فلموں سے میں زیادہ دلچسپی نہیں رکھتی لیکن نثار راہی کا مضمون بھی اچھا لگا۔

❖ **استوتی اگرول**: اگروال جیولرز، سرونج، مدھیہ پردیش

ماہنامہ 'اردو دنیا' اکتوبر 2018 کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ رنگارنگ سجا ہوا یہ شمارہ دل کو چھو گیا۔ یوں تو تمام ہی مشمولات اپنی نظیر آپ ہیں مگر علاقہ براڑ کے شہر اچل پور (ضلع امراؤتی مہاراشٹر) کی قدیم روایتی تہذیب وتاریخی معلومات پر مبنی سید غلام علی بیابانی کا مضمون اپنی نوعیت کا انوکھا اور پر مغز مضمون پڑھ کر معلومات کے کتنے نئے گوشے روشن ہوگئے۔ مصنف معروف محقق، مخطوطہ شناس اور ناقد بھی ہیں۔ آپ نے اچل پور شہر کے کبھی مشہور مگر حال میں فراموش شدہ ادبی شخصیات کے نادر ونایاب شعری ونثری قلمی نسخہ جات انتہائی تگ ودو، جانفشانی اور مستقل مزاجی کے ساتھ ان کے ورثا سے حاصل کیے ہیں جس کے حصول میں ان کے مخلص دوست معروف شاعر جناب حیدر بیابانی کا عملی تعاون حاصل رہا ہے۔ موصوف کے پاس قدیم قلمی نسخہ جات اور مخطوطات کا ایک اچھا خاصا ذخیرہ موجود ہے۔ اس لیے آئندہ موصوف سے اور بہتر مضامین کی توقع کی جاسکتی ہے۔

❖ **ایڈوکیٹ حبیب ریتھ پوری**: تعلقہ موری، ضلع امراوتی، مہاراشٹر

ماہ اکتوبر کا 'اردو دنیا' نظر نواز ہوا۔ مشمولات میں رنگارنگی دیکھ کر خوشی ہوئی۔ ڈاکٹر ہمایوں اشرف نے محترم ظہیر صدیقی کا انٹرویو خوب لیا ہے۔ ڈاکٹر عبدالحی نے اورنگ آباد دکن کے مرزا عبدالقیوم ندوی کا انٹرویو لے کر صاحب انٹرویو کی عزت افزائی کی۔ ادھر حالیہ برسوں میں مرزا عبدالقیوم ندوی صاحب نے ولی اور سراج کی سرزمین اورنگ آباد میں کونسل کے رسائل اور مطبوعات کے علاوہ دیگر اہم رسائل کو فروخت کر کے غیر معمولی کردار ادا کیا ہے۔ خاکسار کو عبدالحی کا یہ اقدام قابل ستائش لگا۔ پروفیسر اصغر عباس، پروفیسر عبدالقدوس جاوید، ڈاکٹر مظفر حسین سید، ڈاکٹر عبدالسمیع وغیرہم کی تحریرات متوجہ کن ہیں۔

❖ **ڈاکٹر غضنفر اقبال**: زبیر کالونی، رنگ روڈ، گلبرگہ، کرناٹک

ماہ اکتوبر کا شمارہ نظر نواز ہوا، خوبصورت سرورق، دیدہ زیب اوراق اور معلومات افزا مضامین دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ اردو دنیا آج کے اس ماحول میں بہت بڑی نعمت ہے۔

اردو دنیا کا میں ایک زمانے سے قاری ہوں اور ہمیشہ اس کے نئے شمارے کے آنے کا شدت سے منتظر رہتا ہوں۔ مولانا ابوالکلام آزاد سنٹرل لائبریری میں یہ ہر ماہ پہنچتا ہے اور میں اس کے مضامین سے مستفید ہوتا ہوں۔ اس بار بھی میں نے اس کے چند مضامین کی ورق گردانی کی، جو بہت اچھے لگے۔ اداریہ میں بہت ہی آسان لفظوں میں اردو اور ہندی کے لسانی رشتے پر گفتگو کی گئی ہے۔ ہمایوں اشرف کا ظہیر صدیقی سے لیا گیا انٹرویو بہت خوب ہے۔ ظہیر صدیقی کا یہ جملہ 'صلاحیت نہیں سفارشات پر ملتے ہیں انعامات' مبنی بر حقیقت ہے۔

❖ **محمد ذبیح اللہ تیمی**: جامعہ امام ابن تیمیہ، مشرقی چمپارن، بہار

'اردو دنیا' اکتوبر 2018 میں آپ نے امن پسندی سے متعلق، تشدد پسندی یا شدت پسندی کے خلاف اس جملے سے پرچم امن بلند کیا ہے۔ ''دنیا کے بیشتر مسائل محبت اور مفاہمت سے حل کیے جاسکتے ہیں۔''

'ہماری بات' کے ذریعے اوّل تا آخر، لفظ بہ لفظ، حرف بہ حرف لائقِ عمل پیغام ہے۔ ہمارا وطن عزیز جس نے سرسید کی روشن کی ہوئی مشعل اینگلو اورینٹل کالج سے لے کر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی شکل میں، ہندوستان ہی نہیں عالمی سطح پر علم و ادب، تہذیب و تمدن کے فیضان کی کرنوں کو چار سو بکھیرا ہے۔ موہن داس کرم چند مہاتما گاندھی جیسی آفاقی شخصیت، جس پر ہم کو ناز ہے، سرزمین ہند جس کی کوکھ سے ایسی مایۂ ناز ہستیاں جنمی ہیں، یقیناً ایسے ملک کے باشندوں کو ہر طرح سے امن پسند رہنا چاہیے۔ محترم

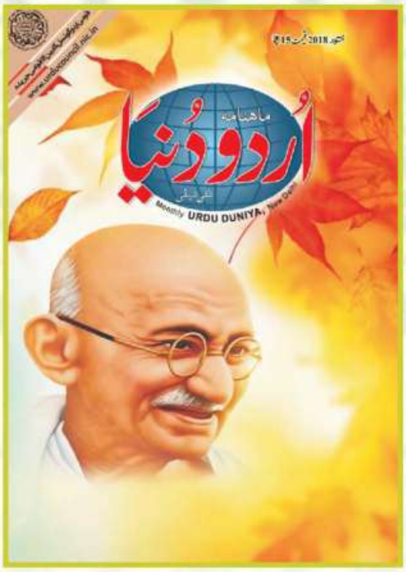

ریاض احمد کا مضمون 'ادبِ اطفال کے درسی مسائل' پاکیزہ خیالات کا مرقع ہے، تاہم اس کے متعلق چند نکات کا اظہار کرنا ہے۔ (1) صفحہ 15 کی سب سے پہلی سطر میں مضمون 'کتے' کے مصنف کا نام کنہیا لال کپور بتایا گیا ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو موصوف سے مضمون میں دیے گئے۔ حوالہ کی دلیل پیش کرنے کا التماس کرتا ہوں تاکہ میری معلومات میں اضافہ ہوجائے۔ میری محدود معلومات صرف اتنی ہے کہ 'کتے' پطرس بخاری کی تخلیق ہے۔ (2) اسی صفحہ نمبر 16 پر تیسرے تحریری حصے میں بچوں کے چند رسائل کے نام ہیں۔ اس فہرست میں مکرمی رحمانی سلیم احمد کی ادارت میں نکلنے والے ماہنامے 'گلشن اطفال' کا نام چھوٹ گیا ہے۔ 2006 سے پابندی کے ساتھ جس کی اشاعت ہورہی ہے۔ (3) صفحہ نمبر 16 کے آخری اقتباس میں جو شعر درج ہے، خارج از بحر ہے۔ (نموناً شعر بھی پیش کیا جائے تو دونوں مصرعے ہم وزن ہوں)۔

خوف کے سائے میں بچے کو اگر جینا پڑا؟
بے زباں ہوجائے گا یا بدزباں ہوجائے گا

مصرعۂ	فاعلاتن	فاعلاتن	فاعلن	
اولیٰ				
	خوف کے سا	ئے مِ گرنچ	چہ پلا	
	2212	2212	212	19=
مصرعۂ فاعلاتن	فاعلاتن	فاعلاتن	فاعلن	
ثانی				
بے زبا ہو 2212	جاء گا یا 22 12	بدزبا ہو 2212	جاء گا 212	26=

❖ **اشفاق کارنجوی**: جی این آزاد اردو ہائی اسکول، آکولہ، مہاراشٹر

اکتوبر 2018 کے اداریہ میں آپ نے محبت اور مفاہمت کے ذریعہ دنیا کے بیشتر مسائل کے حل کی بات کہی ہے، اس میں کوئی دورائے نہیں کہ آج جب کہ ساری اقوام عالم اضطراب و پریشانی کی کیفیت سے دوچار ہے، تہذیبی و ثقافتی ٹکراؤ، بڑی طاقتوں کے توسیع پسندانہ عزائم اور اپنے اپنے افکار و نظریات کے تئیں انتہا پسندانہ رویوں نے گلوبل دنیا میں ہیجانی و طوفانی حالات پیدا کردیے ہیں، ایسے میں باہمی مذاکرات، مفاہمت اور عدم تشدد کے ذریعہ علاقائی، قومی اور بین الاقوامی مسائل حل کرنے کی راہ میں گاندھی جی کے افکار و نظریات چراغ راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

آپ کے اداریہ کے ہم خیال مضامین 'سرسید اور بین المذاہب مفاہمت' اور دوسرا 'مہاتما گاندھی کا تصور امن و آشتی' کافی اہم ہیں۔ 'ادب اطفال کے درسی مسائل' مواد کے اعتبار سے بے حد جامع مضمون ہے۔ شمارے کے دیگر مضامین ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔

❖ **اسدالرحمن تیمی**: جامعہ امام ابن تیمیہ، مدینۃ السلام، بہار

قلم کاروں سے گزارش

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں ہر شعبۂ حیات سے تعلق رکھنے والے افراد کے ذوق اور سطح کا خیال رکھا جاتا ہے۔ ادب کے علاوہ دیگر موضوعات پر بھی تحریریں شائع کی جاتی ہیں مگر ایسے مضامین کو ترجیح دی جاتی ہے جو سائنسی، سماجی، ثقافتی اور تعلیمی شعبوں میں ہونے والی ترقیات کا احاطہ کرتے ہوں یا روزگار کے حصول میں معاون وسائل کی نشان دہی کرتے ہوں۔ یہ ہر طبقے کا رسالہ ہے اسی لیے اس میں تنوع کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ ماہنامہ 'اردو دنیا' کی خوش بختی ہے کہ اسے ہندوستان بھر کے قلم کاروں کا تعاون حاصل ہے۔ ہر موضوع پر ہمیں مضامین ملتے رہتے ہیں۔ لیکن تمام مضامین کی فوری اشاعت ممکن نہیں ہے۔ اس لیے اب قلم کاروں سے گزارش ہے کہ اپنے مضمون کے ساتھ چند سطروں میں مضمون کے اہم نکات کی نشان دہی فرمادیں تاکہ ترجیحی طور پر مضمون کو شامل اشاعت کیا جاسکے۔ برائے مہربانی اپنے مضامین، خبروں اور خط کے ساتھ **اپنا موبائل نمبر اور مکمل پتہ مع پن کوڈ** ضرور فراہم کریں۔ معاوضے کے لیے بھیجے گئے فارم میں اپنے قلمی اور بینک اکاؤنٹ میں درج نام کی الگ الگ نشان دہی کریں۔

مہاتما گاندھی اور نظریہ قومی زبان

23-24/ اکتوبر 2018 کو قومی اردو کونسل اور گاندھی بھون، دہلی یونیورسٹی کے اشتراک سے ایک قومی سمینار بعنوان 'مہاتما گاندھی اور نظریہ قومی زبان' کا اہتمام کیا گیا۔ آئندہ برس گاندھی جی کے یومِ پیدائش کا 150 واں سال پورا ہورہا ہے اس مناسبت سے یہ سمینار انتہائی اہمیت کا حامل تھا۔ گاندھی جی کے 150 ویں جشن ولادت کے موقعے پر منعقدہ اِس سمینار میں تشریف لائے مندوبین نے ہندوستانی زبان کی حفاظت اور تحفظ پر اپنے گراں قدر خیالات پیش کیے۔ پیش ہے اس سمینار کی روداد:

قومی اردو کونسل حکومت ہند کی جانب سے قائم کردہ ایک ایسا ادارہ ہے جو نہ صرف اردو زبان بلکہ عربی و فارسی زبانوں کے فروغ کی سمت میں بھی کام کررہا ہے۔ زبان کے فروغ کے ساتھ ساتھ عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے میں یہ ادارہ بھی پیش پیش ہے کتاب میلوں کا انعقاد، عالمی اردو کانفرنس کا اہتمام، عالمی ریسرچ اسکالر سمینار، امیر خسرو کے یوم پیدائش 3 مارچ پر یوم اردو کا انعقاد جیسے مستقل پروگراموں کے ساتھ علمی و ادبی سرگرمیوں میں مالی تعاون دینا بھی قومی اردو کونسل کے کاموں میں شامل ہے۔ بابائے قوم مہاتما گاندھی نے ملک کے لیے جو قربانیاں پیش کی ہیں اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ انھوں نے ملک میں عدم تشدد اور اتحاد و یک جہتی کے قیام کی کوششیں کیں۔ اپنی آخری سانس تک وہ امن و شانتی کا پیغام دیتے رہے۔ سال 2019 میں ان کے یومِ پیدائش کو 150 سال پورے ہورہے ہیں۔ اس مناسبت سے پورے ملک میں گاندھی جی کے 150 ویں جشن ولادت کا آغاز ہوچکا ہے۔ قومی اردو کونسل نے بھی اس حوالے سے 23 اور 24 اکتوبر 2018 کو مہاتما گاندھی اور نظریہ قومی زبان کے موضوع پر دو روزہ قومی سمینار کا انعقاد کیا۔ یہ سمینار گاندھی بھون نئی دہلی کے اشتراک سے گاندھی بھون کے کشادہ اور کھلے ہوئے ہال میں منعقد کیا گیا۔ سمینار کے آغاز سے قبل مہاتما گاندھی کے پسندیدہ بھجن پر مبنی ایک ویڈیو دکھائی گئی جسے دنیا کے درجنوں ممالک کے گلوکاروں اور قابل قدر شخصیات نے آواز دی ہے۔ اس خوبصورت پیش کش نے سامعین کو مسحور کردیا۔ سمینار کا باضابطہ آغاز گاندھی بھون کے ڈائرکٹر پروفیسر رمیش سی بھاردواج کے استقبالیہ کلمات سے ہوا۔ انھوں نے پورے سمینار کی نظامت کے فرائض بھی انجام دیے اور سبھی مہمانوں کا تعارف بھی پیش کیا۔ قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے مہمانانِ خصوصی اور مہمانان ذی وقار کو شال پیش کی اور ان کا استقبال کیا۔ ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے اپنے خطاب میں کہا کہ:

مہاتما گاندھی جی بیسویں صدی کی سب سے اہم

اور اثر دار شخصیت ہیں۔ وہ چاہتے تھے کہ آزاد ہندوستان میں سبھی شہریوں کو مساوی آزادی و حقوق حاصل ہوں۔ گاندھی جی کے وژن اور مشن کو عام کرنے کی آج زیادہ ضرورت ہے۔ گاندھی جی نے جو فکر و نظر ہندوستانیوں کو دی ہے اس پر تمام باشندگان ہند فخر کے ساتھ چلیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ گاندھی جی نے زندگی کے مختلف پہلوؤں پر اہم نظریات و تصورات عوام الناس کو دیے۔ گاندھی جی نے ہندوستانی زبانوں کے فروغ پر زور دیا اور ملک کے رابطے کی زبان پر خاص توجہ دی۔ انھوں نے کہا تھا کہ ہمیں اپنی سبھی زبانوں کو شاندار بنانا چاہیے تھا۔ ہمیں اپنی زبان میں ہی تعلیم دینی چاہیے۔

سمینار میں بطور مہمانِ خصوصی خطاب کرتے ہوئے صدر آئی جی این سی اے جناب رام بہادر رائے نے کہا کہ گاندھی جی نے ہندی اور اردو کو ملا کر ایک زبان ہندوستانی بنانے کی کوشش کی۔ گاندھی جی چاہتے تھے کہ آئین ہندوستانی کو اپنائے۔ لیکن بالآخر ہندوستانی کے بجائے ہندی کو اپنا لیا گیا۔ گاندھی جی نے اپنی زبان کے لیے محبت کا اظہار کیا اور تحریک بھی چلائی۔ انھوں نے کہا کہ انگریزی کو چھوڑیں اور اپنی زبان سے محبت کریں۔

مہمانِ اعزازی سکریٹری شکشا سنسکرت اتھان نیاس جناب اتل کوٹھاری نے قومی اردو کونسل اور گاندھی بھون کو اس موضوع پر سمینار کے انعقاد پر مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ گاندھی جی کی مادری زبان گجراتی تھی لیکن چھوٹی عمر سے ہی وہ ہندوستانی سے محبت کرتے تھے۔ گاندھی جی نے کہا تھا کہ ہماری قومی زبان ایک ہونی چاہیے لیکن انھوں نے ریاستوں سے یہ بھی کہا تھا کہ وہ اپنے اپنے علاقوں کی زبان سے ہی محبت کریں اور انھیں فروغ دیں۔ ہمیں گاندھی جی کے 150 ویں یوم پیدائش پر اس بات کا عہد لینا ہوگا کہ ہم زیادہ سے زیادہ کام اپنی زبان میں انجام دیں گے اور انگریزی سے زیادہ مادری زبان پر توجہ دیں گے۔ انھوں نے مزید کہا کہ ہمیں اپنی زبان کی عظمت کو دریافت کرنا ضروری ہے۔ دوسرے مہمانِ اعزازی اور آرگنائزر کے ایڈیٹر جناب پرفل کیتکر نے کہا کہ ہندوستان کی ترقی ہندوستان کے نظریے سے ہی ممکن ہے۔ یہ گاندھی جی کا نظریہ تھا۔ ہندوستان کا نظریہ کسی بھی زبان سے نفرت نہیں سکھاتا۔ زبان صرف زبان نہیں ہوتی بلکہ اس سے پوری تہذیب جڑی ہوتی ہے۔ اس زبان میں سماجی اقدار کی خوشبو رچی بسی رہتی ہے۔

پروفیسر رمیش بھاردواج نے پروگرام میں کہا کہ انگریزی پڑھے لکھے لوگ آج تین فیصد ہیں اور باقی 97 فیصد لوگ ہندوستانی زبان کے پڑھنے والے ہیں لیکن یہ تین فیصد لوگ ہندوستان کی تقدیر بنانے کا کام کر رہے ہیں جسے بدلنے کی ضرورت ہے۔ گاندھی جی کا یہ ماننا تھا کہ ہماری زبان ہی وہ نقطہ اشتراک ہے جو پورے ہندوستان کو ایک لڑی میں پرو سکتا ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی اور گاندھی بھون کے اشتراک سے منعقدہ دو روزہ سمینار بعنوان 'مہاتما گاندھی اور نظریہ قومی زبان' کے دوسرے دن ملک کی مختلف یونیورسٹیوں اور اداروں سے آئے ہوئے ماہرین، پروفیسران اور دانشوران نے اپنے گراں قدر

■ ■ ■

مہاتما گاندھی جی بیسویں صدی کی سب سے اہم اور اثر دار شخصیت ہیں۔ وہ چاہتے تھے کہ آزاد ہندوستان میں سبھی شہریوں کو مساوی آزادی و حقوق حاصل ہوں۔ گاندھی جی کے وژن اور مشن کو عام کرنے کی آج زیادہ ضرورت ہے۔ گاندھی جی نے جو فکر و نظر ہندوستانیوں کو دی ہے اس پر تمام باشندگان ہند فخر کے ساتھ چلیں۔ انہوں نے مزید کہا کہ گاندھی جی نے زندگی کے مختلف پہلوؤں پر اہم نظریات و تصورات عوام الناس کو دیے۔ گاندھی جی نے ہندوستانی زبانوں کے فروغ پر زور دیا اور ملک کے رابطے کی زبان پر خاص توجہ دی۔ انہوں نے کہا تھا کہ ہمیں اپنی سبھی زبانوں کو شاندار بنانا چاہیے تھا۔ ہمیں اپنی زبان میں ہی تعلیم دینی چاہیے۔

■ ■ ■

خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ہندوستان کی ترقی و بہبود اور عوام کو جوڑنے کے لیے رابطے کی ایک زبان پر زور دیا۔

اختتامی اجلاس میں پروفیسر گریشور مشر نے کہا کہ زبان ملک کی پہچان اور وجود کا اٹوٹ حصہ ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ ہندی عوامی زبان ہے اسی لیے گاندھی جی نے سوچا کہ ہندی کے ذریعے ہم پورے ملک سے جڑ سکتے ہیں اور جوڑ بھی سکتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستان کی تمام زبانیں قومی زبان کا درجہ رکھتی ہیں۔

> **ہندوستانی زبانو ں کو جانے بغیر ہندی بھی ادھوری ہے۔ گاندھی جی نے ہندوستانی زبان کی بھرپور وکالت کی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ پورے ملک کو لسانی سطح پر جوڑنا چاہتے تھے۔**

پروفیسر گنگا پرساد وِمل نے گاندھیائی نظریے کے حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستانی زبانوں کو جانے بغیر ہندی بھی ادھوری ہے۔ گاندھی جی نے ہندوستانی زبان کی بھرپور وکالت کی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ پورے ملک کو لسانی سطح پر جوڑنا چاہتے تھے۔

اس موقعے پر قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے تمام مہمانان اور گاندھی بھون کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ دو دنوں کے اس سمینار میں گاندھی جی کے نظریات اور قومی زبان کے حوالے سے بہت ساری اہم باتیں اور اہم نکات سامنے آئے اور یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ ہمیں اردو کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی تمام علاقائی زبانوں کے فروغ پر بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

اختتامی اجلاس سے قبل کے سیشن میں بھی مختلف دانشوروں نے مہاتما گاندھی اور نظریہ قومی زبان کے حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار کیا اور اس موضوع کے حوالے سے اہم جہتوں پر روشنی ڈالی۔

پروفیسر چاند کرن سلوجا نے کہا کہ ہمارے یہاں علاقائی زبانوں میں بہت سی ایسی چیزیں ہیں جنھیں پڑھ کر آگے بڑھا جاسکتا ہے۔ ہم تلسی داس، رابندر ناتھ ٹیگور جیسے لوگوں کو پیدا نہیں کرسکتے مگر آنے والی نسلوں میں ایسی صلاحیتیں ضرور پیدا کرسکتے ہیں کہ وہ تلسی داس اور ٹیگور بن سکیں۔ پروفیسر اختر حسنین نے کہا کہ آج کے ہندوستان میں گاندھی جی کے خیالات پر عمل کرنا ناگزیر ہے تاکہ تمام ہندوستانی متحد رہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ قوموں کو جوڑنے کے لیے گاندھی جی نے عوامی زبان کی وکالت کی اور یہ عوامی زبان کوئی اور نہیں ہندوستانی زبان ہی تھی۔

اجلاس کے دوسرے دن گاندھی بھون میں نہایت جوش وخروش نظر آیا۔ اساتذہ، قومی اردو کونسل اور گاندھی بھون کے اہلکار کے علاوہ ریسرچ اسکالر اور طالب علموں کی بڑی تعداد موجود تھی۔ ملک کی مختلف یونیورسٹیوں اور اداروں سے آئے ہوئے پروفیسر اور دانشوروں نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ہندوستان کی ترقی اور عوام کو جوڑنے کے لیے ایک زبان پر زور دیا۔ اس میں کئی اہم مقالہ نگاروں پروفیسر عبدالعلیم (اے۔ایم۔یو)، پروفیسر گنگا پرساد وِمل (جے۔این۔یو) پروفیسر ابن کنول (دہلی یونیورسٹی)، پروفیسر علیم اشرف (دہلی یونیورسٹی)، پروفیسر اسمتا جھا (آئی۔آئی۔ٹی۔رڑکی) ڈاکٹر روی ٹیک چندانی (ڈائرکٹر سندھی کونسل)، پروفیسر گوپیشور سنگھ (دہلی یونیورسٹی)، پروفیسر چاند کرن سلوجا (دہلی یونیورسٹی)، ڈاکٹر مظفر حسین سید (دہلی)، ڈاکٹر ظہیر حسن (متھرا)، پروفیسر اختر حسنین (دہلی یونیورسٹی) اور دیگر نے مقالے پیش کیے۔

پہلے سیشن میں صدارتی خطاب کرتے ہوئے صدر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی پروفیسر ابن کنول نے کہا کہ رابطے کے لیے مشکل الفاظ سے گریز کرنا چاہیے اور اپنی مادری زبان کو ترجیح دینی چاہیے۔ زبان نہ صرف اظہار کا ذریعہ ہے بلکہ احساس و جذبات کا وسیلہ بھی ہے۔ اپنی زبان کے بجائے کسی دوسری زبان میں احساسات بیان کرنے سے حق ادا نہیں ہوگا۔ گاندھی جی چاہتے تھے کہ بیچ کا راستہ اپنایا جائے۔ یعنی ایسی زبان جس میں اردو، ہندی دونوں شامل ہوں۔ ابن کنول نے اردو شعرا امیر خسرو، افضل پانی پتی، مرزا غالب کے کلام کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ ان شعرا کا کلام ہندی میں ہے جسے یہ شعرا ہندوی بھی کہتے تھے پھر ہندی اور جسے بعد میں ہندوستانی نام دیا گیا۔ ہمارا مقصد اتحاد قائم رکھنا ہے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم دونوں اسکرپٹ سیکھیں اردو والے ہندی اور ہندی والے اردو سیکھیں تاکہ درمیان سے نفرت کی دیوار گر جائے۔ انھوں نے مزید کہا کہ دہلی یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر دنیش سنگھ نے Inter Disciplinary Course کی شروعات کرکے ایک عمدہ کوشش کی تھی جس

> **زبان نہ صرف اظہار کا ذریعہ ہے بلکہ احساس و جذبات کا وسیلہ بھی ہے۔ اپنی زبان کے بجائے کسی دوسری زبان میں احساسات بیان کرنے سے حق ادا نہیں ہوگا۔ گاندھی جی چاہتے تھے کہ بیچ کا راستہ اپنایا جائے۔ یعنی ایسی زبان جس میں اردو، ہندی دونوں شامل ہوں۔**

کے نتیجے میں یہ دیکھا گیا کہ بہت سے طالب علم اردو سیکھنے کے خواہاں ہیں۔ اگر گاندھی جی کے نظریات پر چلنا ہے تو زبان کے فرق کو مٹانا ہوگا جس سے دلوں کی تفریق بھی دور ہوگی ۔ڈاکٹر شالنی یادو نے طالب علموں کے انٹرویو اور تعلیمی سرگرمیوں میں انگریزی زبان نہ جاننے کے سبب آنے والی پریشانیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ انگریزی زبان سب کو آئے ضروری نہیں اور یہ زبردستی بھی کسی کو سکھائی نہیں جاسکتی انگریزی زبان کسی کی قابلیت ناپنے کا آلہ نہیں ہے۔ ہمیں ضرورت ہے کہ اپنی قومی زبان کو اتنا فروغ دیں کہ بیرونی ملکوں میں اس کی رسائی ہو سکے۔اس سیشن میں ڈاکٹر مظفر حسین سید، پروفیسر گوپیشور سنگھ، ڈاکٹر مکیش اور پرمود سینی وغیرہ نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

ڈاکٹر ظہیر حسن نے کہا کہ گاندھی جی کے لیے انگریزی مصیبت نہیں بلکہ ضرورت بن گئی تھی۔ اس لیے

بھاشا دیش کی پہچان ھے یه ترقی کا ذریعه ھے ھماری تہذیب اس میں ڈوب کر آگے چلتی رھتی ھے۔ ھم نے جو آزادی حاصل کی وہ جسمانی اور ذھنی آزادی نہیں ھے ھم آج بھی غلام ھیں۔ ضرورت ھے که مختلف زبانوں کے درمیان تعلق قائم کیے جائیں ۔ لسانی جمھوریت قائم کی جائے۔

ذریعے بھی روزگار حاصل کیا جاسکتا ہے۔انھوں نے کہا کہ ہندی اردو اور سندھی سرحدوں سے آزاد ہیں تو پنجابی، ملیالم اور دوسری زبانیں بھی سرحدوں سے آزاد ہوسکتی ہیں۔

انھوں نے مزید کہا کہ گاندھی جی جب افریقہ سے

بڑے قلم کار بھی پاکستان نہیں جانا چاہتے تھے۔انھوں نے کئی تصانیف، کہانیاں تخلیق کیں۔ جو ملک کے اتحاد کی زندہ مثالیں بھی ہیں۔ گاندھی جی نے اردو زبان کا اخبار بھی نکالا تھا۔ 5 مئی 1946 کو ہری جن سیوک نامی اخبار اردو زبان میں نکلنا شروع ہوا تھا۔گاندھی جی اردو جاننے والوں سے باتیں بھی اردو میں کیا کرتے تھے یہاں تک کہ خط و کتابت کا سلسلہ اور ان کے دستخط بھی اردو میں ہی ہوتے تھے۔اردو ادب میں گاندھی جی پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔اکبر الہ آبادی، حسرت موہانی، چکبست، مجاز، وامق جونپوری، آنند نرائن ملا نے گاندھی پر بہت کچھ لکھا۔ اکبر الہ آبادی نے تو یہ تک کہا کہ

’فردوسی کے شاہ نامہ کو ختم کرو اب گاندھی نامہ پڑھو‘

سینئر صحافی زین شمسی نے کہا کہ کوئی بھی ملک اپنی مادری زبان میں ہی ترقی کرسکتا ہے۔ اگر اردو سے اس کا

اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انگریزی میں ہر قسم کا مواد موجود ہے لیکن گاندھی جی اس حقیقت سے اچھی طرح واقف تھے کہ ہندوستان کی تمام زبانوں کے فروغ کے بعد ہی آگے بڑھا جا سکتا ہے۔گاندھی جی کو نہ صرف اردو یا ہندی سے محبت تھی بلکہ سبھی زبانوں سے پیار تھا۔

پروفیسر اختر حسنین نے مقامی زبان کے حوالے سے بات کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستانی ، ہندوستان کی مشترکہ زبان ہے اس لیے کوشش کی جانی چاہیے کہ ہندوستانی زبان کو جس میں اردو اور ہندی شامل ہے فروغ دیا جائے اور عام کیا جائے۔قومی زبان پر پیش کیے جارہے مقالوں کے درمیانی وقفے میں سوال و جواب کا سلسلہ بھی ہوا جس میں وہاں موجود اسکالروں نے سمینار کے حوالے سے اپنے خیالات پیش کیے۔

دوسرے سیشن میں سندھی کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر روی ٹیک چندانی نے کہا کہ ہندوستان کی زبانوں کے

آئے تو محسوس کیا کہ ہم ہندی سے لوگوں کو جوڑ سکتے ہیں۔ انھوں نے چمپارن میں بھوجپوری زبان سے واقف لوگوں سے ربط قائم کیا۔ روی ٹیک چندانی نے اپنے آخری جملے کچھ یوں ادا کیے کہ ’بھاشا دیش کی پہچان ہے یہ ترقی کا ذریعہ ہے ہماری تہذیب اس میں ڈوب کر آگے چلتی رہتی ہے۔ ہم نے جو آزادی حاصل کی وہ جسمانی اور ذہنی آزادی نہیں ہے ہم آج بھی غلام ہیں۔ضرورت ہے کہ مختلف زبانوں کے درمیان تعلق قائم کیے جائیں ۔لسانی جمہوریت قائم کی جائے۔

ڈاکٹر مظفر حسین سید نے کہا کہ گاندھی جی دل سے سیکولر تھے وہ اردو زبان سے بھی بے حد محبت کرتے تھے۔ وہ چاہتے تھے اردو جاننے والے ہندی سیکھیں اور ہندی جاننے والے اردو سیکھیں۔انھوں نے اردو ادب کے حوالے سے کئی شعرا اور نثر نگاروں کا نام لیا مثلاً ساحر لدھیانوی، قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی، سعادت حسن منٹو جیسے

رسم الخط چھین لیا جائے تو اردو زبان ختم ہو جائے گی۔ محترمہ اسمتا جھا نے کہا کہ گاندھی جی کا خواب تھا کہ ہندی کو قومی زبان بنانا ہے۔لیکن ساتھ ہی ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ تمام زبانوں کا احترام کیا جائے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے تشریف لائے پروفیسر عبدالعلیم نے کہا کہ جو خواب گاندھی جی نے قومی زبان کے حوالے سے اس وقت دیکھا تھا وہ موجودہ دور حکومت میں شرمندہ تعبیر ہوتا نظر آتا ہے۔انھوں نے تمام زبانوں کے لیے ایک رسم الخط طے کرنے کی تجویز دی۔اس کے علاوہ دیگر شرکا نے اس موقع پر اظہار خیال کیا۔

دو دن کے تمام اجلاسوں کی نظامت کے فرائض گاندھی بھون دہلی یونیورسٹی کے ڈائرکٹر پروفیسر رمیش سی بھاردواج نے بحسن وخوبی انجام دیے۔

(رپورٹ: مسرت، حمیرہ خاتون)

مصباح انظر

ہندوستان میں اردو ذریعہ تعلیم

زبان اظہار خیال کا ذریعہ، علم کی منتقلی کا وسیلہ اور درس و تدریس کی تمام سرگرمیوں کا محور ہے۔ یہ ثقافتی ترسیل کی جان اور سماجی روابط قائم و مستحکم کرنے کا سب سے مؤثر آلہ ہے۔ اردو ہندوستانی آئین کے آٹھویں شیڈیول میں شامل 22 زبانوں میں سے ایک اور ملک کی مشترکہ تہذیب کی مضبوط ترین علامت ہے۔

اردو جموں و کشمیر کی سرکاری زبان اور تلنگانہ کی دو سرکاری زبانوں میں سے ایک ہے۔ ساتھ ہی اسے بہار، جھارکھنڈ، مغربی بنگال، اتر پردیش اور قومی راجدھانی خطہ دہلی کی اضافی سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے۔ اردو شمال مشرق کی بعض ریاستوں کے سوا ہندوستان کی تمام ریاستوں میں یا تو ایک مضمون کے طور پر پڑھائی جاتی ہے یا اس کا استعمال ذریعہ تعلیم کے طور پر ہوتا ہے۔ اردو کیرالا میں زبان ثانی کے طور پر پڑھائی جاتی ہے اور ریاست کے سرکاری و سرکاری امداد یافتہ اسکولوں میں اردو اساتذہ کی تعداد تقریباً دو ہزار ہے۔ صرف مہاراشٹر میں چار ہزار نو سو (4900) اردو میڈیم اسکول ہیں، جہاں سینتیس ہزار (37000) اردو میڈیم اساتذہ ہیں اور ریاست کے تیرہ لاکھ طلباء اردو ذریعہ تعلیم سے منسلک ہیں۔ اسی طرح کرناٹک کے ڈائرکٹوریٹ آف پبلک انسٹرکشن کے اعداد و شمار کے مطابق ریاست کے پانچ ہزار دو سو باسٹھ (5262) اردو میڈیم اسکولوں میں پڑھانے والے اردو میڈیم اساتذہ کی تعداد چوبیس ہزار پانچ سو ستاسی (24587) ہے۔ ریاست کے ان اردو میڈیم اسکولوں میں تعلیم حاصل کرنے والے طلباء کی تعداد چار لاکھ اٹھہتر ہزار چھ سو اناسی (478679) ہے۔ اس طرح صرف مہاراشٹر اور کرناٹک میں دس ہزار سے زیادہ اردو میڈیم اسکول اور ساٹھ ہزار سے زیادہ اردو میڈیم اساتذہ ہیں۔ دونوں ریاستوں میں تقریباً اٹھارہ لاکھ طلباء اردو ذریعہ تعلیم سے منسلک ہیں۔ تلنگانہ میں بھی اردو میڈیم اسکولوں کی تعداد ہزاروں میں ہے۔ صرف حیدرآباد شہر میں کم از کم ایک سو بتیس (132) اردو میڈیم اسکول ہیں جہاں بائیس ہزار (22000) سے زیادہ بچے تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ آندھر پردیش، بہار، جھارکھنڈ، قومی راجدھانی خطہ دہلی، اڈیشا، تمل ناڈو اور مغربی بنگال میں بھی اردو میڈیم اسکولوں کی خاصی تعداد ہے۔

مجموعی طور پر ملک بھر میں اردو میڈیم اسکولوں کی تعداد کم و بیش بیس ہزار ہے اور لاکھوں طلباء اردو ذریعہ تعلیم سے منسلک ہیں۔ مختلف ریاستوں کے اردو میڈیم اسکولوں کو الگ الگ نوعیت کے مسائل درپیش ہیں۔ آج بھی متعدد ریاستوں میں غیر تربیت یافتہ اساتذہ بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ بعض اچھے اردو میڈیم اسکول بھی ہیں جہاں معیاری تعلیم دی جاتی ہے۔ اس ضمن میں مہاراشٹر کے بعض اردو میڈیم اسکولوں کا نام لیا جا سکتا ہے۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے ذریعہ حیدرآباد (تلنگانہ)، دربھنگہ (بہار) اور نوح (ہریانہ) میں قائم کیے گئے اردو میڈیم سینئر سیکنڈری اسکولوں میں معیاری تعلیم دی جاتی ہے۔ مانو ماڈل اسکول کے نام سے مشہور تینوں اسکولوں میں سی بی ایس ای کے طرز پر اردو میڈیم میں پڑھانے والے مستقل اساتذہ کی تعداد تراسی اور طلباء کی تعداد تقریباً ڈھائی ہزار ہے۔ تمام مضامین اردو ہی میں پڑھائے جاتے ہیں اور بورڈ امتحانات کے نتائج بھی اطمینان بخش ہیں۔ بورڈ امتحانات میں شریک ہونے والے بیشتر طلبا امتیازی نمبروں سے کامیابی حاصل کرتے ہیں۔ بلا شبہ دوسرے اردو میڈیم اسکولوں میں بھی اچھے اساتذہ ہوں گے جو پیشہ تدریس کو عبادت سمجھتے ہیں اور قوم کے نونہالوں کی کردار سازی ان کا بنیادی مقصد ہے۔ مگر عام طور پر اردو میڈیم اسکولوں کے اساتذہ کو دوسروں سے اکثر شکایت رہتی ہے۔ بعض شکایتیں بجا ہوتی ہیں مگر بیشتر بے جا شکایتیں۔ پرائمری اسکولوں کے اساتذہ کی بنیادی شکایت بچوں کے والدین یا طلبا کے سرپرست سے رہتی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ بیشتر والدین بچوں کے حوالے سے بے فکر اور بے حس ہوتے ہیں۔ انہیں اپنے بچوں کی تعلیم سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ نہ تو وہ کبھی اسکول آتے ہیں اور نہ ہی کسی طرح کا تعاون دینے میں دلچسپی لیتے ہیں۔ اس کی اہم وجہ بچوں اور طلبائے سرپرست کی کی ابتر سماجی اور معاشی صورت حال ہے۔ اسی طرح سیکنڈری اور سینئر سیکنڈری (انٹرمیڈیٹ) اسکولوں کے اساتذہ کی بنیادی شکایت یہ رہتی ہے کہ پرائمری اسکولوں میں بچوں کو کچھ بھی سکھایا نہیں گیا ہے اور ان کی بنیادی تعلیم انتہائی کمزور ہے۔ وہ قاعدے سے پڑھ لکھ نہیں سکتے اس لیے ان کو معیاری تعلیم دینے کی کوشش کارگر ثابت نہیں ہو سکتی۔ دیگر شکایتوں میں اسکولوں کا ناقص بنیادی ڈھانچہ، کم تنخواہیں اور دیگر ضروری سہولتوں کا فقدان ہے۔

ہندوستان کی کم و بیش تمام ریاستوں کے سرکاری، امداد یافتہ اور نجی اسکولوں میں الگ الگ نوعیت کے مسئلے ہیں۔ دوسرے اسکولوں کی طرح اردو میڈیم اسکولوں کے مسئلوں کے لیے بھی طلبا کو ذمہ دار قرار نہیں دیا جا سکتا۔ سچ تو یہ ہے کہ ان مسئلوں کو دور کرنے میں بھی طلباء بہت کم رول ادا کر سکتے ہیں۔ ان مسئلوں کو حل کرنے کی اصل ذمہ داری سرکار اور سماج کی ہے۔ متعلقین کو اس بات پر سب سے زیادہ غور کرنے کی ضرورت ہے کہ اردو میڈیم اسکولوں کی مجموعی کارکردگی اطمینان بخش کیوں نہیں ہے؟ کمرۂ جماعت اور اسکول کی سرگرمیاں قومی درسیات کا خاکہ، 2005 کے مقاصد کے موافق کیوں نہیں ہیں؟ کلاس روم میں تدریس و اکتساب سے متعلق مؤثر مواد کا مناسب استعمال کیوں نہیں ہو رہا ہے؟ وقت پر درسی کتابیں مہیا کیوں نہیں ہو رہی ہیں؟ اساتذہ تدریس و اکتساب کو دلچسپ بنانے میں ناکام کیوں ہیں؟ اساتذہ بچوں کے لیے مشفق و مہربان کیوں نہیں ہیں؟ وہ طلبا کے مستقبل کے

لیے اسی طرح فکر مند کیوں نہیں ہیں جیسا وہ اپنی اولاد کے تئیں ہوتے ہیں؟ وہ تعلیمی صورت حال کو بہتر بنانے میں جد و جہد کیوں نہیں کر رہے ہیں اور اگر کر رہے ہیں تو ان کی محنت رائیگاں کیوں جا رہی ہے؟ ان کو اچھی تدریس کے لیے راغب کرنے کے لیے کیا لائحہ عمل اختیار کیا جاسکتا ہے؟ اساتذہ کی پیشہ ورانہ تربیت کا باضابطہ انتظام کیسے کیا جاسکتا ہے؟ ان تمام پہلوؤں پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ہندوستان میں اسکول اساتذہ کی تعداد اناسی لاکھ تالیس ہزار چھ سو تہتر ہے۔ ہر قسم کے اسکول میں کسی نہ کسی طرح کا مسئلہ ضرور ہوتا ہے۔ مگر سرکاری اسکولوں میں عمومی طور پر اور اردو میڈیم اسکولوں میں خصوصی طور پر نسبتاً زیادہ مسئلے ہوتے ہیں۔ اگر الزام تراشی سے گریز کرتے ہوئے اساتذہ اپنی پوری توجہ طلباء کی کردار سازی پر مرکوز کریں تو صورت حال میں مثبت تبدیلی نظر آنے لگے گی۔ اساتذہ کے سماجی و معاشی مسائل میں مبتلا ہونے کی وجہ سے ان کے پاس کوئی بہتر نصب العین نہیں ہے۔ دوسری طرف اساتذہ کے مسئلے حل کرنے میں بھی حکومتیں کوئی دلچسپی نہیں لے رہی ہیں۔ اساتذہ اتنا تو سمجھتے ہیں کہ تعلیمی نظام کے مؤثر نہ ہونے میں طلباء کا کوئی خاص رول نہیں ہے اور خود بھی طلباء کی بہتری کے لیے کچھ کرنے کا جذبہ رکھتے ہیں۔ مگر اس کے باوجود بیشتر اساتذہ عملاً ایسا کچھ نہیں کرتے جس سے وہ طلبا میں تحریک پیدا کر سکیں، ان کے لیے رول ماڈل بن سکیں اور صورت حال میں مثبت تبدیلی لانے والے بن سکیں۔ اگر اساتذہ اپنے طور پر تدریسی تقاضوں سے پوری طرح واقف ہیں اور مؤثر تدریس کے لیے طلباء میں تحریک پیدا کرنے کی کوشش بھی کر رہے ہیں تو بھی انہیں مختلف نوعیت کے مسائل کا سامنا ہے۔

ملک کے دیگر سرکاری اسکولوں کے ساتھ ہی اردو میڈیم اسکولوں کے بنیادی ڈھانچے کو بہتر بنانے پر خصوصی توجہ دی جانی چاہیے۔ ٹاٹا انسٹی ٹیوٹ آف سوشل سائنسس (ٹی آئی ایس ایس)، دیونار، ممبئی کے پروفیسر عبدالشعبان نے مہاراشٹر کے اردو میڈیم اسکولوں کی صورت حال پر ایک رپورٹ تیار کی ہے۔ ان کی تحقیقی رپورٹ کے مطابق معلم اور متعلم کے ناموزوں تناسب کی وجہ سے بھی تدریس پر منفی اثر پڑ رہا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ مہاراشٹر کے اردو میڈیم اسکولوں میں (پہلی تا بارہویں جماعت) تیرہ لاکھ سے زائد طلبا ہیں، مگر ان میں سے بیشتر اسکولوں میں قانون حق تعلیم، 2009 میں لازم قرار دی گئیں بنیادی سہولیات کا فقدان ہے۔ بعض اسکولوں کے ایک کلاس روم میں ستر بچوں کو بیٹھنا پڑتا ہے۔ حیدرآباد جیسے بڑے شہر میں بھی متعدد اسکولوں میں کلاس روم اور ضروری فرنیچر تک نہیں ہیں۔ طلباء اور طالبات کے لیے الگ الگ بیت الخلاء نہیں ہیں۔ پینے کے پانی کا معقول انتظام نہیں ہے۔ بعض اسکولوں کے تمام کمروں میں بجلی کی سپلائی تک نہیں ہے۔ کمپیوٹر لیب کی سہولت بعض چنندہ اسکولوں تک محدود ہے۔ بہترین اردو میڈیم اسکولوں کے لیے مشہور مہاراشٹر کے صرف سات فی صد اسکولوں میں کمپیوٹر لیب ہیں۔ بعض اسکولوں میں سرکار کی طرف سے کمپیوٹر تو فراہم کر دیے گئے ہیں مگر ان کا استعمال کرنے والے اساتذہ یا عملہ کا کوئی انتظام نہیں ہے۔

سرکاری امداد یافتہ نجی اردو میڈیم اسکولوں میں اساتذہ کی تقرری میں بدعنوانی کے سبب بھی مختلف قسم کے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ اگر کوئی استاذ لاکھوں روپئے دے کر تقرری حاصل کرتا ہے اور اسے قرض چکانے میں سالہا سال لگ جاتے ہیں تو وہ پوری یکسوئی اور انہماک کے ساتھ درس و تدریس کا کام انجام دیتا رہے ایسی توقع نہیں کی جاسکتی۔ مہاراشٹر میں ایسے اردو میڈیم اسکولوں کی بڑی تعداد ہے جہاں اساتذہ کی تقرری میں حکومت کا برائے نام دخل ہوتا ہے۔ اسی طرح بہار اسٹیٹ مدرسہ ایجوکیشن بورڈ سے ملحق اردو میڈیم مدرسوں میں بھی اساتذہ کی تقرری کا مسئلہ بڑا پیچیدہ ہے۔ ان مدرسوں میں دینی تعلیم کے ساتھ تمام مضامین کا ذریعہ تعلیم اردو ہے۔ مگر ان مدرسوں میں نہ تو مضامین کے اعتبار سے اساتذہ کی باقاعدہ تقرری ہو پاتی ہے اور نہ ہی اساتذہ کی تنخواہیں قومی معیار کے مطابق ہیں۔ ان مدرسوں میں ابتدائی دینی تعلیم کسی قدر تو ہو جاتی ہے مگر روایتی مضامین کی تدریس کے لیے نہ تو باقاعدہ کتابیں تیار کی جاتی ہیں اور نہ ہی وہاں مؤثر تدریس کا واضح تصور ہے۔ بہار کے اردو میڈیم سرکاری اسکولوں کی خستہ حالت کی بنیادی وجہ بھی معیاری کتابوں کی عدم تیاری اور ناقص دستیابی ہے۔ ریاست کے ایسے اسکولوں میں مؤثر درس و تدریس سے زیادہ اہم ان کی شناخت کا مسئلہ ہے۔ بڑی تعداد میں غیر تربیت یافتہ اساتذہ کا ہونا کریلے پر نیم چڑھا کے مماثل ہے۔ تلنگانہ کے علاوہ ملک میں شاید ہی کوئی ایسی ریاست ہے جہاں اردو اساتذہ اور اردو میڈیم اساتذہ کی پیشہ ورانہ تربیت کا باضابطہ انتظام ہے۔

این سی ای آر ٹی کے ذریعہ اردو میں درسی کتابوں کی تیاری لاجواب ہے۔ مگر ان درسی کتابوں کی دستیابی نہایت ہی مشکل ہے۔ قومی راجدھانی دہلی کے اردو میڈیم اسکولوں کو بھی یہ کتابیں حاصل کرنے میں کافی دشواری پیش آتی ہے۔ اتر پردیش، بہار اور جھارکھنڈ جیسی ریاستوں میں نہ تو این سی ای آر ٹی کی تیار کردہ درسی کتب آسانی سے دستیاب ہیں اور نہ ان کے طرز پر ریاستی سطح پر تیار کی گئی بعض کتابیں ہی دستیاب ہیں۔ بہار کے بعض شہروں میں دوکانداروں سے اردو میں درسی کتابیں حاصل کرنے کے لیے ان کے ساتھ گائیڈ بک لازمی طور پر خریدنی پڑتی ہے۔ وہ کم منافع کی وجہ سے صرف درسی کتابیں نہیں بیچتے۔ این سی ای آر ٹی کی کتابوں کے طرز پر ایس سی ای آر ٹی نے اپنی ریاست میں کتابیں تیار کرانے کی ذمہ داری لی ہے۔ اس کا جواز یہ ہے کہ ان کتابوں میں علاقائی ضرورتوں کے تحت مناسب تبدیلی لائی جائے یا مناسب اضافہ کیا جائے۔ مگر اب تک کسی بھی ایس سی ای آر ٹی نے ایک بھی درسی کتاب این سی ای آر ٹی سے بہتر شائع نہیں کی ہے۔ اس کی بنیادی وجہ بالکل صاف ہے۔ این سی ای آر ٹی کے وسائل کسی بھی ایس سی ای آر ٹی سے بہت زیادہ ہیں۔ اگر ایس سی ای آر ٹی کی دشواریوں کے پیش نظر یا مصلحت کے تحت علاقائی ضرورتوں کے خیال کو ترک کر دیا جائے اور راست این سی ای آر ٹی کی درسی کتابیں ہی استعمال کی جائیں تو اردو میں کتابوں کی عدم دستیابی کی شکایت دور ہو سکتی ہے۔ ایسا کرنے سے بہار، مدھیہ پردیش، راجستھان اور اتر پردیش میں اردو کی درسی کتابیں آسانی سے ملنے لگیں گی۔ تلنگانہ اور مہاراشٹر جیسی ریاستیں اپنے طلباء کے لیے عین وقت پر اچھی درسی کتابیں تیار کرتی رہتی ہیں اس لیے انہیں این سی ای آر ٹی کی درسی کتابیں خریدنے کے لیے مجبور بھی نہ کیا جائے۔

اسکولوں میں کتابیں دستیاب ہو جانے کے بعد بھی مؤثر تدریس میں دوسری رکاوٹیں حائل رہتی ہیں۔ اساتذہ کو تدریس کے علاوہ دوسرے کاموں میں اس طرح مصروف رکھا جاتا ہے کہ اندازہ لگانا مشکل ہوتا ہے کہ ان کی بنیادی ذمہ داری کیا ہے۔ ترک تعلیم کے مسئلے کا حل ڈھونڈنا بھی ضروری ہے۔ اردو میڈیم اسکولوں کی ثانوی اور اعلیٰ ثانوی جماعتوں میں ترک تعلیم بہت بڑا مسئلہ ہے۔ عام طور پر لڑکیاں بڑی ہو کر گھر کے کاموں میں ہاتھ بٹانے لگتی ہیں اور لڑکے کام کاج میں لگ جاتے ہیں۔ بیشتر والدین کی معاشی حالت اتنی اچھی نہیں ہوتی کہ وہ اپنے بچوں کے سنہرے مستقبل کے لیے انہیں اچھی تعلیم دلاتے رہیں۔ اردو میڈیم اسکولوں کے مسائل کو حل کرنے کے لیے فکر مند ہونا وقت کا تقاضا ہے۔ تعلیمی اداروں کے مسئلے حل کرنے کے لیے حکومتوں پر انحصار کے بجائے انفرادی، اجتماعی و تنظیمی اور سماجی سطحوں پر کوششیں ہونی چاہئیں۔

■

Misbahul Anzar
Asst. Professor, CPDUMT
Maulana Azad National Urdu University
Gachibowli, Hyderabad-500032
E-mail: misbahanzar@gmail.com
Mobile-9948412484

جنوبی ہند کے معمارِ ادبِ اطفال مولانا حافظ عبدالرزاق حافظ باقوی

راہی فدائی

ہندوستان کے شمالی قطعے کی طرح جنوبی حصے میں بھی ادب اطفال کے شاعر بہت کم ہیں، خصوصاً صوبہ تمل ناڈو میں تقریباً صدیوں پر محیط اردو شاعری کی روایت ہونے کے باوجود ادب اطفال پر کچھ زیادہ کام نہیں ہوا۔ تمل ناڈو کے مراکز اردو، آرکاٹ، ویلور، وشارم، وانمباڑی وغیرہ میں چار سو سال پیشتر فارسی کے ساتھ مقامی اور عوامی زبان دکنی (قدیم اردو) میں چھوٹے چھوٹے رسالے لکھے گئے، مثنویاں قلم بند کی گئیں۔ مثلاً فراقی ویلوری ابن سید کریم محمد حسینی متوفی (1105ھ) مصنف 'مرأۃ الحشر' علامہ فخر الدین مہکری بے خود ویلوری مصنف اصل الاصول (1143ھ)، ابوالحسن قربی (1182ھ) مصنف دیوان قربی، ولی ویلوری مصنف روضۃ الشہداء تصنیف شدہ (1137ھ)، علامہ باقر آگاہ متوفی 1220ھ) مصنف 'ہشت بہشت'، خمسۂ متحیرہ اوج آگاہی (تصنیف شدہ 1212ھ تا 1215ھ)، سید شاہ میراں حسینی ملقب بہ منزوی الجبلین متوفی (1140ھ)، سید شاہ محمد حسینی متوفی مابعد 1181ھ) مصنف خزانۂ عبادت (1165ھ) خزانۂ معرفت (1181ھ) محمد علی مہکری خانہ زاد (متوفی 1240ھ) مصنف گنج شایگاں (تصنیف شدہ 1221ھ)، کلیات قصائد۔ ایسے نابغۂ روزگار تخلیق کار ہونے کے باوجود ادب اطفال پر شاذ و نادر ہی کام ہو پایا۔ شاید اس کی وجہ اس دور میں بچوں میں دینی شعور گھر کے ماحول سے پیدا ہوجاتا تھا اور مکتب و مدرسہ میں پہنچنے کے بعد اس دینی رجحان میں پختگی اور وارفتگی آجاتی تھی جس کی وجہ سے مستقل طور پر ادب اطفال تخلیق کرنے کی چنداں حاجت نہیں رہی۔ زمانۂ ماضی کے مقابلے میں آج کے دور کے حالات دگرگوں ہیں اس لیے ادب اطفال کے ذریعہ بچوں کی ذہنی تربیت اور ان میں معلومات عامہ کا شوق پیدا کرنے کی اشد ضرورت ہے۔

جنوبی ہند میں ادب اطفال کے معمار کی حیثیت سے مولانا حافظ عبدالرزاق باقوی معروف بہ حافظ باقوی (متوفی 2005) کا نام اور کام معروف وممتاز ہے، آپ ایک قادرالکلام شاعر اور مقتدر ادیب تھے۔ چونکہ آپ کی زندگی کا بیشتر حصہ مختلف عمر کے طلبہ کی تعلیم و تربیت میں گزرا اس لیے آپ کو اس بات کا شدید احساس تھا کہ بچوں کی ذہنی نشو ونما کے لیے ادب اطفال کی تخلیق ضروری ہے خصوصاً موجودہ حالات میں جب کہ بچوں کی بے راہ روی اور آزاد خیالی ایک سنگین مسئلہ بن چکی ہے، ادب اطفال کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔ اسی مقصد کے تحت آپ نے بچوں کا ادب تخلیق کیا اور اس کار خیر میں آپ کی خوب پذیرائی بھی ہوئی اور شاعر اطفال کی حیثیت سے شہرت بھی حاصل ہوئی۔ بقول پروفیسر نجم الہدیٰ سابق صدر شعبۂ عربی، فارسی و اردو، مدراس یونیورسٹی: چنائی

''حافظ باقوی صاحب شاعر کی حیثیت سے پہلے ہی سے نہ صرف معروف ہیں بلکہ زبان و بیان کی قدرت، موضوعات کی ندرت اور تخلیقی جوہر کی تابانی کے اعتبار سے ہم عصر شعرا میں ممتاز بھی ہیں۔ بچوں کے شاعر کی حیثیت سے بھی حافظ صاحب کل ہند شہرت رکھتے ہیں، مکتبہ جامعہ دہلی کی جانب سے بچوں کا جو ماہنامہ 'پیام تعلیم'

شائع ہوتا ہے، اس میں حافظ صاحب کا کلام بکثرت شائع ہوتا رہا ہے۔ انھوں نے ننھے منوں کے لیے کئی مجموعے تیار کیے جو وقتاً فوقتاً چھاپے گئے''[1]

حافظ باقوی نے بچوں کی شاعری پر کس قدر توجہ دی اور اس کی اشاعت کے اہتمام میں کتنی عرق ریزی کی، اس کا اندازہ اس بات سے بآسانی ہوجائے گا کہ آپ نے بچوں کے لیے ایک نہیں بلکہ چار چار مجموعے دیے، چنانچہ آپ کا پہلا مجموعہ 'نئی کلیاں' 1972، میں کتاب گھر، میل وشارم (ویلور ضلع) سے شائع ہوا، پھر دوسرے ہی سال 'ننھے پھول' کے عنوان سے کتاب ترتیب دی جو 1973 میں مذکورہ کتاب گھر سے ہی شائع ہوکر منظر عام پر آئی۔ بعدازاں ٹھیک چھ سال بعد 1979 میں 'چاند تارے'، زیور طباعت سے آراستہ ہوئی، اور آندھراپردیش اردو اکیڈمی، حیدرآباد نے اس کی اشاعت کی ذمہ داری لی، پھر دو سال بعد 1981 میں نیّر بک ڈپو، میل وشارم نے 'پھلواری' کے نام سے بچوں کی نظموں کا ایک اور مجموعہ چھاپا جسے ادبی دنیا میں بچوں کے ادب کے ضمن میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ علاوہ ازیں حافظ باقوی کی غزلوں اور نظموں پر مشتمل کتاب 'بہارِ سخن' شائع ہوئی جس کے اخیر میں حافظ باقوی نے بچوں کی شاعری کا ایک گوشہ 'میرے موتی' کے نام سے مختص کیا جس میں مختلف موضوعات پر بچوں کے لیے چھوٹی چھوٹی نظمیں شامل کیں تاکہ بچے پڑھ بھی لیں اور آسانی کے ساتھ یاد بھی کرلیں۔

مختصر سوانحی حالات: حافظ باقوی کا آبائی وطن رایچوٹی (ضلع کڈپہ، آندھراپردیش) ہے، آپ کی ابتدائی تعلیم وطن رایچوٹی میں ہوئی پھر آپ کے والد 'محمد دستگیر' نے آپ کو 1949 میں ام المدارس مدرسۂ باقیات صالحات ویلور، (قائم شدہ 1279ھ مطابق 1824) میں داخل کروادیا جہاں سے مکمل سات سال بعد آپ فارغ التحصیل ہوئے، چونکہ ہندوستان کا یہ اولین مدرسہ 1925 ہی سے 'مدراس یونیورسٹی' سے الحاق شدہ ہے، اس لیے یہاں کے طلبا مدراس یونیورسٹی کی طرف سے منعقدہ 'افضل العلما (عربی)' منشی فاضل (فارسی) اور ادیب فاضل (اردو) کے امتحانات میں شرکت کے مجاز ہوتے ہیں، اس سہولت کا فائدہ اکثر طلباء اٹھاتے ہیں، مولانا حافظ باقوی نے بھی اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے سند 'ادیب فاضل' حاصل کی جس کی وجہ سے مدرسہ کی فراغت کے فوری بعد شہر ویلور کے قریب واقع مسلم تاجران چرم کا مرکز 'میل وشارم' کی نواب سی عبدالحکیم ہائی اسکول میں آپ کو ملازمت مل گئی۔ اس کے بعد آپ نے

جنوبی ہند میں ادب اطفال کے معمار کی حیثیت سے مولانا حافظ عبدالرزاق باقوی معروف بہ حافظ باقوی (متوفی 2005) کا نام اور کام معروف و ممتاز ہے، آپ ایک قادرالکلام شاعر اور مقتدر ادیب تھے۔ چونکہ آپ کی زندگی کا بیشتر حصہ مختلف عمر کے طلبہ کی تعلیم و تربیت میں گزرا اس لیے آپ کو اس بات کا شدید احساس تھا کہ بچوں کی ذہنی نشوونما کے لیے ادب اطفال کی تخلیق ضروری ہے خصوصاً موجودہ حالات میں جب کہ بچوں کی بے راہ روی اور آزاد خیالی ایک سنگین مسئلہ بن چکی ہے، ادب اطفال کی اہمیت اوربڑھ جاتی ہے۔

شہر میل وشارم ہی کو اپنا وطن ثانی بنالیا۔ مذکورہ ہائی اسکول کی تدریس کے دوران آپ نے مدراس یونیورسٹی سے پہلے ایم۔اے، اور پھر ایم۔فل کی ڈگریاں حاصل کیں، جس کے سبب آپ کو سی عبدالحکیم کالج میں بطور لکچرار خدمت انجام دینے کا زریں موقع مل گیا، اس کے بعد آپ ترقی کے زینے طے کرتے ہوئے پروفیسری کے معزز منصب پر فائز ہوگئے۔ جب آپ کا تبادلہ بمقام گورنمنٹ آرٹس کالج، مدراس (چنائی) ہوا تو آپ نے اس موقع کو غنیمت جان کر تعلیمی تشنگی کو بجھانے کے لیے ہندی پرچار سبھا، مدراس سے ہندی زبان سیکھی اور اس کی اعلیٰ سند 'پراوین' (Praveen) سے خود کو آراستہ کیا۔ آپ نے مدرسہ باقیات میں تعلیم حاصل کرتے ہوئے طلبہ کی صد سالہ قدیم اردو انجمن جس کا نام 'انجمن ترقی اردو' ہے میں سرگرمی سے حصہ لیا، وہاں کے ادبی ماحول کا یہ اثر ہوا کہ آپ میں شعروسخن کا ذوق اس طرح موجزن ہونے لگا کہ آپ اردو اور فارسی ادب کے بحر ذخار استاذ الاساتذہ حضرت علامہ فدوی باقوی کے 'حلقۂ ارباب ذوق' میں شریک ہوگئے۔ علامہ فدوی باقوی کی صحبتوں نے آپ کو فن شاعری کے لطائف ورموز سے بہرہ ور کردیا، اس کے بعد آپ کا شمار ٹمل ناڈو کے معتبر شعرا میں ہونے لگا، آپ کی پذیرائی ہر جگہ ہوتی رہی اور شاعری میں آپ سے استفادہ کرنے کے لیے طلبا کی بھیڑ لگی رہتی تھی، اس طرح آپ طلبا اور بچوں کی تعلیم وتربیت میں ہمہ تن مصروف رہے۔ بقول افضل العلما یوسف کوکن عمری ایم۔اے۔ایم لٹ:

''یہ کام (نواب سی عبدالحکیم کے سوانحی حالات تحریر کرنے کا کام) ہمارے ہردل عزیز ادیب اور شاعر مولوی حافظ عبدالرزاق صاحب باقوی رایچوٹی نے بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ یہ بچوں کے شاعر ہیں، بڑی پیاری زبان لکھتے ہیں، ان کی چھوٹی چھوٹی اور پیاری نظمیں اور نعتیں اردو داں حضرات سے خراج تحسین وصول کرچکی ہیں۔ ان کی چند نظمیں مہاراشٹرا کی سرکاری ابتدائی نصابی کتابوں میں داخل ہوچکی ہیں، ان کی کتابیں 'نئی کلیاں' ننھے پھول اور ذکر حبیب' بہت مقبول ہوچکی ہیں۔''[2]

یہاں بطور نمونہ چند نظموں کے اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں تاکہ معلوم ہو کہ 'ادب اطفال' میں آپ کا مقام کس قدر اہم اور کتنا بلند ہے۔

نظم 'دعا'

میں علم کا ہوں پیاسا تیرے حضور آیا
کرتا ہوں عاجزی سے تجھ سے دعا خدایا
یا رب زدنی علما
یا رب زدنی علما
یا رب علیم تو ہے یا رب حکیم تو ہے
یا رب رحیم تو ہے یا رب کریم تو ہے
تو مجھ پہ رحم فرما
یا رب زدنی علما
صدق و صفا عطا کر صبر و رضا عطا کر
دل کو ضیا عطا کر علم اے خدا عطا کر
میری مراد برلا
یا رب زدنی علما
ہو نیک ہر ارادہ سینہ بھی ہو کشادہ
میرے لیے ہو آساں علم و ہنر کا جادہ
پوری ہو یہ تمنا
یا رب زدنی علما [3]

نظم 'اللہ کی نعمتیں'

دی ہیں اللہ نے ان گنت نعمتیں
اتنی طاقت کہاں ان کو ہم گن سکیں
دی ہے ستھری ہوا، سانس لیتے رہیں
جو ہوا بند ہو گھٹ کے دم سب مریں
پاک مسرور ہوں رات کی راحتیں
ہو کے ہم تازہ دم دن میں محنت کریں
مینہ نہ برسے اگر، یہ زمیں ہو نہ تر
کیسے غلہ اگے کھاکے کیا ہم جئیں
نیلگوں آسماں اک حسیں گلستاں
چاند تاروں کے گل اس میں ہر شب کھلیں

جو انسان دوست ہوتے ہیں، خدا ترس ہوتے ہیں، وہ ہمیشہ کوشش کرتے ہیں کہ دنیا خوب سے خوب تر بن جائے اور دنیا کو خوب سے خوب تر بنانے کے لیے بہتر سے بہتر انسان کی تعمیر کی ضرورت ہے اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ننھے منے بھولے بھالے بچوں سے دلچسپی اور ان کی زندگی کو صالح زندگی کی طرف لے جانے کی بھرپور کوشش چاہیے ، اردو میں وہ لوگ جو اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ بچے مستقبل کے اچھے انسان ہوں، ان میں ایک حافظ عبدالرزاق حافظ باقوی رائچوٹی بھی ہیں۔

یہ پہاڑ اور بن، پیڑ پودے چمن
ندّی نالے زمیں، اس کی سب برکتیں
ساری چیزیں ہیں رب کی بنائی ہوئی
شکر اس کا ادا ہم نہ کیسے کریں 4

نعت شریف کے چند شعر یہ ہیں۔

خدا کے نبیؐ کا میں پیارا بنوں گا
کہ ذرے سے روشن ستارا بنوں گا
چلوں گا محمدؐ کے نقش قدم پر
ستارے سے پھر ماہ پارا بنوں گا
رسول خداؐ کی ہدایت پہ چل کر
میں ٹوٹے دلوں کا سہارا بنوں گا
مجھے چاند بن کر چمکنا ہے اک دن
نبیؐ کی نظر کا اشارا بنوں گا 5

حافظ باقوی نے اپنے فرزند شفیع الدین عرف چاند باشاہ کے لیے ایک نظم 'ماں کا چاند' کے عنوان سے لکھی تھی جو 'پیام تعلیم' دہلی کے اپریل 1980 کے شمارے میں شائع ہوئی، یہ نظم اتنی سادہ اور رواں دواں ہے کہ بچوں کو سنتے ہی ازبر ہوجاتی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

'ماں کا چاند'

ننھا منا پیارا چاند　　سب کی آنکھ کا تارا چاند
جگمگ جگمگ چمکے ہے　　گودی میں چمکیلا چاند
بہنیں پیار سے کہتی ہیں　　اس کو بھولا بھالا چاند
امّی چوم کے کہتی ہیں　　میرے دل کا ٹکڑا چاند
اس سے روشن گھر آنگن　　سارے گھر کا اجالا چاند 6

راقم اس مقالے کے اختتام سے پیشتر اردو دنیا کے نامور اور محترم ومکرم ادیب وقلمکار، محقق ومصنف پروفیسر عبدالقوی دسنوی کی تحریر پیش کرنا چاہتا ہے تاکہ وہ حضرات جو جنوب کے اس معمار ادب اطفال کے مقام ومرتبہ سے تو کیا نام اور کام سے بھی واقف نہیں ہیں، معلوم کرلیں کہ عالم اردو کسی گوشے یا قطعے کا نام نہیں ہے بلکہ اس کی وسعت اور اس کی جہات ہمارے محدود خیال وفکر سے بھی آگے ہے۔ پروفیسر عبدالقوی دسنوی، صدر شعبۂ اردو، سیفیہ پوسٹ گریجویٹ کالج، بھوپال فرماتے ہیں۔

''جو انسان دوست ہوتے ہیں، خدا ترس ہوتے ہیں، وہ ہمیشہ کوشش کرتے ہیں کہ دنیا خوب سے خوب تر بن جائے اور دنیا کو خوب سے خوب تر بنانے کے لیے بہتر سے بہتر انسان کی تعمیر کی ضرورت ہے اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ننھے منے بھولے بھالے بچوں سے دلچسپی اور ان کی زندگی کو صالح زندگی کی طرف لے جانے کی بھرپور کوشش چاہیے، اردو میں وہ لوگ جو اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ بچے مستقبل کے اچھے انسان ہوں، ان میں ایک حافظ عبدالرزاق حافظ باقوی رائچوٹی بھی ہیں۔ حافظ صاحب عرصے سے نظموں کے ذریعہ بچوں کی ذہنی تعمیر میں مصروف ہیں، اس سلسلے کی ان کی تصانیف 'نئی کلیاں' اور 'چاند تارے' میری نظروں سے گزرچکی ہیں جو نہ صرف اچھی ہیں بلکہ بہت اچھی ہیں اور جن اچھے مقاصد کے لیے لکھی گئی ہیں ان پر پوری اترتی ہیں۔ اسی سلسلے کی ان کی نئی تصنیف 'پھلواری' زیر طبع ہے جس کا مطالعہ کرنے کا مجھے بھی موقع ملا ہے، اس لیے میں یہ بات نہایت وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس کی بیشتر نظمیں چھوٹے بچوں کی ذہنی نشوونما کے لیے نہایت مفید ہیں۔''7

آخر میں حافظ باقوی کی معرکہ آرا تصنیف 'قمر نامۂ اسلام' پر جو خصوصاً طالب علموں کے لیے لکھی گئی، اردو کے مایہ ناز ادیب ومحقق پروفیسر مختار الدین احمد کے تاثرات کا ذکر بے جانہ ہوگا:

''حافظ عبدالرزاق صاحب اب بچوں کے لیے سرور کائنات فخر موجودات حضرت محمدؐ کی منظوم سیرت طیبہ 'قمر نامۂ اسلام' شائع کررہے ہیں، نعت گوئی ہو یا سیرت نگاری دونوں کے کچھ حدود اور ضابطے ہیں۔ ان سے کماحقہ عہدہ برآ ہونا ایک کٹھن کام ہے، اس میں بڑے نازک مقامات آتے ہیں، یہ مشکلات اس وقت اور بڑھ جاتی ہیں جب سیرت منظوم ہو اور خاص طور پر بچوں کے لیے لکھی جائے، حافظ صاحب چونکہ شاعر ہی نہیں ہیں، وہ دینی علوم سے پوری واقفیت بھی رکھتے ہیں اور ہر قسم کے خیالات نظم کرنے پر پوری قدرت رکھتے ہیں، اس لیے پیش نظر کتاب (قمر نامۂ اسلام) جس میں سرور کائناتؐ کی حیات طیبہ چھوٹی اور مترنم بحروں میں نظم کی گئی ہے، ایک قابل قدر کوشش ہے، مجھے یقین ہے اہل ذوق انہیں اس کی داد دیں گے اور اسے وہ قبولیت حاصل ہوگی جس کی یہ کتاب مستحق ہے۔''8

'قمر نامۂ اسلام' کے چند متفرق اشعار ملاحظہ ہوں جن میں سادگی اور بے ساختگی بدرجہ اتم موجود ہے۔

برابر نبیؐ ظلم سہتے رہے
مگر ہر گھڑی حق ہی کہتے رہے
مگر کار تبلیغ جاری رہا
لب شاہ پر نام باری رہا
نہ دیکھا نبیؐ کو وہ غافل رہے
اندھیرے میں ابنائے باطل رہے
تھے محو عبادت نبیؐ رات بھر
تھی آنکھوں میں شہ کی نمی رات بھر
یوں لگتا تھا جب بات کرتے رسولؐ
دہان مبارک سے جھڑتے ہیں پھول
بہت خوب صورت تھے شاہ ہدیٰؐ
تھا گالوں میں گویا قمر تیرتا 9

ماخذ وحواشی

(1) عبدالرزاق حافظ باقوی، مقدمہ از نجم الہدیٰ پروفیسر 'وشارم میں اردو' سی عبدالحکیم کالج کمیٹی، میل وشارم، ٹمل ناڈو مطبوعہ 1986، ص 10
(2) عبدالرزاق حافظ باقوی، پیش لفظ از یوسف کوکن عمری افضل العلما 'مخبر اعظم' سی عبدالحکیم کالج کمیٹی، میل وشارم، مطبوعہ 1975 ص 18-19
(3) حافظ باقوی، 'ننھے پھول' کتاب گھر، جمیل آباد، میل وشارم مطبوعہ باردوم 1973 ص 13
(4) حافظ باقوی، 'پھلواریاں' آندھراپردیش اردو اکیڈمی، حیدرآباد، مطبوعہ 1982، ص 29
(5) ایضاً ص 19
(6) ایضاً ص 39
(7) ایضاً 8-9
(8) حافظ باقوی، 'حرف چند' از ڈاکٹر مختار الدین احمد صاحب، قمر نامۂ اسلام، حافظ پبلی کیشنز، میل وشارم' مطبوعہ 1990، ص 16-17
(9) ایضاً ص 14-15

■

Rahi Fidai
House No.: 1616, 4th Cross
Sivaramayaa Layout, H.B.R. 3rd Block
Kalyan Nagar
Bangalore - 560043 (Karnataka)

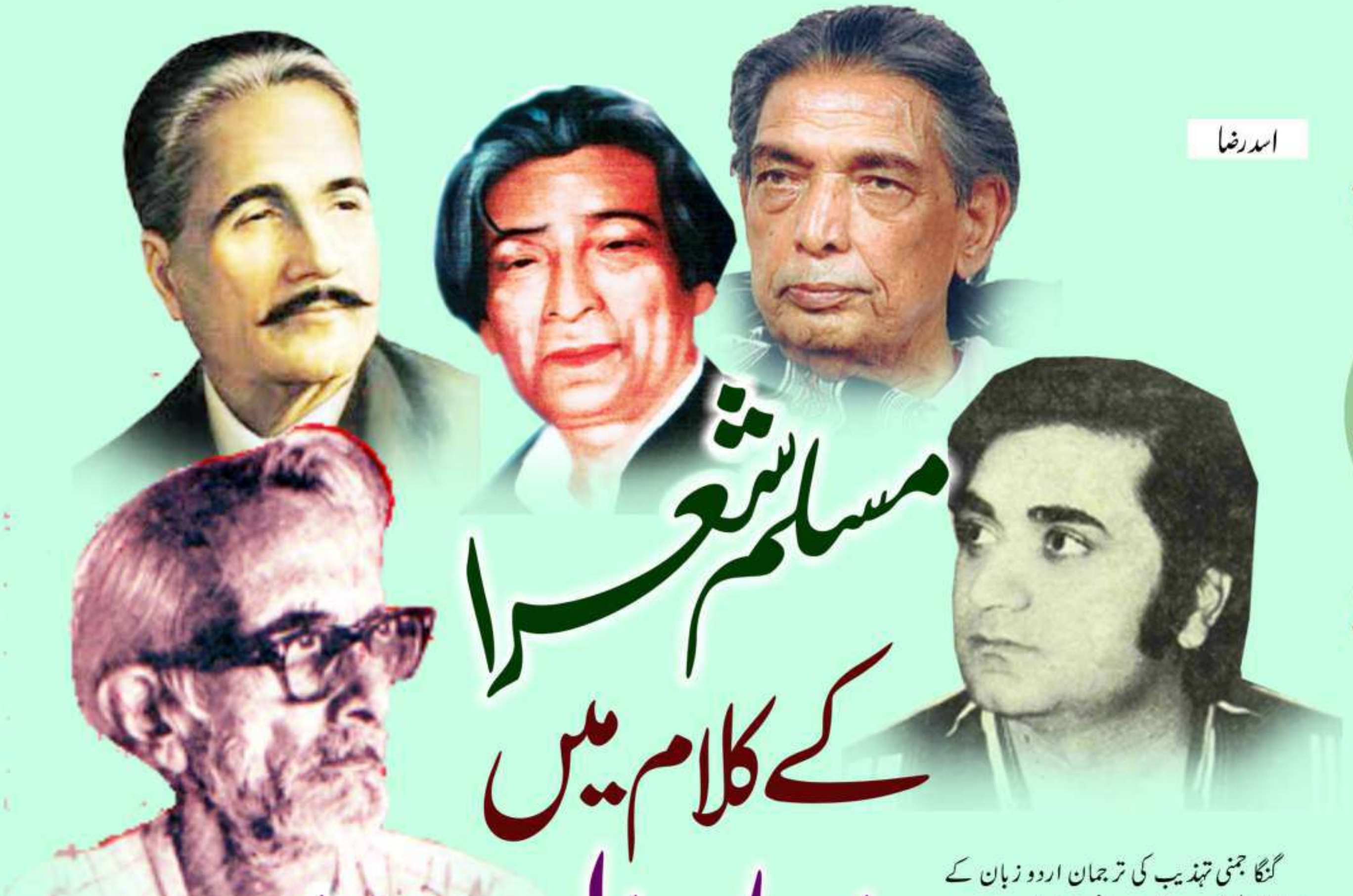

اسد رضا

مسلم شعرا کے کلام میں امام الہند رام

گنگا جمنی تہذیب کی ترجمان اردو زبان کے بے شمار غیر مسلم شعراء نے جہاں پیغمبر آخرالزماں حضرت محمدؐ کی شان میں نعتیں کہیں اور واقعۂ کربلا سے متعلق مراثی کہے وہیں متعدد مسلم شعرا نے ہندو دھرم، بودھ دھرم، جین دھرم اور سکھ دھرم کی متبرک ہستیوں کے بارے میں عقیدت ومحبت سے لبریز نظمیں کہیں۔ یوں تو ہندو دھرم میں بہت سے دیوی دیوتا ہیں، لیکن ان میں ایک نمایاں نام شری رام چندر جی کا ہے جنھیں شاعر مشرق علامہ اقبال نے امام الہند قرار دیا ہے۔مولوی عبدالستار، صفدر آہ، محمد امتیاز الدین خاں، مولانا ظفر علی خاں، ڈاکٹر محمد اقبال، جاں نثار اختر، کیفی اعظمی، عمیق حنفی، زہرہ نگاہ، صلاح الدین پرویز اور مہدی نظمی وغیرہ جیسے متعدد مسلم شعراء نے رام چندر جی کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔ یہاں یہ تذکرہ بھی برمحل ہوگا کہ ساری دنیا میں جہاں کروڑوں ہندو بھائی رام چندر جی کو بھگوان اور اوتار مان کر ان کی پوجا کرتے ہیں وہیں کروڑوں غیر ہندو یعنی مسلمان، عیسائی، بودھ، جین، سکھ اور پارسی بھی ان (شری رام) کی قربانی، بہادری اور انصاف پروری کے معترف ہیں اور ان سے محبت وعقیدت رکھتے ہیں۔ راجہ جنک کی بیٹی سیتا کے سوئمبر میں جب تمام راجہ اور راجکمار بھاری بھرکم دھنش (تیر کمان) کو نہیں اٹھا پائے تو رام نے اسے اٹھا کر اپنی طاقت اور بہادری کا مظاہرہ کیا اور سیتا جی سے ان کی شادی ہو جاتی ہے۔ دیگر راجہ اور راجکمار بھی ان کی قوت وشجاعت کے قائل ہو جاتے ہیں۔

رام کی سوتیلی ماں کیکئی نے اپنے سگے بیٹے بھرت کو راجہ بنانے کی سازشی کوشش کے تحت اپنے شوہر راجہ دشرتھ کے تخت وتاج کے اصلی وارث رام چندر جی کو 14 سال کے لیے بن باس پر بھجوا دیا تھا۔ چونکہ مریادا پرشوتم (روایات ورسوم کی حدود سے تجاوز نہ کرنے والا بہترین انسان) رام نے محلوں کی آرام دہ زندگی کو اپنے والدین کے حکم پر چھوڑ دیا اور اپنی اہلیہ سیتا جی اور چھوٹے بھائی لکشمن کے ساتھ بن (جنگل) میں جا کر مصائب وآلام سے بھری زندگی گزارنے لگے۔ بن باس کے دوران ہی سیتا جی کا ہرن (اغوا) کرنے والے لنکا کے راجہ راون سے جنگ کے دورن رام چندر جی نے عزم وشجاعت کے جوہر دکھلائے اور راون کو موت کے گھاٹ اتارا۔اسی لیے ایثار و بہادری اور محبت کی علامت رام کے کردار سے دنیا متاثر ہوئی اور ہر سال ان کی یاد میں رام لیلائیں ہوتی ہیں۔

اگرچہ سرزمین ہند پر بے شمار دیوی، دیوتا، رشی منی، اوتار اور عظیم شخصیات پیدا ہوئیں تاہم ان سب میں رام چندر جی خصوصی اہمیت کے حامل ہیں اور ان سے لوگوں کو نسبتاً زیادہ عقیدت ومحبت ہے۔ اسی لیے علامہ اقبال رام کی عظمت وعزت کا اعتراف کرتے ہوئے اپنی نظم 'امام الہند رام' میں فرماتے ہیں۔

لبریز ہے شرابِ حقیقت سے جامِ ہند
سب فلسفی ہیں خطۂ مشرق کے رام ہند
یہ ہندیوں کے فکرِ فلک اس کا ہے اثر
رفعت میں آسمان سے اونچا ہے بامِ ہند

اور پھر رام چندر جی کی علمیت، تقدس بہادری اور ایثار ومحبت کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد اقبال اپنی اس نظم میں کہتے ہیں۔

ہے رام کے وجود پہ ہندوستاں کو ناز
اہل نظر سمجھتے ہیں اس کو امام ہند
تلوار کا دھنی تھا شجاعت میں فرد تھا
پاکیزگی میں جوش محبت میں فرد تھا

اردو کے مشہور ومقبول شاعر عبدالصمد یار خاں ساغر نظامی

مرحوم نے جہاں اسلامی شخصیات اور متبرک ہستیوں کو اپنے کلام بلاغت نظام میں پرخلوص خراج عقیدت پیش کیا وہیں انھوں نے ہندوستان کی انتہائی مقدس شخصیت رام چندر جی کو بھی منظوم خراج عقیدت کا نذرانہ دیتے ہوئے کہا۔

جس کا دل تھا اک شمع طاقِ ایوان حیات
روح جس کی آفتاب صبحِ عرفانِ ذات
زندگی کی رفعتوں سے،منزلوں سے اونچا تھا وہ
آسمانِ معرفت کا ایک سیارہ تھا وہ

ساغرنظامی اپنی اس نظم 'رام' کے آخر میں فرماتے ہیں۔

زندگی کی روح تھا روحانیت کی شان تھا
وہ مجسم روپ میں انسان کا عرفان تھا
ہندیوں کے دل میں باقی ہے محبت رام کی
مِٹ نہیں سکتی قیامت تک حکومت رام کی

اردو کے معتبر نظم گو شاعر نفیس خلیلی نے 'سوئمبر' کے زیرعنوان ایک طویل نظم کہی تھی جس میں جہاں راجہ جنک کے دربار اور سیتا جی کی عکاسی کرنے والے متعدد اشعار ہیں وہیں رام چندر کی طاقت وشجاعت کی تصویر کشی بھی دلکش الفاظ میں کی گئی ہے۔ جب کوئی بھی راجہ یا شہزادہ دربار میں دھنش کو نہیں توڑ سکا تو راجہ جنک کے چیلنج کو تسلیم کرتے ہوئے شری رام دھنش اٹھانے اور توڑنے کے لیے آگے بڑھے۔اس صورت حال کی تصویر کشی خلیلی نے اشعار میں اس طرح کھینچی ہے۔

انگڑائیاں لیتے ہوئے
اٹھے عجب انداز سے
اک غُل ہوا شیر آگیا
اِک خوف سب پر چھا گیا
گھورا اُسے دیکھا اُسے
تھرا گیا تاکا جسے
شیروں میں یہ طاقت کہاں
اس زور سے موڑی کماں
دس بیس ٹکڑے ہوگئے
کچھ اُڑ گئے کچھ کھوگئے
دل میں 'سیا' اترا گئی
اترا گئی شرما گئی
دل میں خوشی سب کے ہوئی
سب بول اُٹھے جے رام کی

اسی طرح انور خاں انور گوالیاری نے 19ویں صدی میں رام چندر جی کی حیات وکارناموں سے متاثر ہوکر کنڈلیاں کہیں۔وہ کہتے ہیں۔

اردو کے مسلم شعرا نے رام چندر جی کو اپنے کلام میں خراج عقیدت پیش کرکے یہ ثابت کردیا کہ اردو کسی ایک مذہب تک محدود نہیں ہے اور یہ رام کی بھی اتنی ہی ہے جتنی رحیم کی ہے۔

رام رام سے ہے رما،رام کرے سب کام
اپنے کو ہر دم جپے، موہی دیا بسرام
موہی دیا بسرام، رام ہر گھٹ میں چھایا
وہی رام ہردور تجھے سب ٹھور دکھایا
روم روم میں رم رہاانور تیرے رام
رام رام سب میں رما، رام کرے سب کام

رام چندر جی نے سیتا دیوی کی اگنی پریکشا میں کامیابی کے بعد خوشی کا اظہار کیا تھا۔ پاکستان کی مشہور شاعرہ زہرہ نگاہ نے اپنی نظم ''اگنی پریکشا'' میں کہا کہ۔

اگنی پار اُتر کے سیتا جیت گئی وشواس
دیکھا دونوں ہاتھ بڑھائے رام کھڑے ہیں پاس

شاعرہ طاہرہ بانو سعید نے اپنی نظم 'سیتا' میں جہاں سیتا جی کی عظمت بیان کی ہے وہیں رام چندر جی کے روحانی مرتبے پر بھی روشنی ڈالی ہے۔وہ کہتی ہیں۔

اس نے پتی کے روپ میں دیکھا خدا کا روپ
صورت میں رام کی نظر آیا خدا کا روپ
لنکا کی قید میں بھی تھی دھن رام نام کی
دل میں تھی یاد، لب پہ تھی رٹ رام رام کی

معروف استاد شاعر نذیر بنارسی نے بھی رام چرتر مانس کے کوی تلسی داس اور دیوالی پر اشعار کہے۔ نذیر کی نظم 'گنگ وجمن' کے صفحہ 77 پر یہ اشعار ملتے ہیں۔

جنم دن لکشمی کا ہے بھلا اس دن کا کیا کہنا
یہی یہ دن ہے جس نے رام کو راجہ بنایا تھا
کئی اتہاس کو اک ساتھ دہراتی ہے دیوالی
محبت پر وجے کے پھول برساتی ہے دیوالی

مرحوم مہدی نظمی نے 'رامائن' اور رام چندر جی کے بارے میں نظمیں کہیں ان کی نظم 'ایودھیا' کے یہ اشعار ملاحظہ فرمایئے جن میں رام کے چودہ برس کے بن باس پر ایودھیا کے عوام کے غم کی عکاسی ہے۔

جاتے ہیں بن کو رام زمانہ ہے سوگوار
ہے بوڑھا باپ درد جدائی سے بے قرار
کہتی ہے رو کے ساری رعایا نہ جایئے
چودہ برس کو جانب صحرا نہ جایئے

محمد امتیاز الدین خاں نے تو 'رامائن' کے زیرعنوان ایک مثنوی کہی تھی جس کے ابتدائی اشعار دیکھیے۔

خدا کے نام کو ہر سانس میں وردِ زباں کرلوں
اسی کے عشق سے روشن زمین وآسماں کرلوں
دکھاؤں مثنوی میں رام کے کردار کے جوہر
اُسی کی سیرتِ پاکیزہ زیبِ داستاں کرلوں

پروفیسر حنیف کیفی نے اپنی نظم 'مہر جہانتاب رام' میں دنیا کی اس عظیم شخصیت یعنی رام کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا تھا۔

رام وہ مہر جہانتاب ہے جس کے دم سے
پارہ پارہ ہوا شیرازۂ ظلمت کا طلسم
تیرگی دور ہوئی روشنیاں پھیل گئیں
عالم افروز وہ سب روشنیاں آج بھی ہیں
آج بھی بزم جہاں میں ہے چراغاں ان سے

ترقی پسند شاعر کیفی اعظمی فرماتے ہیں۔

چند ریکھاؤں میں سیماؤں میں
زندگی قید ہے سیتا کی طرح
رام کب لوٹیں گے معلوم نہیں
کاش راون ہی کوئی آجائے

پاکستانی شاعر صہبا اختر رام کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

انتریامی کے درشن کو انترگیانی جائے
صہبا جی بن باس سے کوئی رام نہیں بن پائے

اردو کے مسلم شعرا نے اپنی غزلوں میں بھی رام اور بن باس جیسے استعاروں کا نہایت خوبصورت استعمال کیا۔مثلاً معروف ترقی پسند شاعر جاں نثار اختر کہتے ہیں۔

اُجڑی اُجڑی ہوئی ہر آس لگے
زندگی رام کا بن باس لگے

راقم الحروف نے بھی 40 برس قبل ایک نظم 'کوشلیا کے رام' کہی تھی۔جس کے دو اشعار ملاحظہ کیجیے۔

قربانیوں کو کرتا ہے جن کی جہاں سلام
ایثار اور صدق وصفا کے ہیں جو امام
مندر میں گھر میں جپتے ہیں جن کا کروڑوں نام
دشرتھ کے ہیں پسر وہی کوشلیا کے رام

بہرحال اردو کے مسلم شعرا نے رام چندر جی کو اپنے کلام میں خراج عقیدت پیش کرکے یہ ثابت کردیا کہ اردو کسی ایک مذہب تک محدود نہیں ہے اور یہ رام کی بھی اتنی ہی ہے جتنی رحیم کی ہے۔

■

Asad Raza
97-F, Sector 7, Jasola Vihar
New Delhi - 110025
Mob.:09873687378

ریحان حسن

اردو شاعری میں ذکر گورو نانک

دنیا میں بولی جانے والی زبانوں میں 'اردو' بھی ایک ایسی زبان ہے جس نے تمام مذاہب اور انسانوں کے درمیان رواداری، یکجہتی، کشادہ دلی، دردمندی اور بھائی چارے کی فضا قائم کرنے میں پل کا کام کیا ہے اور ایسا کیوں کر نہ ہو اس لیے کہ لفظ اردو کے الفاظ ہی لسانی اتحاد کی نشاندہی کرتے ہیں کیونکہ سنسکرت میں 'ار' کے معنی 'دل' ہیں اور فارسی میں 'دو' کے دو ہوتے ہیں اس طرح لفظ اردو دو دلوں کے جوڑنے کا نام ہے۔ شاید اسی لیے صوفیاء کرام نے بھی جن کی زندگی کا ہدف ہی قوموں کے درمیان انسانی یکجہتی کو فروغ دینا اور تمام مذاہب کے احترام کے ساتھ ساتھ خدا کے معین کردہ اصولوں پر عمل پیرا کرنے کا فریضہ انجام دینا تھا انھوں نے بھی ہندوستان میں اپنے ارشادات و پیغامات کو پہونچانے کے لیے اسی زبان کو ذریعۂ اظہار بنایا۔

خواجہ معین الدین چشتی، خواجہ بختیار کاکی، نظام الدین اولیا، میر وارث علی شاہ، گیسو دراز، بلھے شاہ، بابا فرید اور گورو نانک دیو جی وغیرہ نے اپنے پیغامات اور فرمودات کو بنی نوع انسان تک پہونچانے کے لیے دیگر زبانوں کے ساتھ ساتھ اس زبان کو اختیار کیا جو آپسی میل جول کی وجہ سے سرزمین ہند پر 'اردو' کی شکل اختیار کر رہی تھی۔ چونکہ یہ زبان ہندوستان میں بسنے والی تمام قوموں کے درمیان رابطہ کی زبان تھی لہٰذا اس زبان نے تمام مذاہب کے احترام کا سب سے زیادہ سبق بھی سکھایا۔ اردو زبان کی تاریخ گواہ ہے کہ اردو زبان کے شعرا اور مصنّفین نے ایک دوسرے کے مذاہب کے متعلق نظم و نثر میں جس انداز سے نقوش ثبت کیے ہیں اس کی مثال شاذ و نادر ہی نظر آتی ہے۔ اگر اس زبان میں حضرت محمد مصطفٰےؐ اور حضرت علیؓ وغیرہ کے متعلق نعتیں و منقبتیں ملتی ہیں تو رام اور گورو نانک دیو جی کے لیے نظمیں بھی نظر آتی ہیں جن میں عقیدت کے بیش بہا پھول نثار کیے گئے ہیں انھیں نظموں میں شاعر مشرق علامہ اقبال کی نظم 'نانک' کے عنوان سے ملتی ہے جس میں ہندوستان میں بسنے اور رہنے والوں کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کا ذکر کرتے ہوئے ذات واحد کی تعریف اور لوگوں کو صرف خدا کی عبادت کی طرف دعوت دینے کا ذکر کیا گیا ہے۔ شاعر مشرق گورو نانک دیو جی کے اس عملی اقدام کا ذکر کچھ اس طرح کرتے ہیں۔

قوم نے پیغام گوتم کی ذرا پروانہ کی　　قدر پہچانی نہ اپنے گوہر یک دانہ کی
آہ بدقسمت رہے آوازِ حق سے بے خبر　　غافل اپنے پھل کی شیرینی سے ہوتا ہے شجر
آشکار اس نے کیا جو زندگی کا راز تھا　　ہند کو لیکن خیالی فلسفہ پر ناز تھا
شمع حق سے جو منور ہو یہ وہ محفل نہ تھی　　بارش رحمت ہوئی، لیکن زمیں قابل نہ تھی
آہ شودر کے لیے ہندوستاں غم خانہ ہے　　دردِ انسانی سے اس بستی کا دل بیگانہ ہے
برہمن سرشار ہے اب تک اسی پندار میں　　شمع گوتم جل رہی ہے محفل اغیار میں
بتکدہ پھر بعد مدت کے مگر روشن ہوا　　نور ابراہیم سے آذر کا گھر روشن ہوا
پھر اٹھی آخر صدا توحید کی پنجاب سے　　ہند کو اک مرد کامل نے جگایا خواب سے

(کلیات اقبال، بانگ درا، حصہ سوم، صفحہ 195)

علامہ اقبال کی اس نظم میں گورو نانک جی کو 'مرد کامل' کہہ کر خطاب کیا گیا ہے جو قابل غور و فکر ہے کیونکہ اس شاعر کی زبان سے جملہ ادا ہوا ہے جسے لوگ حکیم امت کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں۔

گورو نانک جی پر اردو میں ایک اہم نظم ولی محمد نظیر اکبرآبادی کی بھی ہے جو اپنے سیکولر طرز فکر کے سبب منفرد حیثیت کے حامل ہیں۔ ان کی نظم کا عنوان 'گرو نانک جی کی مدح' ہے۔ اس نظم میں گورو نانک جی کو مرد کامل کے بجائے 'کامل رہبر' کے نام سے یاد کیا گیا ہے جو مفہوم و معانی کے اعتبار قریب المعنی ہے۔

ہیں کہتے نانک شاہ جنھیں وہ پورے ہیں آگاہ گرو　　وہ کامل رہبر جگ میں ہیں یوں روشن جیسے ماہ گرو
مقصود مراد امید سبھی برلاتے ہیں دل خواہ گرو　　نت لطف و کرم سے کرتے ہیں ہم لوگوں کا نرباہ گرو
اس بخشش کے اس عظمت کے ہیں بابا نانک شاہ گرو　　سب سیس نوا ارداس کرو اور ہر دم بولو واہ گرو

(کلیات نظیر اکبرآبادی)

ولی محمد نظیر اکبرآبادی کی نظم 'گورو نانک جی کی مدح' میں پنجابی، عربی، فارسی اور اردو زبان کا ہنرمندانہ استعمال کیا گیا ہے۔ نظم میں گورو نانک جی کی خصوصیات و امتیازات کو خوبصورت پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ ان کا یہ کہنا سچائی پر مبنی ہے۔

ہر آن دلوں بیچ یاں اپنے جو دھیان گرو کا لاتے ہیں
اور سیوک ہو کر ان کے ہی ہر صورت بیچ کہاتے ہیں
کر اپنی لطف و عنایت سے سکھ چین اسے دکھلاتے ہیں
خوش رکھتے ہیں ہر حال انھیں سب من کا کاج بتاتے ہیں
اس بخشش کے اس عظمت کے ہیں بابا نانک شاہ گرو
سب سیس نوا ارداس کرو اور ہر دم بولو واہ گرو
جو آپ گرو نے بخشش سے اس خوبی کا ارشاد کیا
ہر بات وہی اس خوبی کی تاثیر نے جس پر صاد کیا
یاں جس جس نے ان باتوں کو ہے دھیان لگا کر یاد کیا
ہر آن گرو نے دل ان کا خوش وقت کیا اور شاد کیا
اس بخشش کے اس عظمت کے ہیں بابا نانک شاہ گرو
سب سیس نوا ارداس کرو اور ہر دم بولو واہ گرو

نظیر اکبرآبادی نے اس نظم میں یہ بھی یقین دلانے کی کوشش کی ہے کہ جس نے بھی سچے دل سے گرو نانک جی کو یاد کیا انھوں نے آکر اس کا بیڑا پار لگایا اور اس طرح اس کی زندگی خوشی و شادمانی سے پر ہوگئی۔ نظیر گرو نانک جی کی مدح سرائی کرتے ہوئے کچھ یوں گویا ہیں۔

دن رات سبھوں نے یاں دل دے ہے یاد گرو سے کام لیا
سب منکے مقصد بھر پائے خوش وقتی کا ہنگام لیا
دکھ درد میں اپنے دھیان لگا جس وقت گرو کا نام لیا
پل بیچ گرو نے آن انھیں خوشحال کیا اور تھام لیا
اس بخشش کے اس عظمت کے ہیں بابا نانک شاہ گرو
سب سیس نوا ارداس کرو اور ہر دم بولو واہ گرو

گرونانک جی کی بخشش وعطا کا ذکر کرتے ہوئے نظیر کا کہنا ہے۔

جو ہر دم ان سے دھیان لگا امید کرم کی دھرتے ہیں
وہ ان پر لطف و عنایت سے ہر آن توجہ کرتے ہیں
اسباب خوشی اور خوبی کے گھر بیچ انھوں کے بھرتے ہیں
آنند عنایت کرتے ہیں سب من کی چنتاہرتے ہیں
اس بخشش کے اس عظمت کے ہیں بابا نانک شاہ گرو
سب سیس نوا ارداس کرو اور ہر دم بولو واہ گرو

نظیرا کبرآبادی نے گرونانک جی کے جن صفات کا ذکر کیا ہے اس کی تصدیق ان کی زندگی کے مطالعے سے بھی بدرجۂ اتم ہوتی ہے۔ظاہر ہے کہ عظیم مذہبی رہنماؤں میں گرونانک دیو جی سب سے زیادہ ہمارے زمانے سے قریب ہیں ان کا زمانہ پانچ صدی سے زیادہ پہلے کا نہیں ہے لہٰذا ان کی زندگی اور تعلیمات تاریخ نگاروں کے سامنے ہے۔

جاوید وششٹ کا شمار اردو کے معتبر شعراء میں ہوتا ہے انھوں نے بھی گرونانک جی پر گلہائے عقیدت نثار کیے ہیں ان کی مشہور نظم 'ذکر نانک' کے عنوان سے ملتی ہے جس میں وہ کچھ یوں گویا ہیں۔

ذکر نانک پہ سر جھکاتا ہوں پھر میں لوح و قلم اٹھاتا ہوں
نکہت نو بہار آئی ہے اس کا سندیس ہی تو لائی ہے
ذات اس کی ہے چشمۂ عرفاں نام اس کا ہے نانک دوراں
نام نانک کا جام امرت کا آج نانک ہے نام امرت کا
رازداں زندگی فطرت کا آشنا درد آدمیت کا
اشک شبنم ہے وہ گل تر ہے درد انسانیت کا پیکر ہے
وہ گرو اک دماغ روشن ہے معرفت کا چراغ روشن ہے

(آج کل دہلی، گرونانک نمبر، نومبر 1969، صفحہ 3)

گورو نانک جی کے دل میں انسانیت کے لیے جو درد تھا اس کی جانب شاعر نے خوبصورت انداز میں اشارے کیے ہیں اور یہ باور کرایا ہے کہ انھوں نے اپنے قول وعمل کے ذریعے مذہب کی اصل سچائی سے لوگوں کو متعارف کرایا اور یہ ثابت کیا کہ مذہب تفریق وجدائی کا خواہاں نہیں بلکہ اتحاد و یگانگت کا طلبگار ہے۔خدا کے نزدیک نہ کوئی ہندو ہے نہ مسلمان، نہ کوئی بدھ مت ہے نہ کوئی عیسائی بلکہ دنیا کے تمام انسان خدائے واحد کے بندے ہیں اور ایک دوسرے کے تئیں انسانیت کی قدروں اور انسانیت کے اصول کی پاسداری ہی میں مذہب کی سچائی مضمر ہے۔

آج بھی گورودوارے کے دروازے تمام مذاہب کے ماننے والوں کے لیے کھلا رہنا اس بات کی دلیل ہے کہ گرونانک جی نے مذہب کی تفریق ختم کرنے کے لیے محض قول کا سہارا ہی نہیں لیا بلکہ عملی ثبوت بھی پیش کیا یہی نہیں انھوں نے بھائی بالا جی جو ہندو مذہب سے تعلق رکھتے تھے اور بھائی مردانا جن کا تعلق مذہب اسلام سے تھا دونوں کو ایک ساتھ رکھ کر انسانی یک جہتی واخوت کا جو ثبوت پیش کیا ہے اس کی مثال نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔

یہ سنہری کلس، یہ گرودوارے سب ہیں انسانیت کے گہوارے
ان میں گونجے ہے وہ مدھر بانی جس طرح جل ترنگ میں پانی
روح کو فتح مند اس نے کیا حق کا پرچم بلند اس نے کیا
درس توحید کا دیا سب کو مل گیا جیسے اک دیا سب کو

(ایضا)

گرونانک جی نے اپنی تعلیمات کے ذریعے ہندو اور مسلمانوں کے درمیان اخوت و بھائی چارے کی فضا قائم کرنے میں جو سعی کی اس میں انھیں کامیابی وکامرانی بھی نصیب ہوئی جس کے نتیجے میں دونوں مذہب کے انسان آج بھی گرونانک کو عقیدت واحترام کی نظر سے دیکھتے ہیں اور ان کی شان میں مختلف انداز سے نذرانۂ عقیدت پیش کرتے نظر آتے ہیں۔جیسا کہ منور لکھنوی لکھتے ہیں۔

ہر شوالے میں تکریم نانک کی تھی خانقاہوں میں تعظیم نانک کی تھی
پاک سے پاک تنظیم نانک کی تھی درس نانک کا تعلیم نانک کی تھی
منزلت یہ بنائے مباہات ہے پانچ سو سال پہلے کی یہ بات ہے

(گرونانک کا ظہور مقدس، آج کل دہلی، گرونانک نمبر نومبر 1969، صفحہ 25)

گورونانک دیو جی نے اس عہد کی ضرورتوں کے مطابق عقیدۂ توحید کو پیش کیا جو اسلامی عقائد کی اصل ہے۔ اسلام میں عقیدۂ توحید کو انتہائی اہمیت حاصل ہے۔عقیدۂ توحید یعنی تمام مخلوق کا پیدا کرنے والا پروردگار عالم ہے اور وہ شکل وشمائل سے بالاتر ہے۔اسلام نے انسانوں کے درمیان اخوت و بھائی چارے رواداری اور سماجی زندگی کو بے انتہا اہمیت دی ہے ان چیزوں کو گورونانک جی نے بھی انسانی زندگی میں اہمیت پر زور دیتے ہوئے پیار ومحبت، امن وآشتی، بھائی چارے اور انسان دوستی کا درس دیا اوہام پرستی، اندھی تقلید، بے روح مذہب پرستی، اونچ نیچ اور ذات پات کے خلاف آواز اٹھاتے ہوئیں محبت و رواداری کا ایسا پیغام دیا جو ہر دور کی ضرورت ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ تمام مذاہب کے رہنماؤں نے انسانوں کی بھلائی ہی کے لیے کام کیا ان کے اقوال واعمال انسانوں کو نیک سچے اور سیدھے راستے کی ہی رہنمائی کرتے ہیں گرونانک دیو جی نے بھی اپنے اقوال واعمال اور افعال کے ذریعے انسانوں کو سیدھے اور سچے راستے پر چلنے کی تلقین کی بسمل سعیدی دہلوی کا یہ کہنا صداقت پر مبنی ہے

کیا درس ہے وہ درس جو اقوال میں ہے حکمت سی وہ حکمت ہے جو اعمال میں ہے
وہ قول ہو تیرا کہ عمل ہو، نانک بے مثل وہ اس عالم امثال میں ہے

(رباعیات)

بسمل سعیدی نے گورونانک دیو جی کو اس دنیا میں بے مثل قرار دیتے ہوئے ان کی عظمت وجلالت کا اعتراف کیا ہے۔گورونانک دیو جی کی زندگی کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ صرف ان کے آگے انسانوں کے سر خم نہیں ہوئے بلکہ بڑے بڑے سورماؤں اور شہنشاہوں کے سر بھی آپ کے حضور میں جھک گئے چنانچہ عزیز وارثی دہلوی یوں گویا ہیں

تیرے قدموں پر شہنشاہوں کی پیشانی جھکی زندگی تیری یقیناً لائق تحسین ہے

(بابا گورونانک)

انسانوں اور شہنشاہوں نے گورونانک دیو جی کے حضور سر نیاز خم اس لیے کیا کہ انھوں نے انسانوں کو جہالت وتاریکی سے نکال کر خواب غفلت سے بیدار کیا اور یہ باور کرایا کہ خدا ہی عبادت کے لائق ہے اور سبھی کا پروردگار ذات واحد ہی ہے جیسا کہ رام کشن مضطر نے گورونانک دیو جی کی خدمات کا اعتراف کیا ہے۔

مثل خورشید جہاں تاب تھا نانک کا ظہور تیرگی دور ہوئی پھیل گیا نور ہی نور
اک تجلی سے ہوا سینۂ گیتی معمور ایک آواز نے بخشا ابدیت کا شعور
حق کی تعلیم سے انسان کو جب گیان ہوا ایک ہے سب کا خدا سب کو یہ عرفان ہوا

(بابانانک مرشد کامل)

دراصل گورونانک دیو جی کی تعلیمات کسی ایک مذہب اور مکتبۂ فکر کے لیے مخصوص نہ تھی بلکہ ان کی تعلیمات اور اعمال و افعال میں تمام مذاہب کے لوگوں کے لیے پیغام پنہاں ہے۔انھوں نے کسی ایک مذہب کے لوگوں کی بھلائی پیش نظر نہ رکھی بلکہ تمام انسانوں کی بھلائی اور فلاح و بہبود کے لیے کام کیا چنانچہ گورونانک دیو جی کی تعلیمات کے عالمگیر ہونے کا اعتراف جناب الہٰ یار خاں جوگی نے کچھ ان الفاظ میں کیا ہے۔

نانک اعظم کی ہر تعلیم عالمگیر تھی الفت انساں کی جیتی جاگتی تصویر تھی
ایک مذہب کے لیے ہرگز نہ تھی محدود وہ سب کو دکھلاتی تھی راہ منزل مقصود وہ

(نانک اعظم)

اردو شاعری میں نمایاں مقام حاصل کرنے والوں میں بسمل ایمن آبادی کا بھی نام ہے۔ انھوں نے گورونانک دیو جی کے نام کے حروف کی تشریح شعر میں یوں نظم کیا ہے۔

نون سے نور خدا روشن ہے تیرے نام پر ہے الف اللہ اکبر کا علم با کرو فر
کن کو الٹا صاف تیرا نون کاف آیا نظر مرحبا اے عالی چشم عالی نسب عالی گہر
چار دانگ عالم میں تیرے نام کی کیا دھوم ہے جو ترا خادم ہو وہ اب بن گیا مخدوم ہے

(مسدس)

گورونانک دیو جی نے دنیا میں انسانوں کی رہنمائی و رہبری جس انداز سے کی اس کا اعتراف ہر مکتبۂ فکر کے افراد نے کیا ہے۔ ان کے صالح اعمال و افعال کے سبب صرف ان کا کام ہی ہر دل عزیز نہیں بلکہ ان کا نام بھی سبھی کو عزیز ہے جیسا کہ شفقت کاظمی ڈیرہ غازی خاں کہتے ہیں۔

ہم کو دل سے عزیز ہیں دونوں وہ تیرا کام ہو کہ نام ترا

(نذر عقیدت)

گورونانک جی نے تمام انسانوں کے درمیان مساوات کا درس دیا اور انھوں نے یہ باور کرایا کہ مخلوق خدا کی خدمت ہی اصلا عبادت ہے چنانچہ خموش سرحدی نے آپ کی تعلیمات و افکار کی ترجمانی 'بابا نانک' کے عنوان سے نظم میں کچھ یوں کیا ہے۔

خدا برتر، خدا واحد، مگر انساں برابر ہیں تفاوت جو روا رکھتے ہیں انسانوں میں کافر ہیں
عمل سے بندۂ خاکی فرشتہ بھی ہے شیطاں بھی عمل کے سوز سے روح و دل آدم منور ہیں
تری تعلیم تھی یہ زندگی سچ ہے حقیقت ہے مسلسل خدمت خلق خدا اصل عبادت ہے

(بابا نانک)

انسانوں کے درمیان امیر و غریب، ادنی و اعلی کا تصور ہرگز جائز نہیں البتہ انسان اپنے کردار اور علم کے سبب تو لائق تعظیم و تکریم ہو سکتا ہے لیکن بحیثیت انسان تمام انسان برابر ہیں اور یہی گورونانک جی نے بھی انسانوں کو درس دیا۔ سچ تو یہ ہے کہ آپ کی ذات والا صفات جہل کی تاریکی کو ختم کرنے کا سبب تھی جیسا کہ متر نکودری نے کہا ہے۔

جہل کی تاریک محفل میں، شب ظلمات میں سر بہ سر اک نور پیکر تھی گورونانک کی ذات
مخزن مہر و وفا، مجموعۂ صدق و صفا عام انسانوں سے برتر تھی گورونانک کی ذات

(گورونانک)

گورونانک جی کی ذات والا صفات جب مجموعۂ صدق و صفا ہے تو ایسی ہستی پر سرزمین ہند کو ناز کیوں کر نہ ہو کہ اس نے اپنے قدم میمنت لزوم سے اس زمین کو وہ عزت بخشی کہ ہندوستان کی زمین قابل رشک بن گئی چنانچہ اندر جیت گاندھی گویا ہیں۔

اے گورو نانک، مسیحائے زماں فخر عالم، نازش ہندوستاں
ذات تیری مایۂ تقدیس تھی معتقد کیوں کر نہ ہو تیرا جہاں

(ذات نانک)

مندرجہ بالا اشعار میں شاعر نے گورونانک جی کی صفات و کمالات کا اظہار کرتے ہوئے یہ باور کرایا ہے کہ آپ نے اس زمین پر قدم رکھتے ہوئے اخوت و مساوات کا درس دیا اور اچھوتوں کو معاشرہ میں وہ عزت و وقار دلایا جس کے وہ مستحق تھے اور انھوں نے اس عمل خیر کے لیے دنیا کے گوشے گوشے کا سفر کیا ظہور احمد سہارنپوری کا کہنا ہے۔

وہ مکہ کا زائر بنارس کا راہی خدا کو خبر ہے کہ کیا بن کے آیا

(گورونانک جی مہاراج کی آمد)

انھوں نے سفر کے شدائد و مصائب مخلوق خدا کی بہتری کے لیے ہی برداشت کیے وہ خلق خدا کی بہبودی و فلاح کے لیے ہمہ وقت کوشاں رہے۔ جیسا کہ سوڈھی گوربچن سنگھ کوشاں کا کہنا ہے۔

انھیں بہبودی خلق خدا کا تھا خیال اتنا
مسافت میں رہے اور اس غم سے مضطر تھے گورونانک

سچ تو یہ ہے کہ خاطی انسان کے فہم و ادراک سے بلند تر ذات پروردگار ہے اور کائنات کے ذرے ذرے میں اس کی جو حکمتیں پوشیدہ ہیں ان حکمتوں سے خدا ہی کما حقہ واقف ہے۔ اس نے اس زمین پر اپنے منتخب بندوں کو اسی لیے بھیجا ہے کہ کائنات کے ذرے ذرے اور ہر قطرہ میں جو حکمتیں ہیں اس سے انسان کو متعارف کرائیں تا کہ خدا کی ذات کا عرفان ہو سکے اور اس طرح دنیا میں باطل سرنگوں ہو جائے اور حق کا بول بالا ہو پورن سنگھ ہنر امرتسری کے بقول۔

اجالا نور حق کا ہو گیا سارے زمانے میں کہ باطل کے لیے اک تیغ آتش بار نانک تھے

(گورونانک)

سرزمین ہند پر ایک وقت ایسا بھی تھا جب کہ جہالت کی گھٹا چھائی ہوئی تھی اور قیامت خیز عالم تھا ایسے ماحول میں گورونانک دیو جی ہندوستان میں آئے اور انھوں نے اپنی تعلیمات کے ذریعے سے لوگوں کے قلوب کو روشن و منور کیا جیسا کہ جگن ناتھ آزاد گویا ہیں۔

تو اک ابر کرم تھا جو زمان خشک سالی میں دیار ہند پر برسا محیط بیکراں ہو کر
زمین کشور پنجاب کی تقدیر کیا کہیے چمک اٹھا ہر اک ذرہ حریف کہکشاں ہو کر

(نانک)

گورونانک دیو جی نے خدائے واحد کی عبادت کی ترغیب دیتے ہوئے ہر قسم کے فتنہ و فساد سے گریز کرنے کا حکم دیا تا کہ یہ دنیا صلح و سلامتی اور امن و آشتی کا گہوارہ بن جائے جیسا کہ گوہر ہوشیار پوری لاہور کہتے ہیں۔

وعظ تیرا امن و صلح و آشتی اے حقیقت کیش، اے سچے گورو
لوگ تیری عظمتوں کے معترف عالم عالم، قریہ قریہ، کو بہ کو

سچ تو یہ ہے کہ انھوں نے اپنے قول و عمل سے انسانوں کو جو پیغام دیا وہ ایسا پیغام تھا جو دنیا کے ہر انسان کے لیے نفع بخش تھا۔ ان کی عظمت و منزلت کو دیکھ کر ہر انسان بقول ساحر ہوشیار پوری۔

ایسا انسان کہ فرشتے کا یقیں ہو جس پر
ایسا مرشد کہ جسے مرشد کامل مانیں
ایسا رہبر کہ جسے رہ بر اعظم کہیے

(فرشتہ)

گورونانک جی کے کردار، افعال و اعمال اور اقوال آج ہر انسان کے لیے توجہ کا مرکز ہیں۔ ان میں جس قدر خوبیاں اور اچھائیاں تھیں اس کا بیان کرنا شعرا، خطبا اور نثر نگاروں کے حیطۂ تحریر و تقریر سے باہر ہے۔ بلونت سنگھ فیض سرحدی کا یہ کہنا درست ہے۔

کس سے ممکن ہے ثناء تیری گورونانک جی چاند تاروں میں ضیا تیری گورونانک جی
نعرۂ حق تھی صدا تیری گورونانک جی کتنی جاذب تھی ادا تیری گورونانک جی
کوئی انسان ہو۔ لازم ہے عقیدت تیری سارے عالم کو مناسب ہے محبت تیری

گورونانک جی کی جاذب شخصیت اور کردار و اعمال کی بدولت ان کے وصال کے بعد ہر انسان ان کو اپنا کہہ رہا تھا یہی نہیں بلکہ ان کی آخری رسومات کے فریضے کو انجام دینے کے لیے باہم نزاع کرنے سے بھی گریز نہ تھا لیکن وہ تو کسی خاص مذہب و ملت کی رہنمائی کے لیے نہ آئے تھے بلکہ وہ دنیا کے تمام انسانوں کو صحیح اور سچا راستہ دکھانے کی غرض سے آئے تھے لہٰذا بقول وید پال کوشل انبالوی۔

تو نے تیرا۔ تیرا کہہ کر سب دیا غلہ لٹا اور جب پڑتال کی تو ایک دانہ کم نہ تھا
نعش پر تیری لڑے تھے مسلم و ہندو مگر کچھ نہ تھا زیر کفن گلہائے خنداں کے سوا

ان شعرا کے علاوہ علامہ منور لکھنوی، ابرار احسنی گنوری، ساحر ہوشیار پوری، امر سنگھ

منصور، صغیر احمد صوفی، صابر ابوہری، گور بچن سنگھ کوشاں، مسرور لکھنوی، آر، ایس، کوثر، ست پرکاش سالک، ہری چند گل، طالب شملوی، گیان چند منصور، عشرت لدھیانوی اختر رضوانی وغیرہ نے بھی گورو نانک جی کے حضور خراج عقیدت جس انداز سے پیش کیا ہے وہ ان کے جذبات وخیالات کی عکاسی ہی نہیں کرتے بلکہ اردو شاعری کے شائقین کے لیے نت نئے تلازمات اور فنی وفکری اسرار ورموز سے واقفیت بھی کراتے ہیں۔ یقیناً شعراء کے یہ اشعار گورو نانک جی کے حضور خراج عقیدت ہی نہیں بلکہ اردو زبان کے انمول خزینے بھی ہیں جن سے شعرا کو اردو شاعری کی فنی باریکیوں کو سمجھنے کا موقع بھی فراہم ہوتا ہے۔

نوائے حق کی کشش تھی ترے ترنم میں   یقیں کی شمع جلائی شب توہم میں

(ایضا)

درشن جی مہاراج نے گورو نانک جی کے عزم بالجزم کا گن گان گاتے ہوئے ان کی تعلیمات پر کچھ اس طرح روشنی ڈالی ہے۔

تری نگاہ زمان و مکاں سے بالا ہے   نہ جائے گا جو کبھی وہ ترا اجالا ہے
عظیم دل ترا وہ سرخوشی کا پیالہ ہے   جو نفرتوں کی جگہ پیار دینے والا ہے
حیات کے لیے مینار آگہی ہے تو   زمیں کے واسطے حکمت کی روشنی ہے تو

(ایضا)

اردو زبان میں ایک اور نظم سید اصغر بہرائچی کی ملتی ہے جس میں انھوں نے اس بات کا خیال رکھا ہے کہ گرو کی مدح وتوصیف اس انداز سے ہو کہ گورو نانک جی زندگی کی مکمل تصویر نظروں کے سامنے آجائے سید اصغر بہرائچی اپنی اس کوشش میں کامیاب و کامران نظر آتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ گورو نانک جیسی شخصیتیں اس زمین پر بار بار پیدا نہیں ہوتیں اور نہ ہی ایسی باعظمت شخصیات دنیا کے ہر خطہ کو نصیب ہوتی ہے یہ سرزمین پنجاب کی خوش قسمتی ہے کہ ایسی شخصیت نے اس زمین پر قدم رکھا اور اس عظیم اوتار نے زندگی کی حقیقت سے واقف کرایا ان کا کہنا ہے۔

ہزاروں میں کوئی ہوتا ہے اک انسان وہ دانا   کہ جس نے زندگی کا راز ہو، دراصل پہچانا

(رہنمائے تعلیم، دہلی، اپریل 2001، صفحہ 9)

سید اصغر بہرائچی سوانحی نظم 'گرونانک' میں یوں گویا ہیں۔

تلونڈی میں سحر کو جب گرونانک ہوئے پیدا   تو کالو چند کے گھر میں اجالا نور کا پھیلا
جہاں کی بے ثباتی پر ہنسے جب آپ اک دم سے   ترپتا ماں وداعی دوستاں قرباں ہوئیں جھم سے
حصول علم میں نکلے، تو طے منزل پہ کی منزل   نہ چھوڑی بزم کوئی اور نہ چھوڑی کوئی بھی محفل

اصغر بہرائچی نے گرونانک جی کی جائے پیدائش تلونڈی کے ذکر کے ساتھ ساتھ ان کے باپ کالو مہتا جی اور ان کی ماں ترپتا کی بے انتہا محبت کو خوبصورت انداز میں نظم کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ گرونانک جی کو دنیا والوں نے ان کے خلق واخلاق، تعلیمات اور خدا کی وحدانیت کے تصور سے آشنا کرانے کے ذریعے پہچانا۔

خدا کی ذات با برکات کو واحد جو پہچانا   اسی تحقیق پر دنیا نے ہے ان کو گرو مانا
زمانہ پانچ سو سالوں کا گذرا ہے مگر پھر بھی   گرونانک کی تعلیمات زندہ ہے خدا گا

گرونانک جی نے پیغام دیا کہ نہ کوئی ہندو ہے نہ مسلمان بلکہ سب انسان ہیں اور مذہب آپس میں مل جل کر رہنے کا حکم دیتا ہے وہ انسانوں کے درمیان تفرقہ اور اختلاف کا حکم نہیں دیتا بقول علامہ اقبال۔

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا

دراصل خدا تو ایک ہے البتہ اس کے نام مختلف ہیں جسے قوموں نے الگ الگ ناموں سے اپنا لیا ہے بقول گرونانک جی۔

انیکوں نام حق ہیں مگر واحد ہے وہ داتا   اسے اپنا لیا قوموں نے جس جس نام سے چاہا

کوئی مذہب سکھائے بیر یہ ممکن نہیں ہمدم   دلیلیں لاکھ کوئی دے نہیں مانیں گے ہرگز ہم
کرو تعظیم ہر مذہب کی ہے پیغام نانک کا   یہی آدرش نانک کا صلائے عام نانک کا

مذہب اخوت بھائی چارے اور رواداری کا حکم دیتا ہے اور تمام مذاہب کے رہنما انسانوں کی فلاح و بہبود کے خواہاں ہیں ان کے یہاں کالے گورے ادنی واعلی کا کوئی امتیاز نہیں بلکہ انسانی قدروں کی محافظت اور ترقی و بہبود ہی بنیادی مقصد ہے۔ جیسا کہ سید اصغر بہرائچی کا کہنا ہے۔

جو ہادی ہیں ترس انساں پہ کھانا ان کا منصب ہے   مئے عرفان پینا اور پلانا ان کا مشرب ہے
نگاہ معرفت میں چھوٹی شے بھی ہے نہیں چھوٹی   وہ چاہے حلوہ تر ہو وہ چاہے خشک ہو روٹی
وہ دلدادہ ہیں کس درجہ غریبوں کی بھی دعوت کے   ملک بھاگو سے پوچھو، چاہے پوچھو بھائی لالو سے
فدا مردانہ ان پہ ہے تو قرباں بھی بالا ہے   کہ رتبہ ان کی خدمت سے بڑا دونوں کا اعلی ہے

اصغر بہرائچی نے گرونانک کی انسانوں کے تئیں محبت والفت کو پیش کرتے ہوئے ان کے بلند اخلاق و کردار کا بھی گن گان کیا ہے۔ شاعر نے اس نظم میں گرونانک کی زندگی کی نیکی، ایثار اور بصیرت کو اشعار کی شکل میں جس طرح نظم کیا ہے وہ قابل داد ہے۔ گرونانک نے اپنے عہد میں انسان دوستی اور معنویت سے بھرپور زندگی کا جو تصور پیش کیا اس کے پیش نظر آج بھی ننکانہ صاحب زیارت کا مرکز بنا ہوا ہے۔ بقول سید اصغر بہرائچی۔

وہاں جاتا ہے اصغر ہر گرونانک کا دیوانہ   مرقع نور کا گلزار ہے جس جا پہ ننکانہ

گرونانک کی محبت میں انسان اس لیے دیوانہ ہے کیونکہ وہ نیکی اور انسانی ہمدردی کا مجسمہ تھے۔ وہ ذات پات اور ظاہری رسوم وعبادات کے مخالف تھے انھوں نے سماج میں پھیلی ہوئی بیماریوں کو ختم کرنے کی کوشش کی اور ذات واحد کی مدح وتوصیف کا نغمہ گایا اور لوگوں کو اس کی اور صرف اس کی عبادت کی طرف گامزن رہنے کا درس دیا۔ انھوں نے جس محبت، مساوات اور خدمت خلق کی تعلیم دی اگر آج انسان صحیح طریقے سے ان کے بتائے ہوئے اصول پر عمل کرنے لگے تو یہ دنیا امن وامان کا گہوارہ بن جائیگی چنانچہ ودیا ساگر آنند نے اپنی نظم 'گورونانک' (دیو جی کی بانی) میں اس سچائی کا یوں اعتراف کیا ہے۔

تمھاری بانی کا چرچا جو عام ہو جائے   تو اس کے سنتے ہی راون بھی رام ہو جائے
تیرے گرنتھ کا آنند جہاں بسیرا ہے   اکال پرکھ کا واں سب کے دل میں ڈیرا ہے

ڈاکٹر بانو سرتاج نے گرونانک دیو جی کی ایک مشہور راگ دھنا سری میں درج کائنات میں ہو رہی آرتی پد (نظم) کو کچھ یوں نظم کیا ہے۔

فلک تھال ہے چاند سورج دیے ہیں   ستاروں کے جھرمٹ یہ موتیوں سے ہیں
جو ہے دھوپ خوشبوئے کہسار بھی ہے   تو جھونکے ہوا کے چنور کر رہے ہیں
نباتات میں پھول بے غم سماں ہیں   تیری آرتی میں یہ سب خود لگے ہیں

(قومی یک جہتی اور اردو شاعری، بانو سرتاج، اردو شاعری اور گرونانک، صفحہ 65)

بانو سرتاج کی اس نظم میں اردو پنجابی الفاظ کی آمیزش انتہائی پرکشش ہے۔ مختصر یہ کہ گورونانک دیو جی کی روحانی شخصیت کو اردو شعراء نے پیش کر کے اردو شاعری کی روشنی میں اضافہ کرتے ہوئے گورونانک دیو جی کے عقیدت مندوں کے لیے اردو زبان میں ان کو یاد کرنے کی ایک نئی لطافت سے بھی آشنا کرایا ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو شاید غلط نہ ہوگا کہ اردو زبان میں گرونانک جی سے متعلق یہ نظمیں اردو ادب کا اہم سرمایہ ہی نہیں بلکہ اردو زبان کے اصل ہدف ومقصد کا گواہ بھی ہے۔

■

Dr. Raihan Hasan
Dept of Urdu, Farsi, Guru Nanak Dev University
Amritsar - 143005 (Punjab)
Mob.: 8559020015

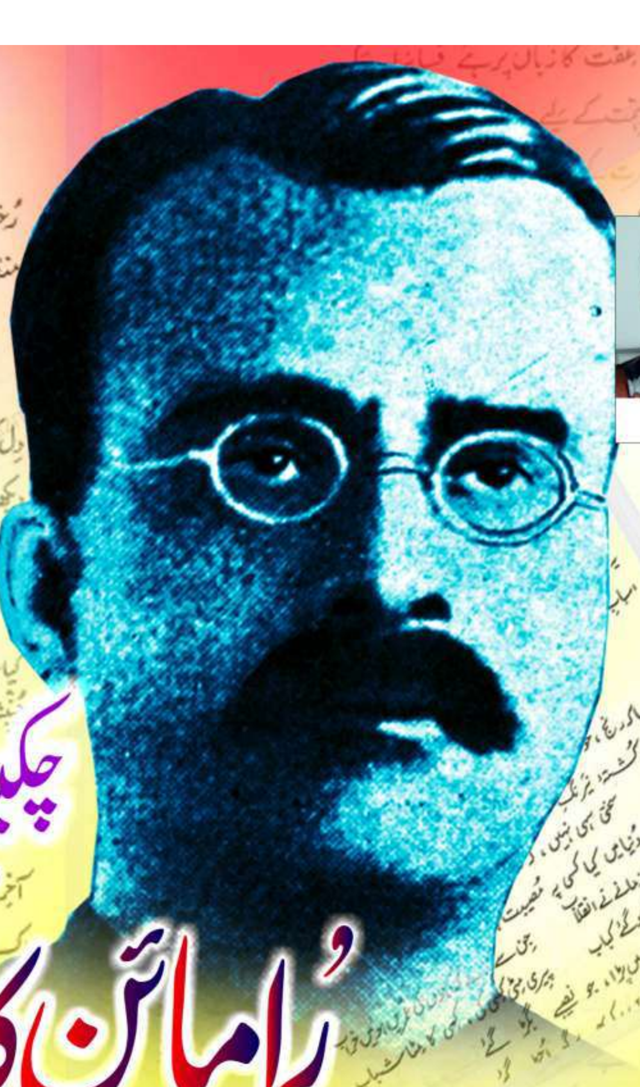

سنجے کمار

چکبست کی شاہکار نظم
رُامائن کا ایک سین

زمانۂ قدیم سے رامائن کی کہانی ہندی و سنسکرت زبان وادب کے علاوہ دیگر زبان وادب میں بھی مقبول رہی ہے۔اور اس کی مقبولیت کا ایک اہم راز اس میں موجود کرداروں کا اخلاقی اور مذہبی برتاؤ رہا ہے۔اس کے سبھی کردار بنی نوع انساں کے لیے مثالی (Ideal) رہے ہیں۔ یہ حسنِ اخلاق اور فرض ادائیگی میں اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتے۔ چاہے بھگت ہنومان کا کردار بھگتی اور خدمت شعاری کے لیے ہو یا چھوٹے بھائی لچھمن کی فرماں برداری بڑے بھائی رام کے لیے ہو۔ جب راج گدی کی بات آتی ہے تو بھرت کہتے ہیں کہ مجھے راج پاٹ نہیں چاہیے، اس پر بڑے بھیا رام کا حق ہے، تو رام کہتے ہیں کہ نہیں ماتا کیکئی نے آپ کے لیے راج مانگا ہے، اس لیے اس پر صرف آپ کا ہی حق ہے۔ اسی طرح سیتا کا کردار ہے۔ راون کے لاکھ بہلانے دھمکانے پر بھی وہ اپنی شوہر پرستی یعنی پتی ورتا کا دھرم نہیں چھوڑتیں۔ ٹھیک اسی طرح رام ہیں۔ وہ اپنی سوتیلی ماں کے کہنے پر بلاتردد راج پاٹ چھوڑ کر چودہ برس کے لیے بن باس چلے جاتے ہیں اور باپ کی فرماں برداری اور ماں کیکئی کے باپ سے کیے گئے وعدے کو پورا کرتے ہیں۔

رامائن کا ایک سین چکبست کی شاہکار نظم ہے۔اس کی تخلیق میں چکبست نے بالمیکی اور ادھیاتم رامائن سے استفادہ کیا ہے۔اس نظم کے لیے چکبست نے رامائن کے اس سین کا انتخاب کیا ہے جہاں رام راج پاٹ چھوڑ کر جوگی کا بھیس اختیار کر کے چودہ برس کے لیے بن باس جانے کی تیاری کرتے ہیں۔ بالمیکی رامائن میں سین اس طرح ہے کہ رام کو راجا دسرتھ اپنے محل میں بلاتے ہیں، جہاں وہ کیکئی کے پاس بیٹھے رہتے ہیں۔ وہیں کیکئی رام کو بتاتی ہے کہ تمھیں چودہ برس کا بن باس اور بھرت کے لیے اجودھیا کی راج گدی کا بر میں نے مہاراج سے مانگا ہے جس کا وعدہ انھوں نے مجھ سے کیا تھا۔ اس لیے اب تم جلدی سے بن باس جانے کی تیاری کرو۔ رام کے بن باس جانے کی بات کیکئی کے منہ سے سنتے ہی راجا دسرتھ غش کھا کر وہیں گر پڑتے ہیں۔ تب رام انھیں اٹھا کر بیٹھا دیتے ہیں اور اس کے بعد بن باس جانے کی تیاری کرنے لگتے ہیں۔ بالمیکی رامائن اجودھیا کانڈ کے انیسویں سبق کے شلوک نمبر 34,35 کے مطابق:

’’سری رام نے اپنے اوپر خوبصورت چتر لگانے کی مناہی کر دی۔ ڈلائے جانے والے مزین چنور بھی روک دیے۔ وہ رتھ لوٹا کر کنبے کے لوگوں اور نگر باسیوں کو بھی وداع کر کے دکھ کو دل میں ہی دبا کر انفاس کو قابو میں کر کے یہ دکھ سے بھری خبر سنانے کے لیے ماں کوشلیا کے محل میں گئے۔ اس وقت انھوں نے دل کو پوری طرح قابو میں کر رکھا تھا‘‘

یہیں سے چکبست کی رامائن کا آغاز ہوتا ہے:

رخصت ہوا وہ باپ سے لے کر خدا کا نام
راہِ وفا کی منزل اول ہوئی تمام
منظور تھا جو ماں کی زیارت کا انتظام
دامن سے اشک پوچھ کے دل سے کیا کلام
اظہار بے کسی سے ستم ہوگا اور بھی
دیکھا ہمیں اداس تو غم ہوگا اور بھی
دل کو سنبھالتا ہوا آخر وہ نو نہال
خاموش ماں کے پاس گیا صورتِ خیال
دیکھا تو ایک در میں ہے بیٹھی وہ خستہ حال
سکتا سا ہو گیا ہے یہ ہے شدتِ ملال

تن میں لہو کا نام نہیں زرد رنگ ہے
گویا بشر نہیں کوئی تصویرِ سنگ ہے

اس کے بعد رام ماں سے وداع ہونے کے لیے ان کے پاس جاتے ہیں۔ تب دونوں کے درمیان غم انگیز باتیں ہوتی ہیں۔ بالمیکی رامائن کے مطابق ماں کوشلیا رام سے کہتی ہیں۔

''بیٹا رگھونندن! اگر تمھارا جنم نہ ہوا ہوتا تو مجھے اس ایک ہی بات کا دکھ رہتا۔ آج جو مجھ پر اتنا بھاری دکھ آپڑا ہے، اسے بانجھ ہونے پر مجھے نہیں دیکھنا پڑتا۔''

''بیٹا! بانجھ کو ایک ذہنی تکلیف ہوتی ہے۔ اس کے دل میں دکھ بنا رہتا ہے کہ مجھے کوئی اولاد نہیں ہے۔ اس کے سوا دوسرا کوئی دکھ اسے نہیں ہوتا۔''

انھیں باتوں کو چکبست اس طرح بیان کرتے ہیں:

ایسے بھی نامراد بہت آئیں گے نظر
گھر جن کے بے چراغ رہے آہ عمر بھر
رہتا مرا بھی نخل تمنا جو بے ثمر
یہ جائے صبر تھی کہ دعا میں نہیں اثر
لیکن یہاں تو بن کے مقدر بگڑ گیا
پھل پھول لا کے باغِ تمنا اجڑ گیا

اس کے علاوہ اور کئی بندوں میں چکبست نے بالمیکی رامائن سے فیض اٹھایا ہے۔ جن کا حوالہ میں یہاں نہیں دے رہا ہوں۔

رامائن کے ایک سین کی تخلیق کے لیے ایسا لگتا ہے کہ چکبست نے میر انیس کے ایک مرثیہ سے بھی استفادہ کیا ہے جس کا اثر ان کی اس نظم پر صاف دکھائی دیتا ہے۔ جس طرح میر انیس کے مرثیہ میں انسانی رشتے کی پاسداری، جذبات نگاری اور رنج و غم کے اظہار کا کمال نظر آتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح چکبست کی رامائن کے ایک سین میں بھی دکھائی دیتا ہے۔ میر انیس کا مرثیہ ''جاتی ہے کس شکوہ سے رن میں خدا کی فوج'' حضرت عون و محمد پر لکھا گیا ہے۔ اس مرثیہ میں جس طرح عون و محمد جنگ میں جانے سے پہلے اپنی ماں حضرت زینب سے وداع ہوتے ہیں، اسی طرح چکبست کی نظم میں بھی رام اور لچھمن بن باس جانے سے پہلے اپنی ماں کوشلیا سے رخصت ہوتے ہیں۔ ایک جگہ ماں سے بیٹوں کی ہمیشہ کی جدائی ہے تو دوسری جگہ چودہ برس کا طویل عرصہ ہے۔ اور ہم جانتے ہیں کہ جدائی کی مصیبتیں موت کی مصیبتوں سے کم نہیں ہوتی ہیں۔ دونوں جگہ ماں سے ان کے بیٹے جدا ہو رہے ہیں۔ ایسی حالت میں ان ماؤں کے دل پر کیا گزرتی ہوگی، اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ لیکن میر انیس اور چکبست نے ان حالات کی تصویر کشی بہت فنکارانہ انداز میں کی ہے جس

رامائن کا یہ حصہ جہاں رام کو شلیا سے بن باس جانے کی اجازت لینے جاتے ہیں، بہت اہم حصہ ہے۔ چکبست نے اپنے شاعرانہ کمال کے ذریعہ اسے یادگار بنا دیا ہے۔ یہاں چکبست نے رامائن سے صرف ماں اور بیٹے کے درمیان کے مکالمات کا انتخاب کیا ہے۔ حالانکہ وہ سین بھی اس سے کم اہم نہیں ہے جہاں راجا دسرتھ کا انتقال ہو جاتا ہے۔ رام کے بن باس جانے سے ماں تو کسی طرح اپنا دکھ کاٹتی ہے لیکن راجا دسرتھ بیٹے کی جدائی برداشت نہیں کر پاتے۔ دن رات تڑپتے رہتے ہیں اور آہ و زاری کرتے رہتے ہیں۔ غش کھا کھا کر گرتے ہیں، سنبھلتے ہیں اور آخر میں بن باس کے پانچ دن بعد ہی انتقال کر جاتے ہیں۔

کے چند نمونے پیش کرتا ہوں۔ میر انیس کے متذکرہ بالا مرثیہ میں حضرت زینب اپنے بیٹوں عون و محمد سے کہتی ہیں:

ماں پر یہ آفتیں ہیں یہ ماموں پہ ظلم و جور
پیارو ہمارے حال پہ لازم ہے تم کو غور
نازک مزاجیوں کے کسی دن نہ تھے یہ طور
اب مشورے ہیں اور تصور ہیں اور اور
وہ دل نہیں وہ آنکھ نہیں وہ نظر نہیں
اوروں کا ذکر کیا تمھیں میری خبر نہیں
اس کا نہیں خیال کہ کیونکر جیے گی ماں
ہوتا ہے آفتوں میں محبت کا امتحاں
تم میری دس برس کی ریاضت ہو میری جاں
مجھ سے سوا ہے کون تمھارا مزاج داں
جس پر یہ برہمی ہے وہ سب جانتی ہوں میں
غصے کی آنکھ کاہے کو پہچانتی ہوں میں

ان بندوں کو نظر میں رکھتے ہوئے رامائن کا ایک سین دیکھیے:

پھر یہ کہا کہ میں نے سنی سب یہ داستان
لاکھوں برس کی عمر ہو دیتے ہو ماں کو گیان
لیکن جو میرے دل کو ہے در پیش امتحان
بچے ہو اس کا علم نہیں تم کو بے گمان
اس درد کا شریک تمھارا جگر نہیں
کچھ مامتا کی آنچ کی تم کو خبر نہیں
کن کن ریاضتوں سے گزارے ہیں ماہ و سال
دیکھی تمھاری شکل جب اے میرے نونہال
پورا ہوا جو بیاہ کا ارمان تھا کمال
آفت یہ آئی مجھ پہ ہوئے جب سفید بال
چھٹتی ہوں ان سے جوگ لیا جن کے واسطے
کیا سب کیا تھا میں نے اسی دن کے واسطے

دونوں نظموں سے اس طرح کی یکسانیت کی ایک اور مثال لکھتا ہوں جس میں قدم بوسی کی ہندوستانی تہذیب کو بھی دکھایا گیا ہے۔ دونوں جگہ بیٹے کی باتیں سن کر ماں انھیں سخت نصیحتیں کرتی ہیں تو بیٹوں کا دل بھر آتا ہے۔ میر انیس کا بند:

کنبے میں ایک نے بھی اگر سن لیا یہ حال
کہتی ہوں صاف میں مجھے ہوگا بہت ملال
ننھے سے ہاتھ جوڑ کے بولے وہ نونہال
ہم باوفا غلام ہیں کیا تاب کیا مجال
دیجے سزا ہمیں جو بل ابرو پہ پھر پڑیں
کہیے تو چھوٹے ماموں کے قدموں پہ گر پڑیں

چکبست کا بند:

نشتر تھے رام کے لیے یہ حرفِ آرزو
دل ہل گیا سرکنے لگا جسم سے لہو
سمجھے جو ماں کے دین کو ایمان و آبرو
سننی پڑے اسے یہ خجالت کی گفتگو
کچھ بھی جواب بن نہ پڑا فکر و غور سے
قدموں پہ ماں کے گر پڑا آنسو کے طور سے

ان مآخذ سے قطع نظر چکبست نے رامائن کا ایک سین میں رام اور کوشلیا کے درمیان جو فلسفیانہ اور جذباتی مکالمات ادا کروائے ہیں وہ سب ان کے اپنے تخیل کے کمالات ہیں، جو نہ میر انیس کے مرثیے میں ملتے ہیں نہ بالمیکی رامائن میں، اور جیسا کہ شاعری کے لیے کہا جاتا ہے کہ یہ انسانی خیالات و جذبات کی نقل ہوتی ہے، اس نقل کا پورا حق چکبست نے اپنے تخیلات اور زندگی کے مشاہدات کی بنا پر ادا کر دیا ہے۔

رامائن کا یہ حصہ جہاں رام کوشلیا سے بن باس جانے کی اجازت لینے جاتے ہیں، بہت اہم حصہ ہے۔ چکبست نے اپنے شاعرانہ کمال کے ذریعہ اسے یادگار بنا دیا ہے۔ یہاں چکبست نے رامائن سے صرف ماں اور بیٹے کے درمیان کے مکالمات کا انتخاب کیا ہے۔ حالانکہ وہ سین بھی اس سے کم اہم نہیں ہے جہاں راجا دسرتھ کا انتقال ہو جاتا ہے۔ رام کے بن باس جانے سے ماں تو کسی طرح اپنا دکھ کاٹتی ہے لیکن راجا دسرتھ بیٹے کی جدائی برداشت نہیں کر پاتے۔ دن رات تڑپتے رہتے ہیں اور آہ وزاری کرتے رہتے ہیں۔ غش کھا کھا کر گرتے ہیں، سنبھلتے ہیں اور آخر میں بن باس کے پانچ دن بعد ہی انتقال کر

جاتے ہیں۔ راجا دسرتھ کی جدائی اور انتقال کا یہ سین اسی میں شامل ہے۔ اس سین کی ایک جھلک بالمیکی رامائن کے شلوک نمبر 27 سے 35 تک دکھاتا ہوں۔ رام کے بن باس چلے جانے کے بعد راجا دسرتھ روتے ہوئے کہتے ہیں:

''مجھے جلدی ہی سری رام ماتا کوشلیا کے گھر میں پہنچا دو، کیونکہ میرے دل کو کہیں سکون نہیں مل سکتا''

''ایسی بات کہتے ہوئے راجا دسرتھ کو دوار پالوں نے بڑی ہمدردی کے ساتھ رانی کوشلیا کے محل میں پہنچایا اور پلنگ پر سلا دیا''

''وہاں کوشلیا کے محل میں داخل ہوکر پلنگ پر لیٹ جانے پر بھی راجا دسرتھ کا دل بے قرار اور دکھی ہی رہا''

''دونوں بیٹے اور بہو سیتا سے خالی وہ محل راجا کو چاند سے خالی آسمان کی طرح بے رونق دکھائی دینے لگا''

''اسے دیکھ کر مہابلی مہاراج دسرتھ نے ایک بانہہ اوپر اٹھا کر زور زور سے روتے ہوئے کہا: ''ہے رام! تم ہم دونوں ماں باپ کو چھوڑ رہے ہو۔ جو لوگ چودہ برس تک زندہ رہیں گے اور اجودھیا میں دوبارہ لوٹے سری رام کو سینے سے لگا کر دیکھیں گے وہی حقیقت میں سکھی ہوں گے''

''اس کے بعد اپنی سیاہ رات کی طرح وہ رات آنے پر راجا دسرتھ نے آدھی رات ہونے پر کوشلیا سے اس طرح کہا:''

''کوشلیے! میری بینائی سری رام کے ہی ساتھ چلی گئی اور اب تک نہیں لوٹی، اس لیے میں تمھیں دیکھ نہیں پاتا ہوں۔ ایک بار اپنے ہاتھ سے میرے جسم کو چھوکر تو دیکھو''

''بستر پر پڑے ہوئے مہاراج دسرتھ کو سری رام کو ہی یاد کرتے اور گہری سانس کھینچتے دیکھ دیوی کوشلیا بہت دکھی ہوکر ان کے پاس آ بیٹھیں اور مصیبت کی ماری زور زور سے رونے لگیں۔''

چکبست رامائن کے ایک سین میں چند مزید سین لکھ کر اسے مکمل کرنا چاہتے تھے۔ لیکن وکالت کے پیشے اور دیگر مصروفیات کے سبب اس کام کے لیے انھیں فرصت بہت کم ملتی تھی۔ اس کے متعلق کشن پرشاد کول اپنے ایک مضمون 'چکبست لکھنوی' میں لکھتے ہیں:

'چکبست کی نظم 'رامائن کا ایک سین' جب شائع ہوئی، تو بہت مقبول و مشہور ہوئی، ان کے احباب کا تقاضا تھا کہ اس سلسلے کی اور کڑیوں کو جوڑ کر وہ اسے مکمل کر دیں۔ وہ ہاں ہاں تو کہتے رہے، لیکن پیشہ کی روز افزوں مصروفیتوں نے کام پورا نہ ہونے دیا۔ 11 فروری 1926 کا ذکر ہے کہ وہ کچہری سے واپسی میں میرے یہاں آئے۔ چائے کا شغل ہو رہا تھا کہ مجھے کچھ دھیان آیا تو

میں نے پوچھا کہ وہ رامائن کب مکمل ہوگی؟ کہنے لگے کہ چاہتا تو بہت ہوں پر وقت کم ملتا ہے کچھ تو کہہ لیا ہے کچھ باقی ہے۔ مگر جو کچھ کہا ہے وہ پرچوں اور پرزوں پر لکھا ہوا ہے، سوچ رہا ہوں کہ اگر کوئی شخص مل جائے تو اسے ترتیب دے کر صاف کرا لوں یہ کہہ کر بولے کہ اچھا سنو اس کے تین سین تمھیں سناتا ہوں اور اپنے خاص انداز میں انھوں نے وہ تینوں سین زبانی سنائے۔ پہلا سین رام چندر جی کے بن باس ہونے پر جو اجودھیا کی حالت ہوئی اس کی نسبت تھا، دوسرے سین میں راون کی Soliloquy یعنی لڑائی سے قبل جو جذبات و خیالات اس کے دل و دماغ میں موجزن ہو رہے تھے، اس کا عکس اتارا تھا۔ تیسرا سین خود لڑائی کے متعلق تھا، یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ تینوں سین رامائن کے اس سین سے جو شائع ہو چکا ہے، کسی حالت میں کمتر نہ تھے، چکبست کی شاعری کے تمام جوہر ان نظموں میں جھلکتے تھے۔ میرے یہاں سے اٹھ کر ہم ان کے گھر پہنچے 7 بجے شام تک بات چیت اور مذاق ہوتا رہا، رخصت ہونے پر کہنے لگے، کل تو رائے بریلی جانا ہے، ملنا ہوگا نہیں، اب پرسوں شام کو ملاقات ہوگی۔ موت سر پر کھڑی خندہ زن تھی کہ یہ ملاقات اب پرسوں شام کو نہیں قیامت کے دن ہوگی۔ دل کی حسرتیں دل ہی میں رہ گئیں اور رامائن کی بقیہ نظموں کے مسودے کے پرچے اور پرزے، باوجود سخت تلاش کے کہیں دستیاب نہ ہوئے۔'

لیکن ڈاکٹر افضال احمد نے اپنی کتاب چکبست حیات اور ادبی خدمات میں غیر مطبوعہ کلام کے تحت بعد کے تین بند درج کیے ہیں جو انھیں تحقیق کے دوران دستیاب ہوئے تھے۔ اس کا پہلا بند رام کے بن باس ہونے کے بعد اجودھیا نگری کی حالت کو بیان کرتا ہے، دوسرا بند رام کی زیارت کے لیے لوگوں کے شوق کو دکھاتا ہے اور تیسرا بند سیتا کی تصویر کشی کرتا ہے۔ تینوں بند پیش کرتا ہوں:

ہے آج راگ رنگ کے بدلے نیا سماں
گھڑیال کی صدا ہے نہ ہے وید کا بیاں
بازار میں نہ پھل ہے نہ پھولوں کی ڈالیاں
دریا پہ گل فروش نے کھولی نہیں دوکاں
لب پر برہمنوں کے دعائے سحر نہیں
پٹ مندروں کے بند پڑے ہیں خبر نہیں

یوں مجمع کثیر میں جنبش ہوئی عیاں
جیسے ہوا سے ہلتی ہیں جنگل کی پتیاں
اللہ رے انتظار کا وہ آخری سماں
کھنچ آئی تن سے کان کے پردے کے پاس جاں
سر اٹھ گئے تڑپ کے نظر سوئے در گئی
سینے میں سانس آنکھ میں پتلی ٹھہر گئی

ہلچل میں اس سفر کے ہے سیتا پہ یہ گماں
گویا کنول کا پھول ہے لہروں کے درمیاں
معصوم دل ہے رنج اٹھانے سے شادماں
تن پر ذرا لباس فقیری نہیں گراں
نیچی نگاہ آنکھ زمیں سے لڑی ہوئی
سر میں فقط سہاگ کی لالی پڑی ہوئی

اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر چکبست پوری رامائن اردو میں منظوم کر دیتے تو وہ اردو ادب کا بیش قیمتی سرمایہ ہوتا اور وہ بالمیکی رامائن اور تلسی داس کی رامائن سے کم پایہ کی نہ ہوتی لیکن موت نے انھیں اس کی مہلت نہ دی۔

■

Dr. Sanjay Kumar
Asst. Prof. Dept. of Urdu
University of Allahabad
Allahabad - 211002 (UP)

شاذیہ تمکین

سندی تحقیق کے ارکانِ ثلاثہ...!!!

تحقیق ایک ایسا عمل ہے جس کے ذریعہ صحیح اور غلط میں تمیز اور نامعلوم سے معلوم تک رسائی حاصل کی جاتی ہے۔جس شے کی حقیقت یا اس کے وجود سے انسانی شعور نابلد ہے، اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ موجود تو ہے مگر انسانی پہنچ کے دائرے سے بالاتر ہے۔مگر تحقیق کا ایک سرا جب اس کے وجود تک رسائی حاصل کر لیتا ہے تو نامعلوم کے بحرِ ظلمات سے نکل کر معلوم کے بحرِ بے کراں میں اس کا وجود ایک شناخت قائم کر لیتا ہے۔انسان کی محققانہ فطرت کا یہی وہ طریقۂ عمل ہے جس نے انسان کی رہائش گاہ کو دشت و بیاباں سے تہذیب یافتہ سماج میں منتقل کیا۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کا کہنا ہے کہ تحقیق زندگی کی ہر سطح پر ایک زندہ معاشرے کی بنیادی ضرورت ہے۔

(ادبی تحقیق: ڈاکٹر جمیل جالبی، ص 11)

عصر حاضر میں ہم ارتقا پذیر معاشرے کو مردہ تو نہیں کہہ سکتے، گر معاشرہ زندہ ہے تو اس کے بین السطور میں تحقیق کی منظم کارفرمائی موجود ہے۔تحقیق ہر فرد کو غور و فکر کی طرف مائل کرتی ہے۔کیوں کہ انسانی فطرت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ وہ ہمیشہ کم ہو یا زیادہ، اپنی مقدار بھر غور و فکر میں مبتلا رہے۔یہی وہ تجسّس کا مادّہ ہے جس نے انسان اور جانور میں فرق کو ظاہر کر کے، انسان کو دیگر جانداروں سے ممتاز کیا اور اشرفیت بخشی۔

یہاں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انسانی ارتقا کا دارومدار تحقیق پر مبنی ہے۔تحقیق جیسا کہ سب جانتے ہیں نامعلوم حقائق کی تلاش و دریافت کرنا یا معلوم شدہ حقائق کی تجدید کرنا، اُسے نئے انداز سے پیش کرنا اور کسی نئے پہلو کا انکشاف کرنا تحقیق کہلاتا ہے۔مولانا کلب عابد، پروفیسر شعبۂ دینیات، مسلم یونیورسٹی، نے اپنی کتاب 'عمادالتحقیق' میں 'تحقیق' لفظ کی تشریح اس طرح کی ہے۔

''تحقیق عربی زبان سے اسم مشتق ہے۔یہ باب تفعیل سے مصدر ہے۔اس کے اصلی حروف ح، ق، ق ہیں۔اس کا مطلب ہے حق کو ثابت کرنا یا حق کی طرف پھرنا۔'' (تحقیق کا فن، ڈاکٹر گیان چند جین، ص9)

یوسف سرمست اپنے ایک مضمون 'ادبی تحقیق کا طریقۂ کار' میں لکھ رہے ہیں کہ:

''فارسی میں تحقیق کے لیے 'پژوہش' کا لفظ بھی استعمال ہوتا ہے جس کے معنیٰ کھوج کرنے اور تلاش کرنے کے ہیں۔جستجو کا لفظ بھی فارسی میں تحقیق کے لیے استعمال ہوتا ہے۔'' (ادبی تحقیق کا طریقۂ کار، یوسف سرمست، ص45)

ہندی میں اس لفظ کے لیے 'انوسندھان' استعمال کیا جاتا ہے۔جس کے معنی کسی مقررہ نشانے کو حاصل کرنے کے لیے اس کا تعاقب کرنا۔انگریزی میں تحقیق کے لیے ''Research'' لفظ مستعمل ہے جو مڈل فرنچ (Middle french) ''Recherche'' سے ماخوذ ہے جس کا مطلب ''To go about seeking'' ہے۔ ''Recherche'' قدیم فرنچ لفظ ''Recercher'' سے اخذ کیا گیا ہے جو دو لفظ ''Re+cerchier/sercher'' کا مرکّب ہے۔اور جس کا مطلب ''Search'' یعنی تلاش کرنا ہے۔

مجموعی طور پر تحقیق کا مطلب صرف حقائق کی دریافت نہیں ہے، بلکہ اس کا از سرِ نو جائزہ لے کر نئے نتائج تک پہنچنا ہے۔کسی مسئلے کا تجزیہ کر کے اس کے حل تک پہنچنے کی کوشش کرنا ہے۔کسی شے کی حقیقت کا پتہ لگانا ہے۔حقائق کی بازیافت پوری صداقت کے ساتھ کرنا اور اس کے نتیجے کو مدلل طریقے سے پیش کرنا ہے۔چونکہ تحقیق کا مادہ انسان میں فطری طور پر پایا جاتا ہے اس لیے زندگی کے ہر شعبے میں تحقیقی عمل کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔اس مضمون کا تعلق علمی تحقیق خصوصاً سندی تحقیق سے ہے اس لیے دیگر شعبہ جات سے تحقیق کی اہمیت سے قطع نظر کر کے علمی تحقیق کی طرف رجوع کرتے ہیں۔معروف محقق محمد جمال الدین قاسمی نے علمی تحقیق کے اغراض و مقاصد کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

''علمی تحقیق کے مقاصد کسی معدوم شے کو ایجاد کرنا، کسی متفرق کو یکجا کرنا، ناقص کو مکمل کرنا مجمل کو تفصیل سے بیان کرنا، مطول کی کانٹ چھانٹ کرنا، کسی بے ترتیب چیز کو مرتب کرنا، مبہم کی تعین کرنا اور غلطی کو آشکار کرنا قرار دیے گئے ہیں۔''

(تحقیق و تدوین کا طریقۂ کار، پروفیسر ڈاکٹر خالق داد ملک، ص24)

سندی تحقیق کو اگر ہم Diagram کی صورت میں پیش کریں تو وہ ایک مثلث کی شکل اختیار کرے گا۔محقق، نگراں اور موضوع ارکانِ ثلاثہ ہوں گے۔ان تین ارکان کی شمولیت سے ہی تحقیقی کام پایہ تکمیل کو پہنچے گا۔اس

درمیان تحقیق مختلف مراحل سے گزرتی ہے۔مثلاً مواد کی فراہمی، وسیع مطالعہ، خاکہ تیار کرنا، مقالے کی تسوید وغیرہ مگر محقق، نگراں اور موضوع تحقیق میں بنیادی رول ادا کرتے ہیں۔محقق تحقیق کا مرکز ہوتا ہے۔موضوعات اور مسائل تو لاتعداد ہیں مگر بغیر محقق کے ان کا وجود صفر ہی ہے۔ چونکہ انسان بنیادی طور پر ترقی پسند واقع ہوا ہے۔ ہمیشہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں منہمک رہتا ہے۔ اس لیے نئے نئے مسائل اس کے دماغ میں پیدا ہوتے رہتے ہیں یا پُرانے مسائل سے متعلق نئے نئے پہلو اور شکوک اُجاگر ہوتے ہیں۔وہ ان مسائل کے حل کرنے اور شکوک کو دور کرنے میں لگا رہتا ہے۔ ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام کی رائے میں دنیا کا سب سے بڑا محقق ایک بچّہ ہوتا ہے۔اس کے اندر تجسس کا مادّہ اس قدر موجزن رہتا ہے کہ وہ اپنے سامنے آنے والی ہر شے کی حقیقت جاننے کی کوشش کرتا ہے۔تو تحقیق کی ابتداء زندگی کی ابتدا کے ساتھ ہی وقوع پذیر ہوتی ہے۔اور جوں جوں عمر کا کارواں آگے بڑھتا ہے تحقیقی صلاحیت میں نکھار پیدا ہوتا ہے۔کسی کسی میں یہ صلاحیت خدا داد ہوتی ہے اور کہیں کہیں اکتساب اور مسلسل محنت سے حاصل کی جاتی ہے۔ ایک باکمال اور معیاری تحقیق کے لیے محقق کے اندر درج ذیل اہم خصوصیات کا ہونا لازمی ہے۔

1۔ تحقیق کے تئیں محقق میں میلان و رغبت کا ہونا لازمی عنصر ہے۔اس کے بغیر تحقیق کے میدان میں قدم رکھنا صرف وقت کا ضائع کرنا ہے، تحقیق کی راہیں بڑی پُر خار ہوتی ہیں۔طالب علم کا رجحان اور دلچسپی ہی اس کے اندر بلند ہمّتی پیدا کرتی ہے کہ اس معرکہ کو مکمل کامیابی کے ساتھ سر کر لیتا ہے۔عبدالرزّاق قریشی لکھتے ہیں کہ فارسی ادب نے اِڈورڈ براؤن کو اس قدر متاثر کیا کہ انھوں نے طب کے پیشے کو چھوڑ کر اپنی زندگی کا بیشتر حصّہ فارسی ادب کی تحقیق میں گزارا اور اتنی دسترس حاصل کر لی کہ ایران کے علمائے ادب نے بھی ان کی استادی کو قبول کیا۔ (مشمولہ، مبادیاتِ تحقیق: عبدالرزاق قریشی، ص 23) ایک اور جگہ لکھتے ہیں کہ سید سلیمان ندوی نے کالج کی آرام دہ زندگی اور معقول تنخواہ کو خیر باد کر کے پوری زندگی دارالمصنّفین کی علمی خانقاہ میں ایک معمولی تنخواہ پر گزار دی۔ (ایضاً 23)، یہی وہ ذوق وشوق کا جذبہ ہے جو انسان کو جنون کی حد تک مائل کر دیتا ہے کہ وہ اپنی پوری زندگی ادب کی تحقیق کے لیے وقف کر دیتا ہے۔

2۔ محقق کا مطالعہ بہت وسیع ہونا چاہیے۔تحقیقی موضوع پر دسترس کے ساتھ ساتھ مختلف علوم وفنون سے واقفیت

محقق کو ہمیشہ غیر جانبدار ہونا چاہیے۔موضوع کے تئیں اپنے ذاتی عقائد، ذاتی رجحانات ومیلانات، شخصی خیالات و نظریات اور ذاتی جذبات کو یکسر فراموش کر نے کے بعد تحقیق کی ابتدا کرنی چاہیے، کیونکہ تحقیق کی بنیاد ذاتی عقائد اور خواہشات پر نہیں بلکہ منطقی دلائل اور حقائق پر مبنی ہوا کرتی ہے۔ اگر آپ کی ذاتی رائے حقائق سے مطابقت رکھتی ہے تو بلا چوں و چرا اُسے شامل کرنا چاہیے۔ ورنہ ممکن ہے کہ محقق بڑی حد تک بے راہ رو ہو جائے۔

بھی ضروری ہے۔مثلاً ہر شاعر وادیب کے فن پارے اس دور کی عکّاسی کرتے ہیں جس دور میں اس نے اپنی زندگی گزاری ہے۔بعض دفعہ ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ ان فن پاروں سے چند ایک تاریخی حقیقت کی تصدیق بھی ہوئی ہے اور کسی اہم تاریخی واقعے کے رونما ہونے کی وجوہات کا بھی پتہ چلا ہے۔ایک بار میرے محترم استاد پروفیسر نسیم الدین فریس صاحب نے دورانِ درس وتدریس متن کی عصری معلومات اور تہذیبی کوائف کی ایک دلچسپ مثال اس طرح پیش کی کہ میر نے 'نکات الشعرا' میں بے نوا کے حالات میں لکھا ہے کہ محمد شاہ بادشاہ کے دور میں ایک جوہری نے ایک موچی کو قتل کیا۔مقتول کی حمایت میں دلّی کے موچیوں نے ہنگامہ مچایا اور جامع مسجد میں جمعہ کے دن خطبے میں خلل ڈالا۔محمد شاہ کے ایک امیر ظفر خاں روشن الدولہ نے جوہری کو پناہ دی۔اس کی مخالفت دوسرے امرانے کی۔نتیجتاً فساد برپا ہوگیا۔تلواریں چلیں کئی آدمی قتل ہوگئے۔اس واقعے پر بے نوا نے ایک مخمّس لکھا۔اس طرح 'نکات الشعرا' سے ہمیں نہ صرف بے نوا کے مخمّس کی شانِ نزول کا پتہ چلتا ہے بلکہ عہد محمد شاہ میں امرائے سلطنت کے باہمی اختلافات کا بھی علم ہوتا ہے۔مذکورہ مخمّس ملاحظہ ہو:

یہ کیا ستم ہے اے فلک ہر زہ نابکار
مریخ پھر کے تیز کیا ہے خنجر کی دھار
جوتی فروش مردِ مسلماں دین دار
مردود جوہری نے لیا ہے ستم سے مار
سنگ جفا سے چور کیا لعلِ آبدار

جوتی فروش بیچ پڑی آ کے کھلبلی
کئیوں کی کشتی ڈھیلی ہوئی اور عقل ٹلی
بے حدشمار مرحلہ سے جوتیاں چلی
کیا نئی و کیا پُرانی پشوری و کھیتلی
لاہوری، سیف خانی، چرن مُنڈی، پٹّی دار
کتنوں کو مار جی سے قضا نے گرادیا
کتنوں کو جی بچا کے بہت ہڑبڑادیا
کاغذ پہ بے نوا نے یہ سُن کر چڑھا دیا
لگتے ہی مار جوتیوں طرّہ گرادیا
تا حشر ہر زباں پہ رہے گا یہ یادگار

محمد حسین آزاد 'آبِ حیات' میں فرماتے ہیں کہ میر کے لکھنؤ آنے سے قبل یہاں ان کی شاعری کا طوطی بول رہا تھا۔لوگ ان کے کلام کے مدّاح تھے۔مگر میر کی شخصیت اور شکل وصورت سے ناواقف تھے۔جب میر پہلی بار لکھنؤ آئے اور ایک مشاعرے میں شرکت کی، شہر لکھنؤ کے بانکے ٹیڑھے، نئی تراش اور نئے انداز کے نوجوانوں نے زمانے کے ہاتھوں دل شکستہ، غریب الوطن میر کی قدیمانہ وضع پر ہنسی اڑائی اور ان کا وطن پوچھا تو میر نے مذکورہ قطع فی البدیہہ کہہ کر غزل کی ابتدا کی:

کیا بود و باش پوچھو ہو پُورب کے ساکنو
ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

میر کے مذکورہ قطعے کی تشریح تاریخ طلب ہے۔اس دور کی تاریخ کا مطالعہ کیے بغیر ان اشعار کو نہیں سمجھا جا سکتا۔اسی طرح غالب کے خطوط سے دہلی کی تاریخ اور تہذیبی صورتِ حال کا پتہ چلتا ہے۔ہر لکھنے والے کی تخلیق کے بین السطور میں اس دور کی تاریخ مضمر رہتی ہے۔بنا تاریخی شعور کے ایسے فن پاروں پر تحقیق کا حق ادا نہیں کیا جا سکتا۔اسی طرح صرف تاریخ سے ہی نہیں بلکہ مختلف علوم وفنون مثلاً فلسفہ، عمرانیات، نفسیات، لسانیات و سائنس وغیرہ سے بھی واقفیت ہونی چاہیے۔

3۔ ہر زبان وادب کے محقق کے لیے ضروری ہے کہ دیگر زبان وادب سے بھی واقفیت رکھتا ہو۔مثلاً اردو ادب کا طالب علم اگر فارسی، عربی، ہندی، انگریزی وغیرہ زبان سے واقف ہے تو دورانِ تحقیق ضرورتاً وہ ان زبانوں میں تحریر کردہ بنیادی ماخذات سے مستفید ہوسکتا ہے جو مصنف کی اصل تخلیق ہوتے ہیں ورنہ ترجمہ پر انحصار کرنا

پڑے گا جو ثانوی ماخذ کا درجہ رکھتا ہے۔جس میں غلطیاں سرزد ہونے کے امکانات قوی ہوجاتے ہیں۔اس لیے محقق کو چاہیے ان تین چار زبانوں میں بولنے، لکھنے، پڑھنے اور سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔کیونکہ محقق کا وسیع ذہنی پس منظر اس کے اظہار کو جامعیت،اس کے خیالات کو وسعت اور اس کی تحریر کو وقار عطا کرتا ہے۔

(نئی تنقید، ڈاکٹر جمیل جالبی،ص 63)

4۔ محقق کو ہمیشہ غیر جانبدار ہونا چاہیے۔موضوع کے تئیں اپنے ذاتی عقائد، ذاتی رجحانات ومیلانات، شخصی خیالات ونظریات اور ذاتی جذبات کو یکسر فراموش کرنے کے بعد تحقیق کی ابتدا کرنی چاہیے، کیونکہ تحقیق کی بنیاد ذاتی عقائد اور خواہشات پر نہیں بلکہ منطقی دلائل اور حقائق پر مبنی ہوا کرتی ہے۔ اگر آپ کی ذاتی رائے حقائق سے مطابقت رکھتی ہے تو بلا چوں و چرا اُسے شامل کرنا چاہیے۔ ورنہ ممکن ہے کہ محقق بڑی حد تک بے راہ رو ہوجائے۔

5۔ محقق کو چاہیے صبر وتحمل کے ساتھ اپنے موضوع سے متعلق مصادر ومراجع کو بار بار پڑھے۔جب تک منزل مقصود تک نہیں پہنچ جائے تب تک مطالعہ کے تئیں اکتاہٹ و بیزاری نہیں پیدا ہونی چاہیے۔صبر وتحمل اور احتیاط کے ساتھ بہتر سے بہتر مواد تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرے۔اپنے مقالے کو جہاں تک ممکن ہو زیادہ سے زیادہ تخلیقی اور مکمل کرنے کی سعی کرے۔ذہنی طور پر یہ سوچ پیدا کرنی چاہیے کہ مقالہ علمی دنیا میں ایک قابلِ قدر اضافے کی صورت میں سامنے آئے۔

۶۔ محقق میں دیانتداری اور ایمانداری کی تمام خصوصیات بدرجۂ اتم موجود ہونی چاہیے۔علمی امانت داری کے بغیر تحقیق کے آداب واخلاقیات کے ساتھ انصاف نہیں کیا جا سکتا۔ہر نقل و اقتباس کا حوالہ محقق کو ضرور دینا چاہیے۔ عبارت واقتباس کے نقل میں کسی قسم کا اضافہ یا تحریف نہیں کرنی چاہیے اور ہر عبارت کو اس کے کہنے والے کی طرف منسوب کرنا چاہیے۔نہ کہ محنت کسی اور کی ہو اور آپ اس پر پوری عمارت سجالیں۔یہ تحقیقی آداب کے خلاف ہے۔بقول ڈاکٹر جمیل جالبی:

''آپ کی تحریر چبائے ہوئے لقموں کی طرح نہیں ہونا چاہیے۔اس میں ایک زاویہ ہونا چاہیے جو آپ کا اپنا زاویہ ہو.....اس مخصوص زاویے کی اہمیت ہی آپ کی تحریر کو وہ قوت اور زور عطا کرے گی جس سے دوسرے متاثر ہوں گے۔'' (نئی تنقید، ڈاکٹر جمیل جالبی،ص 58)

7۔ تکبّر، غرور اور خودسری کے جذبے سے محقق کو چاہیے کہ ممکنہ حد تک اجتناب کرے۔کسی کے آرا و نظریات کو گھٹیا سمجھ کر ان پر کیچڑ نہیں اچھالنا چاہیے۔یہ تحقیق کے آداب کی خلاف ورزی ہوگی۔ایسے ناگوار عوامل تحقیق کے حسن اور محقق کی محنت و کاوش پر خاک ڈال دیتے ہیں۔ایسی صفات کے حامل محقق کے نظریات چاہے سو فیصدی درست ہی کیوں نہ ہوں قاری ان کے مطالعے سے متنفر ہو جاتا ہے۔اس لیے محقق کو چاہیے کہ وہ آداب تحقیق کا خیال رکھے۔

8۔ محقق اگر ایک اچھا منتظم ہوتا ہے تو تحقیقی کام بڑے ہی منظّم انداز میں تکمیل تک پہنچتا ہے۔اس لیے محقق کو چاہیے کہ نظم ونسق اور تنظیم وترتیب کا خاص خیال رکھے۔ اپنی سوچ وفکر کو منتشر نہ ہونے دے۔ایک وقت میں کسی ایک نقطے پر ہی غور کریں، چونکہ موضوع کے انتخاب کے بعد تحقیق کا سب سے پہلا مرحلہ خاکہ تیار کرنا ہوتا ہے۔ ایک منظّم خاکہ محقق کی بہترین رہنمائی کرتا ہے۔محقق کو چاہیے مذکورہ خاکے کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے بڑی احتیاط، تنظیم وترتیب کے ساتھ تحقیقی مراحل طے کرے۔

9۔ محقق کو ذہین اور حاضر دماغ ہونا چاہیے۔اگر وہ ایک اچّھے حافظے اور روشن دماغ کا مالک ہوتا ہے تو تحقیق کے درست نتائج حاصل ہو سکتے ہیں۔مختلف افکار کا ترتیب کے ساتھ موازنہ کرکے ایک نتیجہ خیز نقطے پر پہنچ سکتا ہے۔مگر حافظے اور یادداشت پر مکمل طور پر منحصر نہیں ہونا چاہیے۔کسی بھی ایک نقطے پر نظریہ قائم کرنے سے پہلے متن اور مواد کا کئی بار مطالعہ کرنا ضروری ہے۔تبھی کسی کامل نظریے تک پہنچنا ممکن ہے۔اگر یادداشت پر انحصار کرکے قلم چلانا شروع کر دیا جائے تو لغزش کے امکانات بڑھ جاتے ہیں جس کے نتائج زیادہ تر کارآمد ثابت نہیں ہوتے۔

تحقیق طالب علم کے لیے ایک کوہِ قاف کی وادی کی طرح ہے جس میں نگرانِ تحقیق یعنی Supervisor محقق کے لیے مشعلِ راہ بن جاتے ہیں۔تحقیق کی اوبڑ کھابڑ، نوکدار پتھریلی زمین پر تحقیقی مراحل طے کرنے میں محقق کے لیے آسانیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ہندو پاک کی چند یونیورسٹیوں میں ایم۔اے کی سطح پر ہی مختصراً مقالہ پروجکٹ ورک یا تھیس کی شکل میں تحریر کروایا جاتا ہے۔ کہیں کہیں اس مقالے کے لیے نگرانِ تحقیق عام طور پر اسی مضمون کے استاد کو منتخب کیا جاتا ہے جس میں طالب علم تحقیق کرنا چاہتا ہے۔اور کہیں ایسا بھی ہوتا ہے استاد کی عدم موجودگی کی بہ نسبت سارے طلبا و طالبات ایک ہی نگراں کے حوالے کر دیے جاتے ہیں۔ایم۔فل اور پی ایچ۔ڈی کی سطح پر کوئی مخصوص قاعدہ موجود نہیں ہے۔کہیں بذریعہ صدرِ شعبہ نگراں کی تقرری عمل میں آتی ہے، تو کہیں نگراں ہی اس کا فیصلہ کرتا ہے کہ وہ کس کا Supervisor بنے اور کہیں ایسا بھی ہوتا ہے کہ طالب علم خود اپنے نگراں کا انتخاب کرتا ہے۔بلکہ احسن طریقہ یہ ہونا چاہیے کہ طلباء کے ادبی میلان کو مدّ نظر رکھتے ہوئے جس صنف میں طلبا کی رغبت موجود ہو اُسی صنف کے ماہر استاد کے حوالے طالب علم کو کیا جانا چاہیے۔بہر حال نگراں میں درجِ ذیل اوصاف لازماً ہونا چاہیے۔

1۔ نگرانِ تحقیق فنِ تحقیق میں مہارت رکھتا ہو۔تحقیق کے اصول اور قاعدے وقوانین، تحقیقی آداب واخلاقیات اور تحقیق میں درپیش مسائل سے مکمل طور پر روشن دماغ کا حامل ہو اور تحقیق کے میدان میں گراں قدر خدمات سر انجام دے چکا ہو۔بذاتِ خود اس کے اپنے تحقیقی مقالے تحقیقی معیار پر کھرے اُترتے ہوں۔اپنے آپ کو ہمیشہ تحقیق میں مشغول رکھتا ہو۔تبھی وہ ایک اچھا Supervisor ثابت ہوسکتا ہے۔ طالب علم میں تحقیقی شعور پیدا کرسکتا ہے۔اور اس کی نگرانی میں سارے تحقیقی کام کامیابی کے ساتھ پایۂ تکمیل تک پہنچ سکتے ہیں۔

2۔ نگراں کو اسی موضوعِ تحقیق پر کام کروانا چاہیے جس پر وہ خود دسترس رکھتا ہو۔موضوع پر جتنی اچھی پکڑ ہوگی کام اتنا ہی معیاری ہوگا۔ورنہ محقق کو مختلف دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔کیونکہ عدم معلومات کی وجہ سے نگراں مذکورہ موضوع کا کامل رہبر نہیں بن سکتا۔

3۔ Supervisor کو چاہیے کہ وہ ایک اچھا رہنما اور رہبر ثابت ہو۔تحقیق میں محقق کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت صرف کر پائے اس کے تحقیقی مصادر و مراجع کے بارے میں رہنمائی کرتا رہے اور وقتاً فوقتاً اس کے کام کا عمیق معائنہ کرتے ہوئے اپنی تنقیدی آرا سے محقق کو روشناس بھی کراتا رہے۔اس سے کام وقت پر ختم ہوسکتا ہے اور دو لوگوں کی محنت اور کاوش سے ایک معیاری تحقیق منظرِ عام پر آسکتی ہے۔

4۔ نگراں اور محقق کے درمیان ہم آہنگی ہونی چاہیے کیونکہ، ذہنی مناسبت اور ایک پُر خلوص رشتہ رہنا برائے تحقیق ایک مثبت پہلو کا حامل ہے۔ورنہ اس کے منفی اثرات تحقیق کے لیے مضر ثابت ہو سکتے ہیں۔نگراں کے دل میں اپنے محقق کے تئیں خیر خواہی کا جذبہ رہنا چاہیے۔نہ زیادہ سختی سے پیش آئے اور نہ ہی زیادہ نرمی کا برتاؤ رکھے۔محقق کا کام کتنا ہی ناقص کیوں نہ ہو نگراں کو چاہیے اس کی حوصلہ شکنی کے بجائے مفید مشورے کے ساتھ ساتھ اس کی حوصلہ افزائی بھی کرے۔نگراں کی شخصیت ایسی ہونی چاہیے کہ محقق کے اندر اس کے تئیں خوف وہراس کا

جذبہ پیدانہ ہو۔اگرایسا ہوتو نہ ہی Supervisor محقق کی راہ میں درپیش مسائل کا مطلق اندازہ لگا سکتا ہے اور نہ ہی محقق اپنی پریشانیوں سے نگراں کو واقف کروا سکتا ہے۔ دونوں کی شخصیت ایک دوسرے کے لیے مبہم بن جاتی ہیں اور تحقیق پر براہِ راست اس کا بُرا اثر پڑتا ہے۔

5۔ ڈاکٹر گیان چندجین لکھتے ہیں کہ نگراں میں یہ سیر چشمی ہونی چاہیے کہ اسکالر کو خود سے اختلاف کی آزادی دے۔(فنِ تحقیق: ڈاکٹر گیان چندجین، ص 47) اور یہ سو فیصدی درست بھی ہے۔کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ عمیق مطالعہ، کڑی محنت اور تلاش وجستجو سے موضوعِ تحقیق پر محقق اتنی دسترس حاصل کرلیتا ہے کہ چندایک نکات پر نگراں کے آراءاُسے موزوں نہیں لگتی۔اگر نگراں کی طرف سے اختلاف کی آزادی رہے تو محقق کو اپنی رائے ثابت کرنے میں جھجک یا ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوتی ہے۔اگر محقق کی موزوں آرا تھیسس کے ابتدائی مراحل میں ہی نگراں کی ذریعہ لائقِ تحسین یا قابلِ قبول ہوتو یہیں سے محقق کے حوصلے پست ہو جاتے ہیں اور مزید کام کے لیے جوش وخروش میں کمی پیدا ہو جاتی ہے۔اس لیے نگراں کو چاہیے کہ اپنی ذاتی آرا محقق پر مسلّط کرنے سے اجتناب کرے۔

سندی تحقیق کا ایک اوراہم رکن 'موضوع' ہے۔کسی مسئلے یا موضوع کے بغیر تحقیق کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔موضوعِ تحقیق کی تلاش وجستجو اور انتخاب وتعین تحقیقی عمل کا سب سے پہلا مرحلہ اور سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ بڑی ہی عرق ریزی اور باریک بینی سے یہ مرحلہ طے کیا جانا چاہیے۔کیونکہ محقق ونگراں کی دلچسپی ورغبت اور موقع ومحل کی مناسبت سے موزوں موضوع کا انتخاب عمل میں آئے تو تحقیق کا نصف کام ختم ہو جاتا ہے۔عموماً موضوع کا انتخاب دوطرح سے عمل میں آتا ہے پہلا نگراں کی طرف سے موضوع کا انتخاب اور دوسرا محقق کی طرف سے موضوع کا انتخاب۔

چند جامعات میں ایسا ہوتا ہے کہ صدرِ شعبہ اور دیگر اساتذہ کرام کی آپسی سمجھ بوجھ سے محقق کے رجحان وفکری میلان پر غور کیے بغیر کسی ایک موضوع کا انتخاب کرلیا جاتا ہے اور اس موضوع پر کام شروع کرنے کی ہدایت بلکہ فرمان جاری کر دیا جاتا ہے۔ممکن ہے محقق ذہنی طور پر مذکورہ موضوع کے لیے اپنے آپ کو تیار نہیں کر پائے اور موضوع طالبِ علم کے رجحانِ طبع کے مطابق نہیں ہوگا تو تحقیق میں دشواریاں پیدا ہو جائیں گی۔عدم دلچسپی کے سبب محقق دل جمعی اور لگن سے کام نہیں کر پائے گا اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ درمیان میں ہی تحقیق کا کام ترک کردے۔مثلاً طالب علم گر موزوں طبع نہیں ہے یا فنِ عروض اور لوازماتِ شاعری سے بہ خوبی واقف نہیں ہے تو اشعار کی تدوین میں غلطی کے امکانات پیدا ہو جاتے ہیں۔

بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ کچھ جامعات میں موضوع کے انتخاب کا فریضہ مکمل طور پر طالب علم کو سونپ دیا جاتا ہے۔عین ممکن ہے کہ کارِ تحقیق کی اس پُر خار وادی کی دشوار گزار راہوں میں نا تجربہ کار طالب علم بھٹک بھی سکتا ہے۔کیونکہ مختلف جامعات میں ایم۔فل کی سطح سے ہی طالب علم کو محقق بننے کے خوش آئند مواقع فراہم کر دیے جاتے ہیں اور چند ایک جامعات میں ایم۔فل کی بھی سہولت موجود نہیں ہے۔ایم اے کے بعد ہی براہِ راست پی ایچ ڈی میں داخلہ مل جاتا ہے۔ششماہی کورس ورک میں فنِ تحقیق یا اُصولِ تحقیق کے متعلق مکمل معلومات حاصل نہیں ہو پاتی۔ایک تو تحقیق پر اردو میں کتابیں نہ کے برابر ہیں جو بھی ہیں وہ اُصول سے زیادہ مسائل پر مبنی ہیں۔طالب علم انھیں مسائل میں الجھ جاتا ہے اور چھ ماہ کا وقت پلک جھپکتے نکل جاتا ہے۔ایسے میں گر طالب علم کو موضوع کے انتخاب کا اہم اور نازک فریضہ سونپ دیا جائے تو اس سے کیا حاصل ہوسکتا ہے۔اس مسئلے کے حل کے لیے موزوں طریقہ اختیار کیا جانا چاہیے۔یہ بہتر ہوگا کہ شعبے کے تمام اساتذہ اور طلبا وطالبات میں عام بحث و مباحثے سے یہ پتہ لگانے کی کوشش کی جائے کہ جتنے بھی امیدوار موجود ہیں ان میں سے ہر ایک کی دلچسپی یا اس کی رغبت زیادہ شاعری سے ہے یا نثر سے۔گر کسی طالب علم کا رجحان شاعری کی طرف ہے تو کس صنفِ شعر سے اور اگر نثر کی طرف میلان ہے تو کس صنفِ نثر سے ہے۔گر اس بات کا پتہ چل جائے تو چند ایک سوالات سے اس صنف میں طلبا کی حقیقی دلچسپی اور وسعتِ مطالعہ کا بھی پتہ لگایا جا سکتا ہے۔پھر صدرِ شعبہ کو مذکورہ صنف میں دلچسپی رکھنے والے امیدوار کو اسی صنف میں مہارت رکھنے والے استاد کی نگرانی میں رکھنا چاہیے۔نگراں اور امیدوار آپسی گفت وشنید سے ایک ایسے موضوع کا انتخاب کریں جس کے ساتھ وہ پورا پورا انصاف کر پائیں۔اگر نگراں اور محقق دونوں مخالف جنس ہیں تو اس بات کا خیال رکھا جانا چاہیے کہ ایسے موضوع کا انتخاب ہو جس میں تبادلۂ خیال میں مشکلات پیش نہ آئیں۔

ہندوپاک کی اکثر جامعات کے اردو شعبوں میں موضوعات کی تنگی کا مسئلہ درپیش آتا ہے۔عصرِ حاضر میں ادبی تحقیق کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا ہے۔مختلف اصناف، مختلف شاعروں، مصنفوں، نقاد، تحریکات و رجحانات، مختلف ادوار کو موضوعِ تحقیق بنایا جاتا ہے۔پہلے تحقیق و تنقید کی راہیں الگ تھیں۔اب تحقیق میں تنقید کی شمولیت کا رجحان بڑھ رہا ہے۔بقول ڈاکٹر جمیل جالبی:

'جدید رجحان یہ ہے کہ تنقید کی بنیاد تحقیق پر رکھی جائے تا کہ جو بات کہی جائے پہلے اس کی صحت ہو جائے۔ اس عمل سے جو نتیجہ اخذ ہوگا وہ بھی درست ہوگا۔''

(ادبی تنقید، ڈاکٹر جمیل جالبی، ص 17)

اس لیے اب مختلف طرح کے موضوعات پر تحقیقی کام کیے جا سکتے ہیں اور کیے جا رہے ہیں۔ہندوپاک کی تمام جامعات کو یہ کرنا چاہیے کہ آج کے اس Technological دور میں جدید Technology سے مستفید ہوتے ہوئے اپنی یونیورسٹی کی ویب سائٹ میں ہر شعبے کے لیے ایک مخصوص گوشہ قائم کر کے تحقیق شدہ اور زیرِ تحقیق موضوعات کی فہرست Upload کی جائے اور اُسے ہر سال مستعدی سے Update کیا جاتا رہے۔ ایسی فہرست سے ہمارے اردو شعبوں کو اس بات کی موزوں جانکاری مل پائے گی کہ کن کن موضوعات پر کام ہو چکا ہے یا ہو رہا ہے۔اس سے تکرارِ موضوع کے مسئلے سے بھی بچا جا سکتا ہے۔اور تحقیق شدہ موضوعات پر غور و خوض سے کسی نئے پہلو کی تلاش کر کے ایک نئے زاویے سے تحقیق کی جا سکتی ہے۔جناب ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صاحب نے اپنے مضمون ''موضوعِ تحقیق کی تلاش وتعین اردو میں ادبی تحقیق کے تناظر میں'' میں موضوع کی تنگی کے مسئلے کا حل اس طرح پیش کیا ہے:

''جہاں کسی جامعہ کے اردو شعبے کو 'موضوع نہیں ملتے' کا مسئلہ درپیش ہو، وہاں وہ شعبہ، تحقیق و تدوین کا ذوق اور نسبتاً زیادہ معلومات اور تجربہ رکھنے والے پانچ سات پروفیسر حضرات کو اپنی جامعہ میں مدعو کرے، باہمی مشاورت سے تحقیق وتدوین کے لائق نئے موضوعات کی ایک فہرست زیرِ غور لائی جائے، اس پر بحث و مباحثہ اور تبادلۂ خیال ہو۔اس عمل کے نتیجے میں آئندہ پورا سال شعبہ، تحقیق کراتا رہے۔'' (مشمولہ، تحقیق شمارہ نمبر 16، ص 8)

جناب ہاشمی صاحب کی یہ تجویز تمام جامعات کے لیے کار آمد ثابت ہو سکتی ہے۔یہ تو تھا کہ موضوع کا انتخاب کیسے کیا جائے، اب ایک بڑا مسئلہ سامنے آتا ہے کہ کس طرح کے موضوع کا انتخاب کیا جائے۔ذیل میں انتخابِ موضوع کے متعلق چند تجاویز درج ہیں۔

1۔ سب سے پہلے نگراں اور محقق کو یہ دیکھنا چاہیے کہ ایسا موضوعِ تحقیق کے لیے تلاش کیا جائے جو دونوں کے لیے دلچسپ ہو۔(جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے)۔جس

کام کو انسان پوری دل جمعی اور دلچسپی کے ساتھ کرتا ہے تو تاحدِ امکان اُسے کامیابی ضرور ملتی ہے۔ اگر محقق شاعری سے زیادہ فکشن میں دلچسپی رکھتا ہے تو اسے فکشن کی ہی کسی ایسے صنف پر تحقیق کرنی چاہیے جس میں اس کا مطالعہ وسیع ہو۔ یہ زیادہ مفید ثابت ہو سکتا ہے۔

2۔ ڈاکٹر گیان چند جین کی رائے میں موضوع خالص تنقیدی نہ ہو کیونکہ یہ تحقیق و تنقید دونوں کی حق تلفی ہے۔ (مشمولہ، فنِ تحقیق: ڈاکٹر گیان چند جین، ص 80) جمیل جالبی بھی فرماتے ہیں کہ موضوع اگر تنقیدی ہے تو اس کی بنیاد تحقیق پر رکھی جائے۔ (ادبی تنقید، جالبی، ص 17) تحقیقی مقالوں کے لیے ایسے موضوعات کا انتخاب نہیں کیا جانا چاہیے جن کا تحقیق سے دور دور تک کوئی سروکار ہی نہ رہے اور وہ خالص تنقیدی موضوعات کے زمرے میں آجائیں۔ موضوع کو تحقیقی ہونا چاہیے اور دورانِ تحقیق اس میں از خود تنقیدی پہلو آتے جائیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔

3۔ اپنی استطاعت کے باہر ناموزوں موضوعات متعین نہیں کیا جانا چاہیے۔ مثلاً ایک شمالی ہند سے تعلق رکھنے والا طالب علم دکن کی کسی تخلیق پر تحقیق شروع کرے جبکہ دکنی زبان پر کوئی مہارت نہیں رکھتا ہو تو تحقیق میں حد درجہ رکاوٹ پیدا ہونے کے امکانات رہتے ہیں۔ اگر محقق اور نگراں ایسے موضوع کا بھی انتخاب کرتے ہیں جو کسی غیر ملکی زبان پر دسترس کا متقاضی ہو مگر تحقیق کار اور راہ نما اس زبان پر اتنی مہارت نہیں رکھتے تو تحقیق کے آداب اور معیار کو ملحوظِ خاطر رکھ پانا مشکل ہی نہیں ناممکن ہو جاتا ہے۔

4۔ ایسا موضوع اختیار کیا جانا چاہیے جس سے معلومات میں اضافہ ہو نہ کہ صرف وقت کا ضائع کرنا مقصود ہو۔ موضوع سے متعلق چند ایک کتابوں کو سامنے رکھ کر انھیں کتابوں میں موجود مواد کو اپنے مقالے میں شامل کر لیا اور کوئی نیا پہلو یا کوئی نئی بات کا انکشاف نہیں ہوا تو اس سے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا ہے۔ مواد سے استفادہ تو کیا جاتا ہے مگر کوئی نیا پہلو بھی تو سامنے آنا چاہیے جس میں بحیثیت محقق آپ کی انفرادیت جھلکے۔ بقول شیریڈن بیکر:

''ریسرچ کے معنی دوبارہ تلاش کرنا ہیں یعنی جہاں دوسروں نے تلاش کی وہیں پھر تلاش کر کے ایک نئی بات کھوج نکالنا جو دوسرے نہیں ڈھونڈ پائے تھے۔''

(مشمولہ، آزادی سے قبل اردو تحقیق، ڈاکٹر محمد اکمل، ص 21)

5۔ سندی تحقیق میں ایسے موضوع کو ترجیح دی جانی چاہیے جس میں زیادہ سے زیادہ تحقیقی مواد حاصل ہو سکے۔ سندی تحقیق میں معین وقت میں مقالہ مکمل کرنے کی قید رہتی ہے۔ معین مدّت کی حصار میں قید محقق اگر ایسا موضوع اختیار کر لے جس میں پورا وقت مواد کی تلاش میں صرف ہو جائے تو اس سے دو باتیں سامنے آسکتی ہیں یا تو ایک ادنیٰ درجے کا مقالہ ہی منظرِ عام پر آئے یا بے مواد کے موضوع سے گھبرا کر محقق میدان چھوڑنے پر مجبور ہو جائے۔

۶۔ ایسے موضوع کو بھی ترجیح نہیں دی جانی چاہیے جس پر مواد تو زیادہ رہے مگر مواد تک رسائی کے ذرائع اور وسائل کی عدم موجودگی محقق کی راہ میں دشواریاں کھڑی کر دے۔ مثلاً اگر کوئی ہندوستانی طالب علم اردو کی خواتین افسانہ نگاروں پہ کام کرنا چاہتا ہے تو اس موضوع کے تحت ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں کی خواتین افسانہ نگاروں کو اپنی تحقیق میں شامل کرنا پڑے گا۔ مگر دورِ حاضر میں دونوں ملکوں کی سیاسی نامطابقت کی بدولت آمدو رفت کی دشواریاں محقق کی راہ کا پتھر بن سکتی ہیں، نہ اسے پاکستان جانے کا کبھی موقع مل سکتا ہے اور نہ ہی وہاں سے کسی بھی طریقے سے وہ مواد حاصل کر سکتا ہے۔ اسی طرح کبھی کبھی مالی دشواریاں بھی بڑھتے ہوئے قدم روک لیتی ہیں۔ اگر محقق سرکاری وظیفے کا اہل نہیں ہے اور موضوع سے متعلق مواد بیرونِ ممالک میں موجود لائبریریوں کی سیر کا تقاضا کرتا ہے تو محقق کے لیے پریشانیاں لاحق ہو جاتی ہیں۔ اور آخر میں معاملہ یہ درپیش آتا ہے کہ یا تو وہ موضوع بدلنے پر مجبور ہو جاتا ہے یا تحقیق سے رشتہ منقطع کر لیتا ہے۔

7۔ مشہور و معروف نقاد اور محقق شمیم حنفی صاحب بجا فرماتے ہیں کہ:

''زندہ ادیب پر کام نہیں ہونا چاہیے، تاوقتیکہ وہ اپنا سارا کام کر چکا ہو اور اس کی گنجائش نہ رہ گئی ہو کہ وہ مزید کوئی کام کرے گا۔'' (مشمولہ، تحقیق شمارہ نمبر 16، ص 6)

چونکہ ادیب ابھی با حیات ہے محقق کے لیے آسانیاں فراہم ہو سکتی ہیں کہ مواد کے لیے ادھر ادھر کی دوڑ دھوپ سے نجات مل جائے گی۔ مگر ایسا تحقیقی کام مکمل نہیں ہوتا ہے۔ کیونکہ جب تک وہ زندہ ہے اس کی تخلیقات منظرِ عام پر آتی رہیں گی اور نظریات اور خیالات کو لے کر نئے نئے انکشافات ہوتے رہیں گے۔ اور عین ممکن ہے کہ آئندہ آنے والے نظریے سابق آراء کی تردید بھی کرتے ہوں، اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی ذاتی مفاد کی غرض سے کسی زندہ شخص کو موضوع بنا لیا جاتا ہے جو سراسر تحقیقی آداب کی خلاف ورزی ہے۔ گیان چند جین درست فرماتے ہیں کہ:

''تحقیق میں مصلحت کی آلائش شامل ہو جائے تو وہ حق کی تلاش نہیں رہتی۔''

(تحقیق کا فن، ڈاکٹر گیان چند جین، ص 85)

8۔ ایسے موضوع کو ترجیح نہیں دینی چاہیے جس سے محقق جذباتی طور پر جُڑا ہوا ہو اور احتیاط کے تقاضوں کو ملحوظِ خاطر نہ رکھ پائے اور نہ ہی ایسا موضوع اختیار کیا جائے جس سے شدید قسم کا عناد ہو کہ محقق تحقیق کا حق ادا نہیں کر سکتا ہے۔

9۔ اگر محقق اردو کے علاوہ دیگر زبانوں سے ناواقف ہے تو اسے ایسے موضوع سے پرہیز کرنا چاہیے جس میں کسی دوسری زبان کی معلومات کے بغیر کام مکمل ہی نہ ہو پائے۔ مثلاً ایسا موضوع جس کے زیادہ تر مواد انگریزی، فارسی یا عربی زبان میں ہی دستیاب ہیں اور اس کے تراجم اردو زبان میں موجود نہیں ہیں تو ایسی حالت میں محقق تحقیق کا حق ادا نہیں کر سکتا۔

المختصر تحقیق کے مذکورہ تین بنیادی مراکز تحقیقی عمل میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔ چونکہ تحقیق سچ یا حقیقت کی دریافت کا عمل ہے جس میں کسی شے کی حقیقت کا پتہ لگایا جاتا ہے، صحیح و غلط کے بعض مسلمات کی روشنی میں تفتیش کی جاتی ہے اور کسی مسئلے کی حقیقت تک پہنچنے کی کوشش میں جد و جہد کی جاتی ہے، اس لیے ابتداء سے لے کر خاتمے تک سندی تحقیقی عمل (Verb) میں جہاں فاعل کی حیثیت سے محقق (Subject) پورے جوش و خروش کے ساتھ متحرک رہتا ہے وہیں کوئی موضوع یا مسئلہ (Predicate) بحیثیتِ مفعول بڑی ہی باریک بینی اور عمیق تجزیاتی عمل سے گزرتا ہے اور ان دونوں کے درمیان نگراں (Helping verb) بحیثیتِ مددگار فعل مذکورہ عمل کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں ایک رہبر، رہنما اور ہادی کا اہم کردار نبھاتا ہے۔ نتیجتاً ایک کامل، جامع اور معیاری مقالہ یا تھیسس علمی دنیا میں ایک کارآمد اضافے کے طور پر منظرِ عام پر آتا ہے جس پر مشہور محقق آرتھر کول (Arthor Cole) کی جدید و جامع تعریف یقینی طور پر صادق آتی ہے:

''مقالہ سے مراد ایک مکمل رپورٹ ہے جسے محقق ایسے کام کے بارے میں پیش کرتا ہے جسے اس نے اپنے ذمّے لیا ہوا اور مکمل کیا ہو۔ اور وہ رپورٹ اس انداز میں ہو کہ مطالعہ کے تمام مراحل پر مشتمل ہو اس وقت سے کہ جب وہ کام محض ایک سوچ تھا یہاں تک کہ وہ سوچ تدوین شدہ اور دلائل و براہین سے تائید شدہ نتائج کی صورت اختیار کر گئی۔''

(مشمولہ، تحقیق و تدوین کا طریقۂ کار، ڈاکٹر خالق داد ملک، ص 22)

Shazia Tamkeen C/o Dr. Shah Nawaz Alam
156-Wasi Abad, Noorullah Road
Allahabad - 211003 (UP)

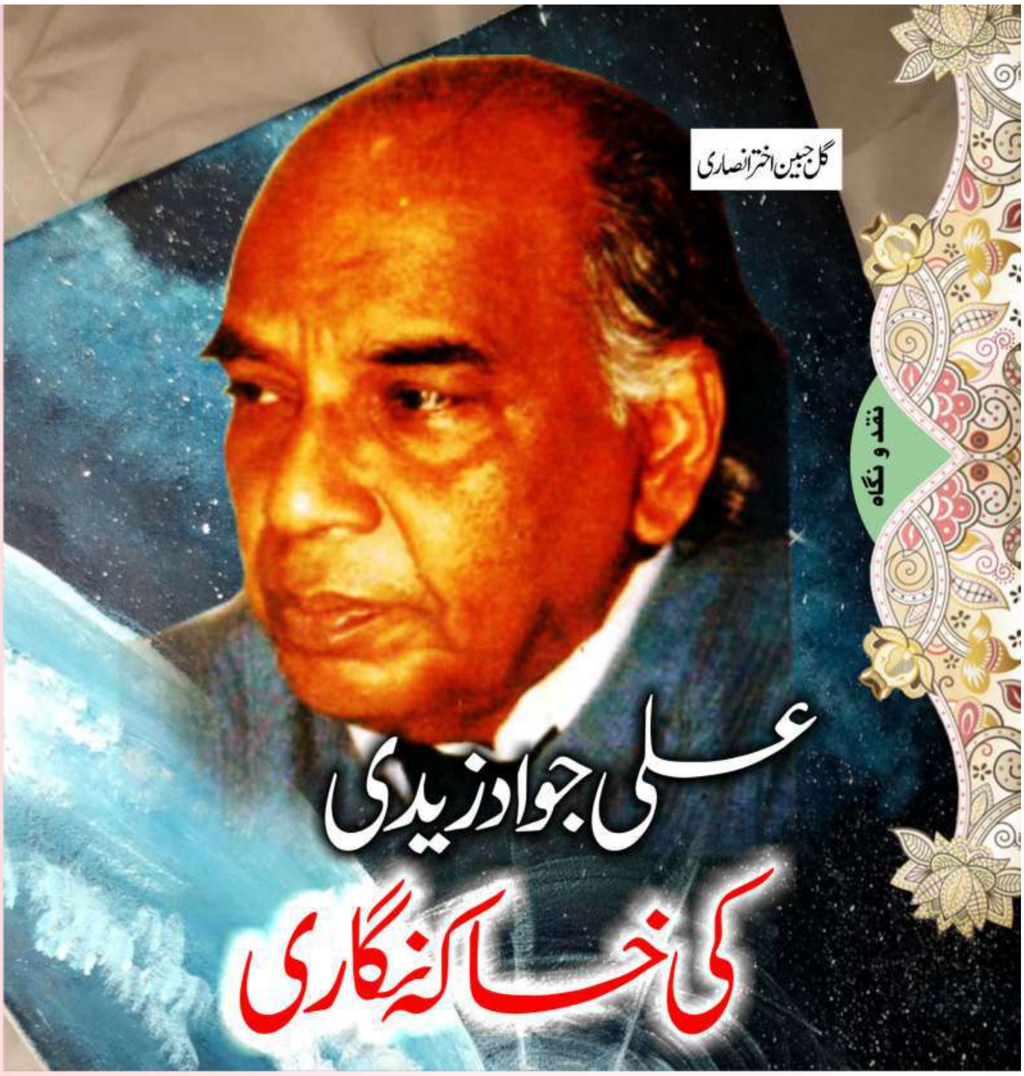

گل جبین اختر انصاری

علی جواد زیدی کی خاکہ نگاری

خاکہ نگاری ان چند اور اہم واقعاتِ زندگی کو اس طرز میں پیش کرنے کا نام ہے، جس میں اس شخصیت کی مکمل تصویر اور مخصوص خد و خال اپنی تمام تر خوشنمائیوں اور بدنمائیوں کے ساتھ اصلی رنگ و روپ میں نمایاں ہو جائیں۔ ان کے خیالات و افکار، عادات و اطوار، ذہن کی افتاد، زاویہ فکر اور اس کے مزاج وغیرہ کی جھلکیاں اس طرح نظر آ جائیں کہ قاری کے ذہن پر یہ خیال گزرے کہ جیسے اس شخص سے اس کی قدیم شناسائی ہے۔

اچھا خاکہ وہی ہے جس میں شخصیت کے اہم گوشوں کی نقاب کشائی ایسی ماہرانہ نفاست اور سلیقے کے ساتھ کی جائے کہ اس کا تاثر خود بہ خود پڑھنے والے کے دل و دماغ میں پیدا ہو جائے۔ کتاب چند عجیب ہستیاں کے مقدمے میں جمیل جالبی لکھتے ہیں:

''اصل میں دیکھنے کی بات یہ ہے کہ پورا خاکہ پڑھنے کے بعد قاری کے ذہن پر اس شخصیت کا کیا اور کیسا اثر قائم ہوتا ہے، کیا وہ انسان بتاشہ کی طرح بیٹھ جاتا ہے یا مینارہ کی طرح بلند و بالا نظر آنے لگتا ہے۔ اگر تاثر بتاشے کا ہے تو خاکہ نگار اپنے خاکے میں ناکامیاب ہے اگر اثر آفرینی مینارہ کی ہے تو وہ کامیاب ہے۔''[1]

علی جواد زیدی صاحب کا خیال تھا کہ ایک عام قاری کی رسائی صرف تخلیق تک ہوتی ہے تخلیق کار تک نہیں، اسے یہ معلوم ہی نہیں ہو پاتا کہ کسی فن پارے کو اس کے انجام تک پہنچانے میں اس کے خالق کو کن مراحل سے گزرنا پڑا اور اس کے پیچھے کون کون سے ذہنی عناصر کار فرما رہے۔ کیونکہ قاری ان تمام حقائق سے ناواقف ہوتا ہے اس لیے وہ ادیب سے کسی قسم کی انسیت اور لگاؤ محسوس نہیں کرتا اور نہ ان کے درمیان محبت کا کوئی رشتہ قائم ہو پاتا ہے۔ ایک فنکار بھی ایک آدم زاد ہے اور اس سے بھی غلطیاں سرزد ہوتی ہیں مگر ایک عام قاری ان کوتاہیوں اور خامیوں کی تہ تک نہ پہنچ پانے کی وجہ سے اس کے خالق کے جذبات سمجھنے میں قاصر ہوتا ہے اور نتیجہ میں وہ ادیب کو ہمدردی کی نگاہ سے دیکھنے یا ان غلطیوں کے تئیں ہمدردانہ رویہ رکھنے سے محروم رہتا ہے اور پھر وہ ادیب کو ہوئی اپنی اس بھول کے احساس سے اس کے تئیں عزت کا جذبہ بھی پیدا نہیں ہوتا اور اس سے دونوں کے درمیاں ایک خلا پیدا ہو جاتا ہے، اسی خلا کو دور کر کے قاری کے دل میں تخلیق کار کے لیے عزت اور ہمدردی پیدا کرنے کی غرض سے بھی انھوں نے خاکے لکھے ہیں۔

خاکہ نگار کے لیے حق گو اور بے باک ہونا نہایت ضروری ہے۔ خاکے میں جو شخصیت جیسی ہوتی ہے، اسے من و عن ویسا ہی پیش کیا جاتا ہے، مصنف بذات خود اسے اچھا یا برا ثابت نہیں کر سکتا۔ بقول شمیم حنفی:

''خاکہ نگار محتسب نہیں ہوتا۔ اسے یہ حق حاصل نہیں کہ اپنے موضوع پر اخلاقی حکم لگائے یا فیصلہ صادر کرے۔ اسے افسانہ نگار کی طرح اپنے موضوع کی طرف خاصا رواداری کا رویہ اپنانا پڑتا ہے، تاکہ اس کی بنائی ہوئی تصویر کسی ترمیم یا اضافے کے بغیر جیسی ہے اسی شکل میں سامنے آئے۔ اس کا کام نہ تو بت گری ہے نہ بت شکنی۔ افسانہ نگار کی طرح اپنے تاثرات میں وہ قدرے مبالغہ آمیز ہو سکتا ہے مگر موضوع کی طرف ہمدردی، رواداری اور انصاف پسندی کا رویہ برقرار رکھنا چاہیے۔''[2]

علی جواد زیدی کے لکھے خاکوں کے مجموعے آپ سے ملیے کے خاکوں میں اشخاص کے انتخاب کو لے کر ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ انھوں نے ان چیدہ ہستیوں پر ہی قلم اٹھایا ہے جو اپنی عمر کی 50 دہلیز پار کر چکی ہیں۔ اس انتخاب کے پیچھے ان کا جواز یہ ہے کی یہ شخصیتیں اب مکمل ہو چکی ہیں، شخصیت کے جس رنگ میں انھیں ڈھلنا تھا اس میں ڈھل چکی ہیں اور اب ان میں پھیر بدل کی گنجائش کم ہے، اس کے علاوہ ان ہستیوں میں تجربہ کا جو رنگ موجود ہے وہ جوانی کی رنگینی سے زیادہ کارآمد ہے۔ یہ شخصیتیں ابھی اتنی قدیم بھی نہیں ہوئی ہیں کہ اس یادگار دور نے قصۂ پارینہ کی صورت اختیار کر لی ہو مگر وقت کے ساتھ ساتھ روایات اور اقدار کی صورتوں میں بدلاؤ ضرور آیا ہے اور خاکہ نگار نے ان اشخاص کا جائزہ اسی دور کے پس منظر میں رکھ کر کیا ہے۔ اس کے متعلق لکھتے ہیں:

''میں نے ہر شاعر یا ادیب کے بارے میں نہیں لکھا ہے۔ میں نے انہی ہستیوں کو منتخب کیا ہے جو کم از کم زندگی کی 50 بہاریں دیکھ چکے ہیں۔ ان کی شخصیتوں میں جوانی کی 'سیمابیت' سے زیادہ تجربہ کاری کا گداز ہے۔ یہ لوگ اس دور کی یادگار ہیں جو ابھی قصہ پارینہ تو نہیں ہوا لیکن جس کی بہت سی قدریں بدل چکی ہیں یا بدلتی جا رہی ہیں اس لیے ان کو ان ہی کے ماحول میں دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔''[3]

خاکہ نگار نے اپنے مجموعے میں کسی ایسے شخص کا مرقع نہیں کھینچا جس سے اس کی گہری شناسائی نہ رہی ہو۔ محض رسمی ملاقاتوں کو انھوں نے اپنے خاکوں کا محرک نہیں بننے دیا کیونکہ ایسا کرنا ان کی نظر میں ان اشخاص کے ساتھ ناانصافی ہوگی، کیونکہ انسان ایک ایسی مخلوق ہے جو

بہت ہی complicated ہے۔ مجموعے میں افراد کے انتخاب اور ترتیب میں کسی طرح کی کوئی خاص درجہ بندی کا خیال نہیں رکھا ہے کیونکہ ان کی نظر میں ایسا کوئی پیمانہ نہیں جس سے پیش کردہ اشخاص کی درجہ بندی کی جاسکے۔

لیکن یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ کسی دوسری شخصیت کے احساسات و جذبات کو سمجھنا ایک نہایت مشکل کام ہے، کیونکہ انسانی ذہن اتنا پیچیدہ ہوتا ہے کہ اس کی جڑ تک پہنچنا آسان کام نہیں ہے۔ انسان بذات خود ایک وسیع وعریض موضوع ہے، جس کے اندر دنیا کے تمام علوم و فنون، موضوعات و مضامین سمائے ہوئے ہیں، کیونکہ کسی انسانی شخصیت کے مطالعہ میں نہ صرف اس کی شکل و صورت اور سیرت کے بنیادی عناصر بلکہ اس کے ذہن و مزاج اور اس کے افکار اور اس کی تمام داخلی دنیا کا مطالعہ بھی ہے، جو کہ بہت نازک مطالعہ ہے۔ جس کے لیے خاکہ نگار کو وسیع مطالعہ اور عمیق مشاہدے کی ضرورت ہے، کیونکہ بعض صورتوں میں انسان خود اپنی ہی پیچیدگیوں میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔ اور اس میں پوشیدہ رازوں کو سمجھ نہیں پاتا تو دوسروں کی شخصیت کی ٹھیک ٹھیک نشاندہی مشکل کام ہے۔ یادوں کی برات میں جوش ملیح آبادی رقم طراز ہیں:

''شخصیت شناسی بڑی جان لیوا چیز ہے۔ اور سالہا سال کی بے تکلف ہم نشینی کے بعد بھی اس کا شرمیلا پن کم نہیں ہوتا۔''[4]

کردار کی خوبیوں اور خامیوں کے تئیں علی جواد زیدی کا نظریہ متوازن ہے۔ وہ فرد کی ہر برائی کو معاف کر کے ان سے خلوص ومحبت کے قائل ہیں۔ ان کی نظر برائیوں سے زیادہ اچھائیوں کی طرف گئی ہے کیونکہ اچھائی اور برائی دونوں اضافی حیثیت رکھتی ہیں، ایک ہی بات کسی خاص ماحول میں کسی کے لیے اچھائی لیے ہوسکتی ہے اور بیک وقت وہی اچھائی مختلف ماحول میں دوسرے کے لیے برائی کی حیثیت رکھتی ہو۔ ان کی نظر میں کچھ خاکہ نگار ایسے ہیں کہ جن کی نگاہ پہلے برائیوں کی طرف ہی جاتی ہے کیونکہ اس سے ان کی انا کو تسکین ملتی ہے اور وہ سوچتے ہیں کہ اگر برائیوں کو الم نشرح نہ کیا گیا تو ان کے خاکے مشکوک ہو جائیں گے اور ان کی دیانت اور غیر جانب داری پر بھی سوال کھڑا ہو جائے گا، جب کہ اچھائی و برائی، نفرت ومحبت، خلوص و وفا یہ ساری صفتیں اضافی ہیں اور مقام و ماحول میں تبدیلی کے ساتھ ہی ان کے معنی و مدارج بھی بدل جاتے ہیں۔ اس لیے ان کی اہمیت بھی Secondary ہونی چاہیے۔ لیکن کچھ انسانی اقدار و صفات ایسی ہوتی ہیں، جو Universal ہیں، اور کسی بھی حال میں بدلتی نہیں، اور صدیوں سے انسانی توجہ کا مرکز رہی ہیں۔ اس لیے اشخاص کا نفسیاتی مطالعہ ان ہی اقدار کی بنیاد پر کرنا چاہیے۔ لکھتے ہیں:

''نیکیوں کے تذکرے میں بخل زر و مال کے بخل سے بھی بڑا گناہ ہے اور برائیوں کے اظہار میں اسراف قومی بیت المال کے غبن سے زیادہ سنگین جرم ہے۔ ایک متوازن مطالعہ کے لیے دقتِ نظر کے ساتھ ساتھ وسعتِ نظر بھی لازمی و لابدی ہے۔ اس لیے میں نے برائیاں ڈھونڈ نکالنے کی کوشش نہیں کی ہے، اگر یہ قصور ہے تو میں اقبالی مجرم ہوں.... ہاں میں نے بڑے بڑے ادبا و شعراء کو بھی سطح عام پر اتارا ہے اور انھیں مندروں کی طاق پر بٹھانے کے بجائے فرش زمین پر بیٹھنے کی دعوت دی ہے۔''[5]

شخصیت کے مطالعہ کے لیے نظر کی وسعت اور

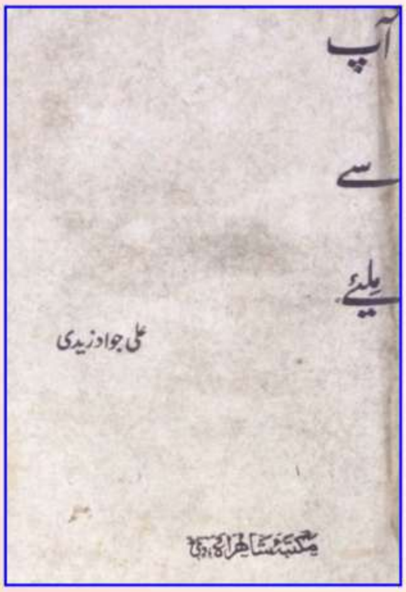

مطالعہ کا وسیع ہونا لازمی ہے اور اس معاملے میں آپ سے ملیے کے خاکے کسوٹی پر کھرے اترتے ہیں۔ علی جواد زیدی نے وسعتِ نظر کا بہترین ثبوت دیا ہے، قاری کی ملاقات اشخاص سے اس طرح کرائی ہے کہ قاری خود کو شخصیت کے قریب محسوس کرنے لگتا ہے۔ انھوں نے شخصیت کا تنقیدی مشاہدہ ومطالعہ کیا ہے۔ منتخب واقعات زندگی سے خاکوں کو دلچسپ بنایا ہے، شخصیت کے اوصاف، مزاج، عادات واطوار غرض ان کا نفسیاتی تجزیہ کر کے شخصیت کے حسین خدوخال ابھارے ہیں۔ مثال کے طور پر بھگوتی چرن ورما میں اسکیمیں بنانے کی عادت ہے لیکن اس پر عمل کی نوبت نہیں آنے پاتی، پورے خاکے میں ایک خاص قسم کی فضا ہے اور ابتدا سے ہی یہ تاثر قاری کے ذہن پر قائم ہوجاتا ہے کہ بھگوتی چرن ورما بہت ہی زندہ دل، پرخلوص بھلے مانس، شخصیت مانند جوگی، فطرت مانند بہتا پانی، کہیں ایک جگہ نہ ٹھہرنے والے، جن کے لیے زیدی صاحب نے بہت خوب کہا ہے کہ خدا کی زمین تنگ نہیں اور ان کے پاؤں لنگ نہیں، اصل میں ترقی پسند ادیب وشاعر ہیں، بناوٹی پن کا گزر نہیں سماجی اور گھریلو آدمی ہیں۔ اس مختصر سے خاکہ میں خاکہ نگار نے بھگوتی چرن ورما کی پوری زندگی ایک تھالی میں پروس دی ہے اور قاری کو صحیح معنی میں ان سے روبرو کرایا ہے۔ خاکے کی ابتدا ہی بہت پرخلوص انداز میں کرتے ہیں:

''آپ ہیں بھگوتی چرن ورما۔ ہندی کے مشہور ناول نگار، فسانہ نویس صحافی اور شاعر۔ سر سے پاؤں تک کھدر پوش، ہلکے فالسی رنگ کی عینک لگائے، بہت سا پان کھائے ایک خاص انداز میں مسکراتے ہوئے ابھی ابھی تو کمرے میں داخل ہوئے ہیں اور جھک کر اس فرشی سلام سے آپ کا استقبال کیا ہے جو مخصوص دوستوں کے لیے ہی مخصوص ہوسکتا ہے۔''[6]

اور خاتمہ بھی اسی پر اسرار مگر تعریفی وتوضیحی انداز میں کرتے ہیں:

''یہ تو تھے بھگوتی بابو لیکن اگر شری بھگوتی چرن ورما 'شاعر' کو دیکھنا ہو تو اس وقت دیکھیے جب وہ دنیا و مافیہا سب کچھ بھول کر شعر سناتے ہیں۔ جذبات میں سموئی ہوئی آواز سامعین کو مسحور کر لیتی ہے اور پڑھنے کا جوش و خروش سارے مجمع میں ایک برقی لہر سی دوڑا دیتا ہے۔''[7]

آپ سے ملیے میں شخصیتوں سے ملانے کا علی جواد زیدی کا ایک نہایت دلچسپ انداز ہے جو لوگوں کے لیے مکمل توجہ کا مرکز بنتا ہے۔ عمدہ خاکہ وہی ہے جس کو پڑھ کر افسانے جیسا مزہ آئے اور دلچسپی ابتدا تا آخر بنی رہے اس لیے ضروری ہے کہ خاکے میں وہ تمام لٹریری عناصر اس تعداد میں ہوں کہ خاکے پر بناوٹی پن کا احساس بھی غالب نہ ہونے پائے اور اس کی Orignaltiy بھی برقرار رہے:

''آپ سے ملیے۔ آپ کا اسم گرامی ہے علی عباس حسینی..... قد چھ فٹ سے کچھ لمبا' رنگ صاف' بدن دہرا' شیروانی' پاجامہ اور کالی مخملی کشتی نما ٹوپی۔ یہ ہے آپ کا ظاہری حلیہ۔ باتیں رک رک کر کرتے ہیں لیکن کہانیاں بہت تیزی سے لکھتے ہیں اسی طرح پیسہ جمع کرنے میں سست مگر خرچ کرنے میں بےحد تیز رفتار۔''[8]

اس پورے خاکے کو پڑھ کر یہ تاثر قائم ہوتا ہے کہ علی عباس حسینی ایک دیندار قسم کے آدمی تھے، فیاضی ان کے خمیر میں تھی اور جب یہی فیاضی ادبی صورت اختیار کر لیتی

تو افسانے کی تو بات ہی نہیں پورے پورے ناول لے جا کر لوگ اپنے نام سے چھپوا لیتے تھے اور یہ سب جانتے ہوئے بھی علی عباس حسینی خاموش رہنا مناسب سمجھتے تھے یا یہ کہنا بجا ہوگا کہ حسینی کو اپنی تخلیقات دوسروں کو خیرات میں دینے کی عادت تھی، اس لیے کہ علی عباس حسینی ایک انسان دوست تھے ہر ایک سے ان کا دلی رشتہ تھا، ہر شخص ان کا دوست تھا۔ بشرطیکہ وہ ان کی خودداری کے پیمانے پر کھرا اترتا ہو۔

حسینی منکسر مزاج تھے مگر یہ ظاہر بھی نہیں ہونے دیتے، مغرور نہیں تھے مگر وضعداری اور اصولوں کے ساتھ کوئی سمجھوتا نہیں کرتے، ان کی اس وضعداری اور خودداری کے سبب ہی وہ اس جائز مقام تک نہیں پہنچ پائے جس کے وہ مستحق تھے۔ درباری کی اداؤں سے بالکل نا آشنا تو نہیں ہیں 'پر طبیعت ادھر نہیں آتی' والا قصہ تھا۔ شخصیت میں ترقی پسندی تھی، معاشرے کی ہوا جس طرف کی چلی خود بھی اسی طرف چل پڑے، بدلاؤ قدرت کا نظام ہے اور حسینی صاحب قدرت سے الگ کیسے رہ سکتے، دکھاوا نہ سہی مگر غیر محسوس طور پر یہ تبدیلی ان کی شعوری زندگی میں بھی نظر آتی ہے، مادی تبدیلیاں خیالات میں بھی بدلاؤ لاتی ہیں مثلاً جب رومانیت حاوی تھی تو فرنچ کٹ داڑھی اور ایرانی ٹوپی میں نظر آتے تھے جب مقامی رنگ چڑھا تو داڑھی غائب اور مونچھیں حاضر، جب سماجوادی سدھارک ہوئے تو وہ بچے کھچے اثرات بھی غائب ہو گئے، مدلل شخصیت ہونے کی وجہ سے سبھی حامی رہتے تھے، مولوی اس لیے خوش کہ خدا کی ذات اور روحانیت سے صاف انکار نہیں اور لا مذہب اس لیے کہ حسینی مذہبی دکھاوں اور اس کے ٹھیکیداروں کی بد اعمالیوں کے خلاف تھے، اسی طرح سرمایہ دار خوش کہ حسینی مارکسسٹ نہیں اور مزدور اس لیے خوش کہ کم سے کم وہ ان کو انسان تو سمجھتے ہیں، ترک اسلام نہ کیا تو مسلمان خوش اور ہر مذہب اور ہر فکر و فلسفہ کے حامی اس لیے غیر مسلم بھی مسرور۔ کیونکہ حسینی صاحب کی زبان میں قدیم طرز لیے ہوئے جو دل آویزی ہے وہ پرانے اسکول کے لوگوں کے لیے ان میں دلکشی کا سبب ہے اور کیونکہ افسانوں میں جو ترقی پسندی کے عنصر کارفرما ہیں اس لیے موجودہ دور بھی مطمئن ہے، زندگی کا ہر رنگ ان کی رنگین طبیعت میں موجود ہے اور وہی رنگینی ان کے افسانوں کی بھی خوبی ہے۔

مجموعے کے اگلے اور نہایت دلچسپ مگر مرعوبیت کا پرتو لیے ہوئے خاکے میں جوش ملیح آبادی حاضر ہیں، علی جواد زیدی کی خاکہ نگاری کی فنکاری کا منہ بولتا ثبوت، جوش کے جن گوشوں سے انھوں نے قاری کو آشنا کرایا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ قاری ان سے انجان نہیں تھا مگر جس خوبصورتی اور مختلف نظریوں سے انھوں نے جوش کو پیش کیا ہے وہ نظریے نئے معنی اور نئی قدروں کے ساتھ سامنے آتے ہیں اور پرت در پرت جوش کھلتے جاتے ہیں اگر چہ خاکے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ علی جواد زیدی جوش سے کس حد تک متاثر تھے اور ان کے فن کے گرویدہ اور قلم کے شیدائی، اس اعتبار سے یہ خاکہ ان کے جذبات اور تاثرات کا خوبصورت سنگم ہے:

''آپ کو تو آپ جانتے ہی ہیں۔ ہاں، ہاں، حضرت جوش ملیح آبادی، شاعر انقلاب و قبلہ رندان جہاں۔ یہ دونوں صفتیں آپ میں اس طرح بیک وقت جمع ہوگئی ہیں جیسے دونوں کا وجود ہی توام ہو، آپ کو ان دونوں صفتوں کے باعث ہندستان اور پاکستان میں بے شمار لوگ جانتے ہیں جن میں پڑھے لکھے لوگ بھی ہیں اور جاہل بھی، شرتی بھی ہیں اور عربی بھی، علمائے اعلام بھی ہیں اور ملحدین کرام بھی وہ بھی جو زبان و ادب کے صحیح نباض ہیں اور وہ بھی جو اردو نہیں جانتے مگر جوش کو مانتے ہیں۔''[9]

علی جواد زیدی خاکے میں لکھتے ہیں کہ جوش کو جاننے کے بعد بھی ان کا گرویدہ نہ ہونا بہت مشکل ہے۔ یہ ان کی مرعوبیت ہی تھی جو ان کو سمجھنا مشکل ہو رہا تھا کہ آخر جوش کی تنقیص کیسے ہوسکتی ہے کیونکہ جوش جیسی انصاف پسند طبیعت کی برائی تو ناممکن ہے مگر پھر بھی ایسے لوگ ہیں جو اس کام کو بخوبی انجام دیتے ہیں، ایک طرف جوش کے حرف آخر کا مقصد خدا شکنی ہے مگر وہیں دوسری طرف جوش کے فکر و فلسفے کی تہہ میں چھپے اس معصوم ذہن کو دیکھیں تو وہاں خدا شناس دل دھڑکتا نظر آئے گا، بظاہر لا مذہبیت کا لبادہ اوڑھے اس شخص کے پیچھے موجود وہ شخص لا مذہبی ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ اس کی پرورش جس ماحول میں ہوئی ہے وہاں اس کی گنجائش مشکل ہے، ہاں خدا کسی اور روپ اور شکل میں ضرور دکھائی دے سکتا ہے یہاں وہ رحیم ہے رحمٰن ہے یا حبیب ہے۔ اس لیے نہ تو وہ لا مذہبی ہے نہ دہریہ بلکہ اس کے سینے میں ایک ہمدرد، حساس اور پرخلوص دل ہے، وہ تمام خوبیاں جن کا مجموعہ مذہب ہوسکتا ہے، جوش میں موجود ہیں اور اس کے لیے کسی مذہب کا تمغہ لگا ہونا ضروری نہیں کیونکہ وہ اتنا طاقتور بھی نہیں کہ کسی کا ضمیر بدل سکے۔ اور جوش جیسا دوست رہبر، بے ریا، بے لوث، مخلص دوست، فلسفۂ کائنات جس کے دل میں ہو نہ کہ دماغ میں، وہاں ایسے مذہب کی کوئی گنجائش نہیں، جو دماغوں کو ماؤف کرکے ان کے روشندانوں میں جالے بن دے:

''جوش دوست ہے اور بڑا بھولا بھالا دوست، سیدھا سادہ بے لوث، بے ریا۔ نہ چلت نہ پھرت، نہ داؤں نہ پیچ، نہ کاٹ نہ کپٹ۔ اسی لیے اس کی محبت کے مطالبات میں سخت گیری بھی بہت ہے۔ وہ محبت کے جواب میں ویسی ہی بے ریا محبت چاہتا ہے اور ایک بچے کی طرح معمولی بات پر روٹھ جاتا ہے اور اس طرح کہ منانا مشکل ہو جائے۔''[8]

زیدی صاحب نے اپنے ہر خاکے میں مہر و وفا، دوستی، خلوص، اخلاق غرض کہ تمام انسانی قدرں کو پیش پیش رکھا ہے، شخصیت میں چھپی ان تمام خوبیوں کو اپنے خاکے میں پوری توجہ کی ہے، وہ چاہے بھگوتی چرن ورما ہوں یا علی عباس حسینی یا پھر جوش، ان کی نظر ان انسانی خوبیوں پر پہلے جاتی ہے، ان کو ہر کوئی ہمدرد نظر آتا تھا اس کے باوجود اگر کوئی خامی ہو بھی تو وہ اسے اس انداز میں پیش کرتے ہیں کہ وہ بری نہیں لگتی اسے بھی وہ اچھائی میں لپیٹ کر اس طرح پیش کرتے ہیں کہ قاری کو گراں نہیں گزرتی۔ مثال کے طور پر ڈاکٹر عابد حسین بہت ہی شریف بالکل اللہ میاں کی گائے ہیں تو کیا یہ ان کی خامی ہے، اس لیے کہ وہ سب سے پیار کرتے ہیں، عابد حسین ماڈرن لیکن بیک وقت خاصے قدیم بھی ہیں اور اللہ میاں کی گائے ہیں تو جہاندیدہ انسان بھی تو ہیں۔ علی عباس حسینی صلح کل اور متوازن طبیعت کے مالک ہیں۔ شخصیت کی جاذبیت میں زیدی صاحب کو کوئی کمی نظر نہیں آتی، پھر جو بات انسانی قدروں کی ہو تو شخصیت اور بھی نکھر جاتی ہے جیسے ان کی مہمان نوازی، بلا کے ذہین، اور بڑے سخی۔ غرضیکہ اسی طرح انھوں نے اپنے ہر کردار کی خامیوں کو خوبیوں کی شکل میں بہت ہی دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے۔ علی جواد زیدی نے ان اشخاص کی صرف زندہ قلمی تصویریں ہی نہیں کھینچی ہیں، بلکہ ان کے علمی اور ادبی کارناموں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ آنند نارائن ملا کی شخصیت کو اس طرح قلمبند کیا ہے:

''ملا میں زندہ دلی ہے، اخوت ہے، ہمدردی ہے، انس و محبت ہے۔ اصل میں ملا ذرا اظہار خیالات و جذبات میں ضرورت سے زیادہ محتاط ہیں۔ وہ ہر مظاہرہ سے گھبراتے ہیں اور اس طرح ایک بہت بڑے گروہ کو ایک نا خوشگوار فریب میں مبتلا کیے ہوئے ہیں...... مانا کہ دل میں بہت کچھ ہے مگر کسی نہ کسی طرح اس کا اظہار بھی تو ہونا ہی چاہیے۔ الفاظ ساتھ نہیں دیتے تو آنکھوں سے، تکلفات سے، رسمیات سے یہ ظاہر ہو جانا چاہیے کہ اس خامشی کے پس پردہ ایک خلائے محض نہیں ہے۔''[11]

شاعر، وکیل، موسیقی و رقص کے دلدادہ، کلب اور کافی

ہاؤس کی نشستوں میں شرکت، مشاعرے، ادبی محفلیں، وضعدار، شریف، اصول پسند، بلند خیال، ترقی پسند اور آزاد رو یہ تھی آنند نارائن ملا کی شخصیت۔ ان میں نہ تو خلوص کی کمی تھی نہ جرات کی اور نہ دوستوں کی، بہت حساس طبیعت کے مالک تھے، اقدار کا احساس، ماحول و معاشرہ کا احساس اور اسی معاشرے میں اپنا اور اپنے دوستوں کے مقام کا احساس بہت گہرا ہے، ہر بات کو جانچنے پرکھنے کی عادت، دوستوں سے نزدیکی کے بعد بھی ایک دوری کا احساس، لوگوں سے دور مجمع سے دور معاشرہ سے کنارہ کشی کیے ہوئے آنند نارائن ملا، معاشرہ میں ایک حد تک ان خوبیوں کو تکبر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے مگر زیدی صاحب کی نگاہ میں اسے وضعداری کا نام دیا گیا ہے، جس میں غرور نام کا نہیں، بیزاری کا شائبہ تک نہیں اور اسے وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جنھیں ان کے قریب رہنے کا موقع ملا ہو:

”ملا کے دوستوں کا حلقہ بہت وسیع نہیں ہے۔ وہ بڑے سلجھے ہوئے لوگوں میں ہیں، غور و فکر، نقد و نظر، جانچ اور پرکھ کے قائل۔ دوستی بھی بہت جانچ اور پرکھ کر کرتے ہیں۔ ان کے ملاقاتی تو بہت سے ملیں گے لیکن دوست نسبتاً تھوڑے۔ یہ تھوڑے سے دوست ملا ہی کی طرح سچے اور خیر خواہ ہیں“[12]

علی جواد زیدی کے خاکوں کی زبان ادبی اور فنکارانہ ہے۔ لفظوں کے انتخاب میں عامیانہ پن نہیں ہے، موقع اور مناسبت سے بیچ بیچ میں اشعار کا انتخاب نہایت موزوں ہے، اشاروں اور کنایوں سے بھی کام نکالتے ہیں مگر عبارت میں جھول نہیں آنے دیتے ہیں، خاکوں میں دلچسپی پیدا کرنے کی غرض سے ڈرامائی عنصر بھی لاتے ہیں۔ نیاز فتحپوری کا تعارف وہ کچھ اسی انداز میں کرتے ہیں:

”نیاز فتحپوری کا نام آتے ہی ماہ و سال کے ورق پر ورق الٹنے لگتے ہیں اور واقعات و حادثات کی موافقت و مخالفت کی ہنگامہ زائی و ہنگامہ آرائی کی داستانیں تصور کے پردۂ سیمیں پر حرکت کرنے لگتی ہیں ان کی زندگی ایک کھلی کتاب ہے جسے جو پڑھنا چاہے پڑھ سکتا ہے۔“[13]

بیسویں صدی کے نوجوانوں کے دل کی دھڑکن جگر مرادآبادی اپنے دور کے بہت ہی مقبول و مشہور شاعر گزرے ہیں اور ان کی اس مقبولیت کا سبب محض ان کی دلکش آواز ہی نہیں ان کی غزلوں کا صحتمند لہجہ بھی تھا۔ اگر چہ ان کا حلیہ اور شکل وصورت دیکھ کر لوگوں کو مایوسی ہوتی تھی، تیز پختہ رنگ اس پر چیچک کے داغ جس نے چہرے کی گلکاری میں مزید اضافہ ہی تھا مگر اس حلیہ کو بھی خاکہ نگار نے کس قدر پرکشش بنا کر پیش کیا ہے کہ اس ریگستان میں بھی خوشنما نخلستان کھلا دیا ہے۔ جگر جتنا اپنی غزلوں کے لیے ہر دل عزیز ہیں ان کی اس شہرت میں ان کی رندانہ سرمستی کا بھی اتنا ہی دخل ہے۔ لوگ اپنے غموں کی آڑ میں پیتے ہیں اور غم غلط کرتے ہیں مگر جگر کی کیفیت تو پی کر اور زیادہ مغموم ہو جانے والی ہوتی تھی۔ مگر پھر جب یہ عادت چھوڑی تو پھر کبھی منہ سے نہ لگائی، جگر نے محبت کی، ٹوٹ کر کی، محبت کے دلدادہ جگر نے نہ صرف محبت کی بلکہ اسے آخری حد تک نبھایا، چوٹ بھی کھائی تڑپے بھی، مگر محبت کی ان چنگاریوں کو سینے میں سجا کر رکھا:

”جگر اب رند نہیں، عاشق مہجور نہیں مگر اب بھی شاعر، تاش نواز اور دوست ہیں۔ مذہب شناس پہلے بھی تھے اب عبادت گزار بھی ہیں، کل تک صرف رونق بزم تھے اب رونق محراب بھی ہیں۔ ایسے محسوس ہوتا ہے کہ یا تو جگر کو کوئی ایسی کھوئی ہوئی چیز واپس مل گئی ہے جس کی انھیں مدتوں سے تلاش تھی اور جس میں وہ مدتوں محو سرگرداں رہے ہیں یا انھوں نے کوئی ایسی پائی ہوئی چیز کھو ڈالی ہے جس کا تعلق ظاہر سے کم باطن سے زیادہ ہے۔“[14]

دربارداری کے ہنر سے نا آشنا جگر کبھی کسی دربار سے وابستہ نہیں ہوئے اس کی وجہ تھی ان کی وضعدار

جگر اب رند نہیں، عاشق مھجور نھیں مگر اب بھی شاعر، تاش نواز اور دوست ھیں۔ مذھب شناس پھلے بھی تھے اب عبادت گزار بھی ھیں، کل تک صرف رونق بزم تھے اب رونق محراب بھی ھیں۔ ایسے محسوس ھوتا ھے که یا تو جگر کو کوئی ایسی کھوئی ھوئی چیز واپس مل گئی ھے جس کی انھیں مدتوں سے تلاش تھی اور جس میں وہ مدتوں محو سرگرداں رھے ھیں یا انھوں نے کوئی ایسی پائی ھوئی چیز کھو ڈالی ھے جس کا تعلق ظاھر سے کم باطن سے زیادہ ھے۔

شخصیت اور اس پر مزاج میں جاگیردارانہ پن، انھیں اپنے فن اور مرتبہ کا پورا احساس رہتا تھا اور کبھی بھی کسی ایسے شخص کی رسائی ان کے دربار تک نہیں ہوئی جس نے فن کو ترجیح نہیں دی۔ اسی فن کی بدولت شاعری میں انھوں نے جو نام پیدا کیا ان کے ہم عصروں میں انھیں زندہ تابندہ کر دیا:

”اگر زمانہ اپنی خوئے تغیر نہیں بدلتا تو جگر اپنی وضع کیوں بدلیں ؟ وہ ایسے وضعدار ہیں کہ نوجوان ان کی طرف انگلیاں اٹھاتے ہیں اور بزرگ کہتے ہیں کہ 'اس طرح کے بندے اب خدائی میں چند ہی رہ گئے ہیں۔“[15]

”گذشتہ ربع صدی میں کتنی ہی ادبی تحریکیں چلیں، قدیم و جدید کی بحثیں چھڑیں ترقی پسند و رجعت پسند کی حدیں قائم کی گئیں، شاعری کا رخ بدل گیا، تنقید کے معیار تبدیل ہو گئے لیکن جگر نے اپنے قوت بازو سے، اپنے جوہر ذاتی سے محفل ادب میں جو مختلف جگہ بنالی تھی وہاں سے انھیں اٹھانے کی کوئی ہمت بھی نہ کر سکا۔ الفاظ کی شکل میں مخالفتوں کے طوفان بہت اٹھے لیکن صفحہ تاریخ پر جگر کا نقشہ گہرا ہی ہوتا گیا۔ پوپلے منہ سے نکلی ہوئی پھونکوں سے زندہ ادب کے چراغ گل نہیں ہوا کرتے۔ متحدہ ہندستان میں کراچی سے کلکتہ تک اور کشمیر سے راس کماری تک جگر کی پکار ہوئی ہے اور دھوم مچی ہے۔ جس مشاعرہ میں بھی جگر پہنچ جاتے مشاعرہ لوٹ لے جاتے۔[16]

ضلع اناو کے رہنے والے سادہ اور نیک فطرت، بناوٹ اور دکھاوٹ سے دور، جامہ ذیب، لباس اور رہائش کے معاملے میں نفاست پسند، خوش خوراک، صاف ستھری طبیعت اور صاف ستھرے مزاج کے مالک اور طبیعت سے صوفیانہ پن کی طرف مائل مسعود حسن رضوی ادیب سے ملانے کے لیے خاکہ نگار نے تھوڑی مسافت اور تھوڑا صبر سے کام لینے کو کہا ہے، لکھنؤ سے والہانہ محبت رکھنے والے مسعود حسن رضوی ادیب پر یہ فقرہ صادق آتا تھا کہ لکھنؤ ہم پر فدا اور ہم فدائے لکھنؤ۔ مرثیوں سے خاص لگاؤ تھا جب کہ وہ نہ تو مرثیہ گو تھے اور نہ مرثیہ خواں، مگر مرثیہ کی تاریخ، تفسیر اور تنقید پر آپ کا تحقیقی کام مرثیہ کا مطالعہ اور اس پر تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کے کتب خانے میں جو کہ ضخیم اور نادر کتابوں کا نایاب گلدستہ ہے، اس میں انھوں نے مرثیوں کے نایاب اور کمیاب نسخوں کو زمانے کی زبوں حالی اور زوال سے محفوظ کر کے رکھا ہے۔ اس کتب خانے میں مرثیوں کے علاوہ واجد علی شاہ پر بھی نایاب اور بیش بہا کتابوں کا خزانہ موجود ہیں:

”دنیا کے سب سے بڑے مرثیہ نگار انیس کے حالات زندگی اور کلام کا تو کوئی پہلو ایسا نہ ہوگا جو آپ کی نظر تحقیق سے بچ رہا ہو۔ مشہور ہے کہ سکندر اعظم کے پہلو میں اگر مشہور رزمیہ 'الیڈ' کا نسخہ نہ ہو تو اسے نیند نہیں آتی تھی۔ مسعود صاحب کے پہلو میں بھی اگر انیس کے مرثیہ نہ رہتے ہوں تو ان کی آنکھیں محروم خواب رہتی ہوں گی۔“[17]

مسعود حسن رضوی ادیب کی شخصیت بھی کم و بیش ان ہی اوصاف کا مجسمہ تھی جو خوبیاں باقی کی شخصیتوں میں موجود ہیں۔ وہ سنجیدگی اور متانت کا ایک حلقہ اپنے اطراف

اس طرح بنا لیتے ہیں کہ دوسروں کی ان تک رسائی ہی مشکل ہو جاتی ہے پھر بھی خاکہ نگار نے انھیں مردم بیزار یا مغرور نہیں گردانہ ہے، طبیعت سے وہ یار باش نہ سہی مگر دوستوں کا ایک جمگھٹ ان کے آس پاس موجود رہتا تھا، جس میں ہر قسم کے لوگ تھے، ایک طرف وہ نواب بھی شامل تھے جو چنیا بیگم کے عاشق تھے، تو وہیں ان میں سابق خاندان شاہی کے چشم و چراغ بھی ہیں، اخباروں کے مدیر، اسکول اور کالجوں کے مدرس بھی ہیں، طبیب، مغنی، شاعر، افسانہ نگار، نقاد، داستان گو، مرثیہ خواں بھی ہیں اور مرثیہ گو بھی۔

خاکوں میں مولانا عبدالماجد دریابادی کا خاکہ بھی بہت دلچسپ اور معلوماتی ہے۔ مولانا دریاباد کے ایک علم دوست اور کھاتے پیتے گھرانے میں پیدا ہوئے۔ جہاں لوگ دیندار تھے، اسلامیات اور دینیات کے پابند تھے۔ ان کے متعلق زیدی صاحب لکھتے ہیں:

''اس کے آگے ادب کی منزل ہے۔ ارباب نظر گلستاں سے بہار کا اندازہ کر لیں۔ مولانا عبدالماجد کی سیرت کے ابھی کتنے ہی پہلو ہیں جو ضبط تحریر میں نہیں آسکے لیکن ایک پہلو یقیناً قابل ذکر ہے آپ کا جذبہ احتساب۔ اپنے طنز سے مولانا نے دنیا کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ کسی مغربی ملک میں طلاقوں کی تعداد بڑھ جائے، پاکستان میں بے پردہ لڑکیاں اسٹیج پر آئیں، مصر میں آزاد خیالی کے مظاہرے ہوں، مولانا خوردبین لگائے سب دیکھتے رہتے ہیں اور انھیں وہ اپنے طنزیہ تیروں کا نشانہ بناتے رہتے ہیں۔ اصلاح کا کام کاش اتنا ہی آسان ہوتا۔ غالباً اسی موقع کے لیے غالب نے کہا تھا ...'نکالا چاہتا ہے کام طعنوں سے اے غالب'۔ جذبہ احتساب سے مغلوب ہو کر مولانا نے بڑی قلمی جنگیں کی ہیں۔ کاش ان کا یہ علمی جہاد کسی ترقی پسند قومی و عالمی تحریک کو بڑھاوا دینے کے لیے ہوتا۔''[18]

اثر لکھنوی کا پورا نام مرزا جعفر علی خاں اثر ہے۔ ماں باپ کی اکیلی اولاد تھے لہٰذا دونوں کے بہت دلارے تھے۔ بچپن میں اثر کو کنکوے بازی کا بہت شوق تھا لیکن علم و تعلیم کا سلسلہ بدستور جاری رہا، اور تعلیم ختم ہوتے ہی ڈپٹی کلکٹر ہو گئے مگر نہ تو ان کے شغل میں کوئی فرق آیا اور نہ تو سلسلہ شاعری میں، وہ بدستور جاری رہا۔ ان کی زندگی خانوں میں تقسیم تھی اور ہر خانے میں اسی مناسبت سے مہرے فٹ کیے گئے تھے اور ہر مہرا اپنی جگہ بہت ہی مکمل اور با اثر تھا۔ عدالت میں وہ ڈپٹی کلکٹر، گھر میں مرزا جعفر علی خاں، مشاعروں میں اثر، ساتھیوں کے بیچ مخلص دوست، عالموں کے درمیان ایک با وقار ادیب کے رول میں رہتے تھے۔ اس کے متعلق خاکے میں ایک جگہ رقم ہے:

''اثر شاعر بھی ہیں تھے اور سرکاری عہدیدار بھی، لیکن نہ تو انھوں نے شاعری کو فرائض منصبی کا راستہ روکنے دیا اور نہ فرائض منصبی کو شاعری کی سلطنت میں دخیل ہونے دیا۔ شعر و ادب کی بھی خدمت کرتے رہے اور قانون و انصاف کی بھی۔ آپ کے ضخیم مجموعہ ہائے کلام اور ذخائر مضامین نثر کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ دن بھر کچہری کی جھک جھک اور صبح و شام سرکاری کام سے ملنے والوں کے ہجوم سے نبرد آزمائی کے بعد بھی وہ اتنا وقت کیسے نکال لیتے تھے۔ شوق مطالعہ اس پر مستزاد تھا۔ فلسفہ و ادب آپ کے پسندیدہ موضوعات ہیں۔''[19]

انیس احمد عباسی کا خاکہ اس مجموعے کا آخری خاکہ ہے جس کی ابتدا انھوں نے ان کی شکل و شباہت حلیہ و لباس اور وضع قطع سے کیا ہے۔ انیس احمد عباسی کا بچپن تنگ حالی میں گزرا، والد کی تنخواہ دو وقت کی روٹی کے لیے بھی کم پڑتی تھی۔ اس تنگ دستی کے عالم میں انیس احمد عباسی اور ان کے بڑے بھائی گھر میں ٹیوشن پڑھا کر گھر اور اپنی پڑھائی کا خرچ پورا کرتے تھے۔ شروعاتی پریشان حالی نے ان کا مزاج ایسا بنا دیا تھا کہ دوست احباب، خاندان، آس پڑوس کسی کی بھی پریشانی ان کو اپنی پریشانی لگتی تھی اور اسے دور کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے تھے۔ ان کی زندگی میں وفاداری بشرط استواری اصل ایماں تھی:

''مذہب کے معاملے میں بہت آزادہ رو ہیں۔ جس زمانے میں لکھنؤ کے بیشتر مسلمان، کٹر شیعہ یا کٹر سنّی کے دو خانوں میں نبٹ گئے تھے، انیس صاحب کو دونوں اپنا جانتے تھے۔ انیس صاحب کے ساتھ سب سے بڑا مذاق کسی نے یہ کیا کہ انھیں قادیانی مشہور کر دیا۔ یہ بے چارے مرنجان مرنج قسم کے حنفی العقیدہ مسلمان ہیں، کسی بات پر انھوں نے احمدیوں کا ساتھ دے دیا ان کے کسی مقدمے کی کارروائی اپنے اخبار میں چھاپ دی بس قادیانی مشہور ہو گئے اور یہ بات الیکشن میں ان کے خلاف استعمال کی گئی۔''[20]

علی جواد زیدی کے خاکوں کی سب سے بڑی خوبی ان کی زبان اور انداز بیان ہے۔ زبان میں چٹخارے کا لطف موجود ہے۔ اپنی کتاب ہندستانی ادب کے معمار میں وضاحت حسین رضوی ان کے اس فن کے متعلق ایک جگہ لکھتے ہیں:

''ان کے لکھے ہوئے خاکوں میں ندرت، جدت اور فیاضی سے کام لیا گیا ہے۔ آپ سے ملیے کے خاکوں میں یہ اوصاف اپنی پوری جلوہ فرمائی کے ساتھ موجود ہیں۔ زبان نہایت فنکارانہ اور ادبی استعمال کرتے ہیں۔ اشاروں اور کنایوں سے کام لیتے ہیں۔ لفظی صنعتوں سے کام لیتے ہیں اور الفاظ کے انتخاب کا خاص اہتمام کرتے ہیں۔ علامتوں کا بھی استعمال کرتے ہیں۔''[21]

مندرجہ بالا تمام خاکوں میں کئی یکسانیت نظر آتی ہے مثلاً پیش کردہ سبھی شخصیتیں ایمانداری، خلوص، مخلص دوستی، وفا شعاری، خودداری جیسے تمام انسانی اوصاف سے لبریز تھیں یا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ خاکہ نگار نے ان اوصاف کو ہی پیمانہ بنایا ہو اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ خامیاں انھیں نظر ہی نہ آئی ہوں یا انھیں جان بوجھ کر نظر انداز کر دیا گیا ہو۔ دوسری بات یہ کہ تمام اشخاص بہت ہی وضع قطع والے اشراف رہے ہیں۔ کسی شخصیت میں کسی بھی طرح کا کوئی شگاف دکھائی نہیں دیتا، زیادہ تر شخصیتیں فرشتہ صورت ہیں اور کسی بھی طرح کا کوئی عیب ان میں نہیں ہے، جب کہ ہر شخصیت خوبیوں اور خامیوں کا مجسمہ ہوتی ہے۔

ان کے خاکے اگرچہ تکنیکی لحاظ سے مکمل ہیں، لیکن اسلوب، واقعات کی ترتیب، اشخاص کے مطالعے اور ان کے جمالیاتی اوصاف کے نقطۂ نظر سے ان کے خاکے کمزور نظر آتے ہیں۔

حواشی

1۔ چند ادبی شخصیتیں: شاہد احمد دہلوی، ص 14-13، مکتبہ جدید، نئی دہلی اشاعت 2003

2۔ آزادی کے بعد دہلی میں اردو خاکہ مرتبہ شمیم حنفی، ص 11، اردو اکادمی دہلی اشاعت 1991

3۔ آپ سے ملیے، علی جواد زیدی، صفحہ 9، مکتبہ شاہراہ دہلی، اشاعت 1963

4۔ یادوں کی برات، جوش ملیح آبادی صفحہ، شان ہند پبلیکیشن نئی دہلی اشاعت 1992

6۔ آپ سے ملیے، علی جواد زیدی، ص 11، مکتبہ شاہراہ دہلی، اشاعت 1963

6۔ ایضاً، ص 15 — 7۔ ایضاً، ص 21

8۔ ایضاً، ص 23 — 9۔ ایضاً، ص 3

10۔ ایضاً، ص 35 — 11۔ ایضاً، ص 66-65

12۔ ایضاً، ص 61 — 13۔ ایضاً، ص 116

14۔ ایضاً، ص 77 — 15۔ ایضاً، ص 75

16۔ ایضاً، ص 69 — 17۔ ایضاً، ص 81

18۔ ایضاً، ص 146 — 19۔ ایضاً، ص 154

20۔ ایضاً، ص 174

29۔ ہندستانی ادب کے معمار: وضاحت حسین رضوی، ساہتیہ اکادمی دہلی اشاعت 2011

■

Dr. Guljabeen Akhtar Ansari
Assistant Professor, Dept. of Urdu
Lal Bahadur Shastri PG College
Mughal Sarai, Chandauli - 232101 (UP)

ارشد احمد کوچھے

اخترِ مسلمی کی شاعری میں موضوعاتی تنوع

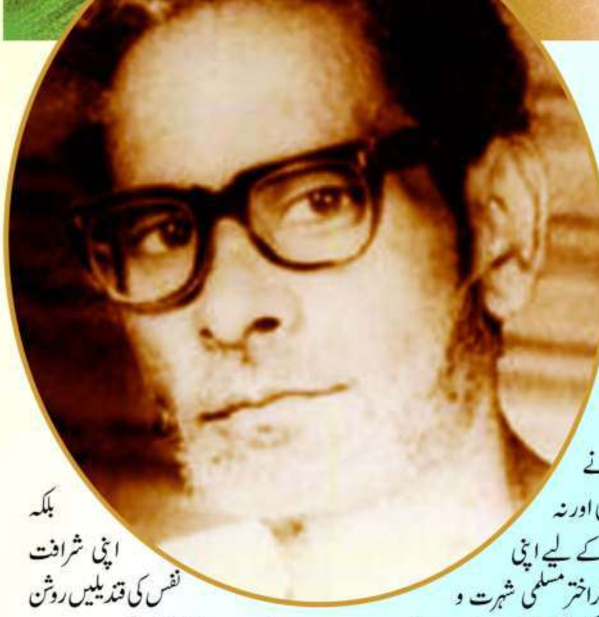

اخترِ مسلمی اردو ادب کے ایک ایسے شاعر ہیں جن کے نام سے کم لوگ واقف ہیں۔اخترِ مسلمی کی گمنامی کی وجہ ان کی معیاری یا غیر معیاری شاعری نہیں ہے۔ بلکہ اس کی اصل وجہ ایک تو ناقدین کی کم توجہ اور دوم اخترِ مسلمی کی ذات گرامی ہے۔ وہ ایک مستغنی الاحوال اور قانع شخص تھے انھوں نے نہ کبھی مشہور ہونے کی خواہش ظاہر کی اور نہ ہی شہرت و مقبولیت حاصل کرنے کے لیے اپنی خود داری پر کبھی آنچ آنے دیا۔ اگر اخترِ مسلمی شہرت و مقبولیت کی طرف مائل ہوتے تو وہ کسی بھی تحریک کے جھنڈے تلے آسانی سے اپنی شہرت کا پرچار کر سکتے تھے۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ ان کی طبیعت ان چیزوں کی طرف مائل نہ ہوئی۔ اس لیے وہ کسی تحریک یا ازم کے تابع ہونے کے بجائے آزادانہ طور پر اپنے خیالات و جذبات کا اظہار کرتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ اخترِ مسلمی شہرت و مقبولیت کے اُن میناروں کو نہ چھو سکے۔ ڈاکٹر ناطق اعظمی ان کی شخصیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اختر صاحب نے کبھی شہرت کی فصیلوں پر کمند ڈالنے کی کوشش نہیں کی بلکہ شہرت کی فصلیں خود آ کر ان کے قدموں میں گری ہیں، مگر انھوں نے اس سے بھی گریز کیا ہے، حالاں کہ بارہا ایسے مواقع ان کے ہاتھ لگے ہیں، اگر وہ چاہتے تو شہرت اور دولت دونوں حاصل کر سکتے تھے۔ صرف شہرت کے لیے انھوں نے اپنے ضمیر کا سودا کر کے نہ تو کسی کا حاشیہ بردار بننا پسند کیا اور نہ خود داری کو قربان کر کے کسی گروہ یا مدرسۂ فکر کے ہمنوا بنے، بلکہ اپنی شرافت نفس کی قندیلیں روشن کیے ہوئے مایوسیوں، محرومیوں، حق تلفیوں کی راہوں میں کبھی مسکرا کر حالات پر طنز کرتے ہوئے کبھی آنکھیں نم کر کے گداز دل کا ثبوت دیتے ہوئے ہمت و استقلال کا پرچم لہراتے ہوئے گزرتے رہے۔''

(کلیاتِ اخترِ مسلمی: (مرتب) فہیم احمد۔ دانش فراہی، رام لیلا میدان، سرائے میر، اعظم گڑھ، یوپی، 2013، ص 29)

اخترِ مسلمی ایک بالیدہ شاعر ہیں۔ ان کو نہ صرف اپنی شخصیت پر ناز تھا بلکہ اپنے فن پر بھی بے پناہ بھروسہ تھا۔ اس لیے انھوں نے اپنے آپ کو کسی ادبی و شعری رجحان تک محدود نہیں رکھا۔ انھوں نے اگرچہ ترقی پسند تحریک، جدیدیت، مابعد جدیدیت جیسے فکری رجحانات دیکھے، ان کے فکری پہلوؤں کو سمجھا، ان کے جذبات کو محسوس کیا۔ لیکن ان تمام چیزوں سے اپنے آپ کو دور رکھا۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ کسی تحریک یا رجحان کے زیرِ نگیں رہنا اپنے آپ کو پابند سلاسل کر دینے کے مترادف ہے۔ اس لیے انھیں وقتی پروپگنڈہ سمجھ کر نظر انداز کر دیا اور خود اپنے دل پہ گزری ہوئی باتوں کو رقم کرتے رہے۔ جو ان کی خودداری اور خود اعتمادی کی بہترین مثال ہے۔

اخترِ مسلمی گوناگوں شخصیت کے مالک تھے۔ وہ خارجی طور پر جتنے خوش گلو تھے اتنا ہی اندرونی طور پر سلیم القلب بھی تھے۔ جب بھی کسی سے ہم کلام ہوتے تھے تو اسے اپنی شخصیت اور شیریں زبانی سے متاثر کیے بغیر نہیں چھوڑتے۔ ان کی زبان میں وہ مٹھاس اور حلاوت تھی جس کو اگر کوئی ایک بار سنتا تو وہ اس کو بار بار سننے کے لیے آتش زیرِ پا ہو جاتا تھا۔ جب وہ کسی مشاعرے میں جاتے تھے تو اپنے ترنم سے پوری محفل پر چھا جاتے تھے اور مشاعرہ سننے والے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیتے تھے چاہے وہ شاعر حضرات ہوں یا سامعین کرام۔ اخترِ مسلمی اس خوبی پر نہ صرف خود ناز کرتے تھے بلکہ ان کے ہم عصر بھی ان کی اس خوبی پر فخر کرتے تھے۔ پہلے شعر ملاحظہ فرمائیں کہ کس طرح شاعر اپنی خوبی کو خود ہی شاعری کے پیرائے میں بیان کرتا ہے:

عناد و بغض کو دل میں جگہ نہ دی میں نے
خلوص دل سے ملا جب کسی بشر سے ملا

اخترِ مسلمی کا شعری خزانہ کل تین مجموعے ہیں۔ اگرچہ کامیابی کے لیے ایک غزل درکار ہوتی ہے۔ بہرکیف ان کے تین مجموعے ہیں۔ جن میں 'موجِ تبسم' اور 'موجِ صبا' انفرادی طور پر ان کی حیات ہی میں شائع ہوئے۔ جب کہ تیسرا مجموعہ 'جامِ سنداں' ان کی وفات کے بعد 'کلیاتِ اخترِ مسلمی' میں منظر عام پر آیا۔ جو فہیم احمد نے مبصرین کے خیالات کے ساتھ 2013 میں مرتب کیا۔ فہیم احمد حرفِ مرتب میں اخترِ مسلمی کی شاعری کی صلاحیتوں کے بارے میں اپنے خیالات ظاہر کرتے ہوئے ان کے ارتقائی منازل کو اس طرح سراہتے ہیں:

''تینوں مجموعوں میں شاعر کے رجحانات کی ارتقائی شکل بخوبی نظر آتی ہے۔ انھوں نے نہ صرف صنفی تقاضوں کو ملحوظِ خاطر رکھا بلکہ موضوعات کے انتخاب میں بھی گہری فہم و فراست کا ثبوت دیا ہے۔ مجموعی طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ اخترِ مسلمی ایسے کہنہ مشق شاعر ہیں جو صحت مند روایات کی بنیاد پر جدید خیالات کی عمارت تعمیر کرتے ہیں، اور یہی چیز ان کی شاعری کی اہمیت و افادیت کو ہمیشہ برقرار رکھے گی۔'' (ایضاً، ص 6)

اخترِ مسلمی غزل گو شاعر ہیں وہ غزل کے تمام اسرار و رموز کے ساتھ ساتھ غزل کی فطری نزاکتوں اور لطافتوں سے بخوبی واقف ہیں۔ غزل جو کہ اردو شاعری کی ایک نازک اور لطیف صنف ہے۔ اس میں کمال حاصل کرنا ہر

کسی کے بس کی بات نہیں ہے یعنی غزل کے فنی تقاضوں کو سمجھنا اور پھر ان کا شاعری میں اس طرح استعمال کرنا کہ قاری داد دینے پر مجبور ہو جائے۔ اختر مسلمی کی شاعری کو پڑھ کر یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ وہ نہ صرف غزل کے فنی تقاضوں سے واقف ہیں بلکہ ان کو برتنا بھی خوب جانتے ہیں۔ ان کی شاعری میں وہ تمام خصوصیتیں پائی جاتی ہیں جو ایک اچھے شاعر کے کلام میں ہونی چاہیں۔ ان کی شاعری کا مطالعہ کرنے کے بعد اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ انھوں نے جہاں غزل کی تزئین کا خیال رکھا وہیں زندگی کے خارجی حالات کو بھی ملحوظِ خاطر رکھا۔ انھوں نے زندگی کے مسائل سے روگردانی یا فرار حاصل نہیں کیا بلکہ ان کو غزل کے پیرائے میں منضبط کر کے انھیں حیات جاوید عطا کیا ہے۔ پروفیسر ملک زادہ منظور احمد ان کی غزلیہ شاعری کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''اُن کی غزلیں اپنے تغزل و ترنم، اپنی والہانہ ربودگی اور اپنے غنائی آہنگ کی بناء پر ہمارے لیے باعث فخر ہیں۔ انھوں نے اپنے کلام میں اگر ایک طرف گیسوئے دوست سنوارا ہے اور حسن کی تزئین کے فرائض انجام دیے ہیں تو دوسری طرف انھوں نے خارجی محرکات کو بھی نظرانداز نہیں کیا ہے اور حالاتِ حاضرہ اور زندگی کے دوسرے مسائل سے چشم پوشی نہیں کی ہے۔ اُن کی غزلوں میں تازگی و توانائی، تاثر و شعریت کے ساتھ ساتھ حوادثِ زمانہ کے ہلکے ہلکے انعکاسات بھی نظر آتے ہیں اور وہ کلاسکی روایات کی روشنی میں آج کی زندگی کی طرف اپنا ہمہ گیر نقطۂ نظر منضبط کرتے ہیں۔'' (ایضاً، ص 47)

اختر مسلمی کی شاعری کا رجحان قدامت سے جدیدیت کی طرف تھا۔ یعنی نہ قدیم میلانات سے منہ موڑا اور نہ ہی جدید تقاضوں کو ہاتھ سے جانے دیا۔ ان کی شاعری میں قدامت پرستوں کا کٹرپن ہے اور نہ ہی کسی رجحان یا تحریک کا پروپگنڈا ملتا ہے بلکہ ان کی شاعری تمام چیزوں کی سنگم ہے جس سے انھوں نے اپنی شاعری کو سنوارا، چمکایا اور پُراثر بنانے کے ساتھ ساتھ لچک دار بھی بنایا ہے جس کی وساطت سے اختر مسلمی کو اردو شاعری میں ایک زندہ مقام نصیب ہو سکا۔

جب اختر مسلمی کی شاعری کو موضوعاتی اعتبار سے دیکھتے ہیں تو اس میں انواع و اقسام کے موضوعات ملتے ہیں۔ یہ تنوع اُن کی ایک بڑی خوبی ہے جو اُن کو اپنے دوسرے اقران و امثال سے ممتاز بناتی ہے۔ اختر مسلمی چونکہ ایک غزل گو شاعر ہیں اور غزل اردو ادب کی نہ صرف ایک مشہور و مقبول صنف ہے بلکہ اسے اردو شاعری کی آبرو کہا جاتا ہے۔ اگر اردو شاعری کی دوسری زبانوں کے ادب میں کوئی پہچان ہے تو وہ اسے اردو غزل کی بدولت نصیب ہوئی ہے۔ غزل ہی ایک ایسی صنف ہے جس کے شاعر اور شاعری دوسری ادب کے شاعروں اور شاعری کے مقابل رکھے جا سکتے ہیں۔ اگر چہ ایک زمانے میں اردو غزل صرف عشق و عاشقی اور گل و بلبل کے موضوعات تک ہی محدود تھی لیکن آج اردو غزل میں ہر قسم کے موضوعات نظر آتے ہیں۔ جن شاعروں نے اردو غزل کو تنگنائے موضوع سے نکال کر اُسے ہمہ گیر وسعتوں کا حامل بنایا ہے۔ اُن میں اختر مسلمی بھی ہیں۔ انھوں نے غزل کی خوبیوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے مختلف موضوعات کو غزل کے سانچے میں ڈھال کر اپنی فن کاری اور ہنرمندی کا بہترین ثبوت دیا ہے۔ ان کی شاعری میں خارجی زندگی کے ساتھ ساتھ داخلی زندگی کے حوادثات و واقعات پر بھی اچھے خاصے اشعار مل جاتے ہیں۔ جن میں پیار و محبت داخلی زندگی کا اہم حصہ ہے۔ جس کا طوفان ہر انسان کے دل میں اٹھتا ہے لیکن فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ کسی کی محبت حقیقی ہوتی ہے، کسی کی مجازی، کوئی چھپاتا ہے، کوئی اسے افشا کر دیتا ہے۔ اختر مسلمی کی محبت مجازی سے حقیقی کی طرف بڑھتی ہے۔ وہ اپنے محبوب کی جب تعریف کرتے ہیں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان کا محبوب اسی عالم میں سکونت پذیر ہے اور اختر مسلمی اس کے مضافات میں ہی زندگی بسر کر رہے ہیں، اس کے ہجر میں دن رات تڑپتے ہیں، اس کے بغیر زندگی کو بے کار و بے معنی سمجھتے ہیں اور زندگی کی تمام خوشیوں کو اسی کی ذات سے وابستہ کرتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

دل میرا داغ دار ہے گلشن ہے لالہ زار
دیکھے تو کوئی یہ بھی کرشمے بہار کے
اب کی بار جو فصلِ بہار گذری ہے
تیرے بغیر بہت ناگوار گذری ہے
نہ جانے سر سے اجل کتنی بار گذری ہے
نہ پوچھ کیسے شبِ انتظار گذری ہے
جلوہ بھی اس کا پردہ ہے پردہ بھی اس کا جلوہ
ایسی نظر فریب ہے کہ ہر ادا کہ بس
ٹکڑے ہوا کیے ہیں دلِ بے قرار کے
پوچھو نہ کیسے گزرے ہیں دن انتظار کے
میرے واسطے جہاں میں کوئی دلکشی نہیں ہے
کہ تیرے بغیر جینا کوئی زندگی نہیں ہے

ان اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کا محبوب کوئی بشر ہی ہے جس کو وہ اپنی زندگی کے لیے بے حد ضروری سمجھتا ہے اور اس کے بغیر سب کچھ ویران اور اجڑا ہوا محسوس کر رہا ہے۔

اختر مسلمی کی شاعری میں غم جاناں اور غم دوراں کا خوبصورت امتزاج ملتا ہے۔ انھوں نے سوز و گداز کے ساتھ ساتھ غم دوراں اور واردات قلب کے ساتھ ساتھ حوادث زمانہ کو بھی غزل کے سانچے میں ڈھال دیا۔ غم روزگار جو کہ ازل سے ہی عام انسان کے لیے بڑا مسئلہ بنا رہا اس کی وجہ سے عام انسان طرح طرح کی پریشانیوں اور آزمائشوں میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ جب کوئی انسان اس مسئلے کا شکار ہو جاتا ہے تو اسے نفسیاتی پریشانیوں کے ساتھ ساتھ سماجی پریشانیوں کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اسے کبھی اپنوں کے سامنے جھکنا پڑتا ہے تو کبھی غیروں کے سامنے ہاتھ پھیلانا پڑتا ہے۔ اختر مسلمی کی شاعری سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس مسئلے کی لپیٹ میں آ چکے ہیں۔ جس کی روداد وہ اپنی شاعری میں بے خوف انداز میں کرتے ہیں۔ کچھ اشعار ملاحظہ فرمائیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اختر مسلمی اس غم میں بھی مبتلا تھے:

دیکھیں گے تیری سمت بھی ہم اے غم حبیب
آرامِ روزگار سے فرصت ذرا ملے
زخم صدموں نے لگائے مرے دل پر کتنے
ایک شیشے پہ برستے رہے پتھر کتنے
روتے کٹی ہے عمر ہنسی کی تلاش میں
غم جھیلتا رہا ہوں خوشی کی تلاش میں
عجیب الجھن میں تو نے ڈالا مجھے بھی اے گردش زمانہ
سکون ملتا نہیں قفس میں نہ راس آتا ہے آشیانہ
طوفانِ حوادث ہی میں سکوں پاتا ہوں کنارہ کیا ہوگا
موجوں کا سہارا کافی ہے اب اور سہارا کیا ہوگا

اختر مسلمی نے اپنی غزلیہ شاعری کو صرف غم جاناں یا غم دوراں تک ہی محدود نہیں رکھا۔ بلکہ انھوں نے اپنی شاعری سے دوسرے کام بھی لیے ہیں وہ یہ ہے کہ انھوں نے غزل کے روایتی انداز کو برقرار رکھا اور غزل کے دامن کو اس وقت مضبوطی سے تھام کر رکھا جب غزل پر پیغمبری وقت آن پڑا تھا یعنی جب ترقی پسند تخلیق کاروں نے غزل کی سخت مخالفت کی تھی اور جدیدیت کے تخلیق کاروں نے وجودیت پر سارا زور صرف کیا تھا۔ اختر مسلمی اس وقت کے ان گنے چنے غزل گو شاعروں میں سے ہیں جنھوں نے غزل میں قدیم رنگ کے ساتھ ساتھ جدید رنگ کو بھی اہمیت دی اور ان لوگوں کو تنقید کا نشانہ بنایا جنھوں نے غزل کے روایتی انداز کو یکسر برطرف کر کے خالی جدید

رنگ کو غزل میں سمونے کی کوشش کی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اخترؔ مسلمی کو صنف غزل کتنی عزیز ہے اور کس طرح غزل کی حمایت میں کھڑے معلوم ہوتے ہیں:

رنگِ جدید روئے غزل سے عیاں رہے
لیکن غزل کی روح غزل میں نہاں رہے
فن کو نادانوں کی تحسیں نے سنورنے نہ دیا
اس نئے دور کے شاعر کو سدھرنے نہ دیا
میری تخیل کی رفعت کو نہ پہنچا کوئی
اور میں نے اسے پستی میں اترنے نہ دیا
اصناف سخن یوں تو سبھی خوب ہے اختر
جو صنفِ غزل میں ہے مزا اور ہی کچھ ہے

اخترؔ مسلمی اپنی شاعری میں پرانی تہذیب کی حمایت اور نئی تہذیب کی مخالفت بھی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ نئی تہذیب سے بالکل ناخوش دکھائی دیتے ہیں۔ کیوں کہ نئی تہذیب نے نہ صرف کسی خاص طبقے کو متاثر کیا بلکہ عام طبقے پر بھی نمایاں اثرات مرتب کیے۔ وہ پرانی تہذیب کے رسیا تھے جس میں اُخوت و بھائی چارگی، اتفاق واتحاد، عزت واحترام، شرم وحیا اور بزرگوں کا پاس ولحاظ زندگی کی اعلیٰ قدریں تصور کی جاتی تھیں۔ جبکہ نئی تہذیب بالکل اس کے برخلاف ہے جس نے انسان سے یہ تمام چیزیں چھین لیں اور اس میں درندوں کے صفات پیدا کردیے۔ اخترؔ مسلمی دیہات کے لوگوں کی تعریف اور اس نئی تہذیب کی مخالفت اس انداز میں کرتے ہیں:

دیہات کے بسنے والے تو اخلاق کے پیکر ہوتے ہیں
اے کاش نئی تہذیب کی روشہروں سے نہ آتی گاؤں میں
ہر ایک چہرہ مجھے سوگوار لگتا ہے
میں دیکھتا ہوں جسے بے قرار لگتا ہے
یہ کیا کیا نئی تہذیب نے کہ اب انساں
خود اپنے گھر میں غریب الدیار لگتا ہے
تہذیب نو کے لوگ وہ خوش پوش ہوگئے
بارِ لباس سے بھی سبکدوش ہوگئے
اندھیرے لاکھ غنیمت رہیں اجالے سے
جدید شمعِ فروزاں سے ڈر لگے ہے مجھے

اخترؔ مسلمی نے نئی تہذیب کے ساتھ ساتھ حکمراں طبقے کو بھی نشانہ بنایا ہے۔ جنھوں نے اپنی مکاری وفریب کاری سے پوری دنیا کو جہنم بناکے رکھ دیا ہے۔ یہ ایک ایسا طبقہ ہے جس میں انسانیت نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ اس میں زیادہ تر لوگ نکمے ہوتے ہیں جن کے اندر مکاری کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے جس کی بدولت وہ عام انسان کو بے وقوف بناتے ہیں۔ عہدہ حاصل کرنے کے بعد وہ ایسے کام انجام دیتے ہیں جن سے انسانیت شرمندہ ہوجاتی ہے۔ اپنے مفاد کے لیے بھائی کو بھائی سے، ایک مذہب والے کو دوسرے مذہب والے سے لڑاتے ہیں اور کسی بھی شریف انسان کا قتل کرانے میں انھیں ذرا بھی باک نہیں ہوتا۔ غرض ایسے کام کرتے ہیں جن سے شیطان بھی پناہ مانگتا ہے۔ جب ان کے عہدے کا مقرر کردہ وقت اختتام کو پہنچتا ہے تو وہ پھر اپنی اصلیت پر آجاتے ہیں۔ پھر اسی طرح عوام الناس کو اپنی مکاری کے جال میں مقید کر کے پھر سے عہدہ حاصل کر لیتے ہیں۔ اخترؔ مسلمی ان نام نہاد لیڈروں اور رہبروں کے لباس میں چھپے رہزنوں سے بھی آگاہ کرتے ہیں۔ وہ اپنے تاثرات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

کہیں لٹ رہا ہے خرمن کہیں جل رہا ہے گلشن
اسے کس نے سونپ دی ہے یہ چمن کی پاسبانی
اتار دے گا نقاب اپنی انتخاب کے بعد
یہ شخص آج بڑا خاکسار لگتا ہے
اب راہزن کو راہ نما کہہ رہے ہیں لوگ
حیراں ہوں دوستو کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں لوگ
اس درجہ بے ضمیر ہیں اللہ کی پناہ
ان کی ہر اک جفا کو وفا کہہ رہے ہیں لوگ
فریب کاری انساں سے ڈر لگے ہے مجھے
پیامِ امن کے عنواں سے ڈر لگے ہے مجھے

اخترؔ مسلمی کی شاعری اُن کے اعتقاد وعقائد کی بھی مکمل مظہر ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، رحمانی، رزاقی، کریمی، غفاری، ستاری وغیرہ جیسی صفات کو بھی بیان کرتے ہیں۔ اُسی کو اپنا ملجا و ماویٰ سمجھتے ہیں اور اُس کے علاوہ کسی کے دربار میں سر جھکانا اُس کی شان توحید کے منافی اور اپنی جبین نیاز کی توہین خیال کرتے ہیں۔ وہ اگر چہ سراپا گناہ گار ہیں۔ اخترؔ مسلمی نے جہاں اللہ تعالیٰ کی صفات اور اپنے عقائد بیان کیے ہیں وہیں دوسروں کو اللہ کے سامنے حاضر ہونے کا طریقہ بھی بتایا ہے۔ وہ اپنے عقائد اور اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کو اپنے اشعار میں اس طرح بیان کرتے ہیں:

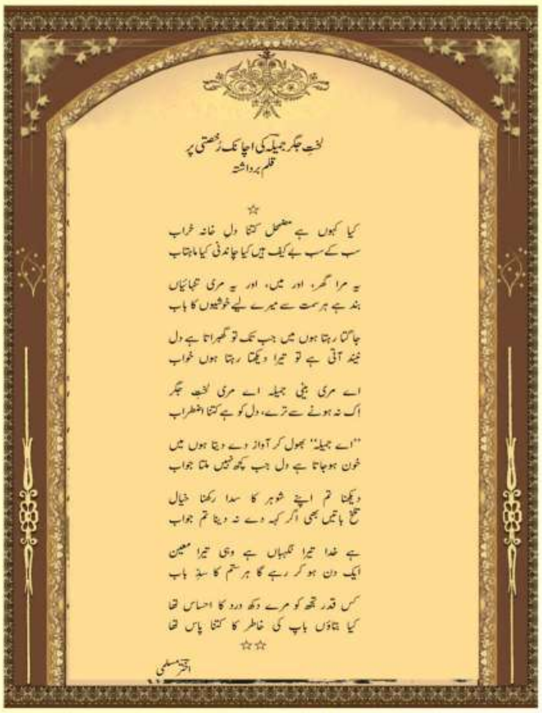

مانگوں میں دردِ دل کی دوا کس سے اے خدا
تیرے سوا جہاں میں کوئی دوسرا بھی ہے
ڈرتا ہوں اس لیے کہ سراپا گناہ ہوں
لیکن تیرے کرم کا مجھے آسرا بھی ہے
برس پڑیں گی گھٹائیں امنڈ کے رحمت کی
تو سر جھکا کے ذرا اشکبار ہو تو سہی
زمانہ تیرے لیے بے قرار ہوجائے
تو دوسروں کے لیے بے قرار ہو تو سہی
ذرا اور پیدا خلوص کر کہ ملے مقام عبودیت
تیرے دل سے اخترؔ مسلمی ابھی نقشِ غیر مٹا نہیں

الغرض اُن کی شاعری میں حد درجہ تنوع دیکھنے کو ملتا ہے۔ شعبۂ حیات کا شاید ہی کوئی گوشہ ہو جس پر اُن کی نظر نہ گئی ہو معاملاتِ حسن وعشق کے علاوہ اُس دور کے سیاسی و معاشرتی حالات نے بھی اُن کی شاعری میں وافر حصہ پایا ہے۔ اُن کی غزلیہ شاعری کے آئینہ خانے میں اُن کے جلوہ ہائے گونا گوں کو دیکھا جاسکتا ہے، کہیں وہ عشق کے نغمہ خواں ہیں تو کہیں مسائل حیات کے نباض۔ مختصر یہ کہ ان کی شاعری رنگا رنگ اور مختلف النوع پھولوں کا گلدستہ ہے اس اعتبار سے اگر اُن کو نگار خانۂ مالی سے تشبیہ دی جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

■

Arshad Ahmad Kuchay
Ph.D Research Scholar
Department of Urdu
Central University Sagar (MP)

طنز و مزاح کا عہدِ زریں
مشتاق احمد یوسفی

منظور وقار

ہنسی مذاق مسکراہٹ اور قہقہے کسی انسان کے اندر ناپید ہوں تو اس انسان کی زندگی کسی ویران کھنڈر سے کم نہیں۔ دنیا کی عظیم شخصیات عالم دین ہوں کہ مفتی، سائنس داں ہوں کہ سیاست داں، فلاسفر ہوں کہ قلمکار ان کی زندگی کا جب ہم مطالعہ کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ ان کے اندر بھی ہنسی مذاق اور بذلہ سنجی کا خمیر موجود تھا۔ سنجیدگی بردباری اور انسانیت کا پیکر مہاتما گاندھی نے ایک جگہ لکھا ہے ''میں اس دن مرنا پسند کروں گا جس دن میری زندگی سے ہنسی نکل جائے گی۔'' طنز و مزاح کیا ہے اس سوال کا جواب ایک مکمل کتاب کا متقاضی ہے۔ اس کا مختصر جواب اسیم کاویانی کی اس رائے میں موجود ہے :

''مزاح سنگ ریز چٹانوں سے لپٹتی گنگناتی لہراتی ہوئی چنچل ندی ہے اور قہقہہ اچھلتا اڈتا دندناتا اور شور مچاتا ہوا طوفانی آبشار ہے جو نشیب میں آکر شانت ہوجاتا ہے۔'' (سہ ماہی 'فکر و فن' دہلی)

اس تحریر سے ہمارا مقصد طنز و مزاح نگاری کا جائزہ لینا نہیں ہے بلکہ ہمارے پیش نظر دنیا طنز و مزاح کے بے تاج بادشاہ مرحوم مشتاق احمد یوسفی کی طنز و مزاح نگاری پر روشنی ڈالنا ہے۔ مشتاق احمد یوسفی کی طنز و مزاح نگاری پر بے شمار قلمکاروں اور نقادانِ ادب نے سیکڑوں مضامین قلمبند کیے ہیں ان کے منفرد طرز تحریر اور طرز اظہار کی اتنی زیادہ تعریف و ستائش ہوئی ہے کہ کوئی دوسرا طنز و مزاح نگار اس کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ ابن انشا، پطرس بخاری، شفیق الرحمٰن، کرنل محمد خاں، یوسف ناظم اور مجتبیٰ حسین نے اپنے اپنے طور پر طنز و مزاح نگاری کی مقبولیت میں اضافہ کیا لیکن یوسفی نے جب قلم اٹھایا تو طنز و مزاح نگاری کو نقطہ عروج پر پہنچادیا۔ ڈاکٹر محمد حسن لکھتے ہیں:

''مشتاق احمد یوسفی کی تحریروں نے انتہائی عروج کی منزل طے کرلی جو شاید اردو ادب کو میسر ہوسکتی تھی۔ یوسفی کی تحریریں اردو نثر کی معراج ہے۔ یہ معراج نثر نگاری کی معراج ہے۔'' (روزنامہ انقلاب، ممبئی 22 جولائی 2018)

مشتاق احمد یوسفی کی تحریروں میں پھکڑ پن لطیفے بازی اور فقرہ بازیاں نہیں ہیں برخلاف اس کے ان کی تحریروں میں لطیف مزاح، شائستہ مذاق، شوخی اور شگفتگی ہے۔ طنز کرتے ہوئے اس بات کا بھی خیال رکھا گیا ہے کہ طنز کسی کی دل آزاری، تحقیر و تضحیک کا ذریعہ نہ بنے۔ طنز و ظرافت پل صراط پر سے گزرنے کے برابر ہے۔ ذرا سی چوک اور تضحیک سے طنز و مزاح نگاری کی خوبصورت عمارت ڈھیر ہوسکتی ہے۔ ہم یہاں مشتاق احمد موسفی کی مزاح نگاری پر چند مشاہیر ادب کے تاثر پیش کرتے ہیں۔ مزاح نگار ضمیر جعفری لکھتے ہیں:

''مشتاق احمد یوسفی اپنے

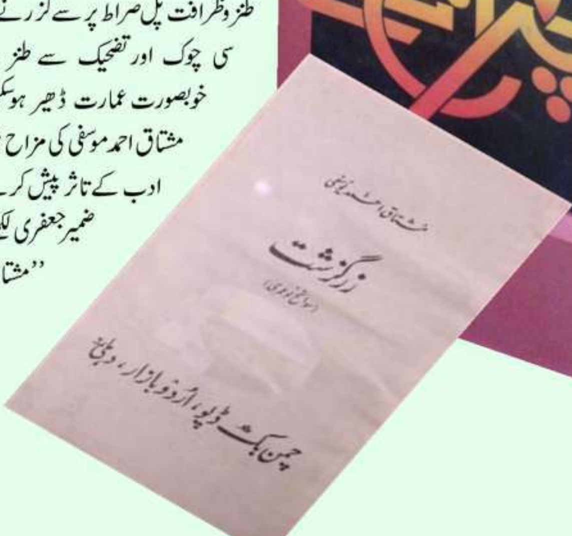

کھیت میں نفرت، کدورت یا دشمنی کا بیج بوتا ہی نہیں یوسفی دور مار توپ ہیں مگر اس توپ کا گولہ بھی کسی نہ کسی سماجی برائی پر جا کر پڑتا ہے۔'' (روزنامہ 'انقلاب' دکن ممبئی)

پروفیسر اختر الواسع کہتے ہیں :

''دنیا کے طنز و مزاح میں یوسفی بے مثال حیثیت کے مالک ہیں۔ مزاح اور طنز کے جتنے بھی کارگر طریقے اور اسلوب ہو سکتے ہیں وہ سب یوسفی صاحب کے یہاں ملتے ہیں۔ مختصر سے مختصر جملوں میں طنز و مزاح کی بے مثال کیفیت پیدا کرنے میں وہ اپنا ثانی نہیں رکھتے۔''

(روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' 22 جولائی 2018)

مجتبیٰ حسین لکھتے ہیں:

''یوسفی جس اہتمام کے ساتھ لکھتے ہیں اس کے لیے بڑا حوصلہ چاہیے ایک ایک لفظ نپا تلا ہر جملہ سجا سجایا ہر پیراگراف کسا کسایا ان جیسا انشا پرداز اب اردو میں کوئی اور نہیں۔ یوسفی اپنی ہر کتاب کے بیچ کم از کم دس برس کا وقفہ ضرور دیتے تھے۔'' (روزنامہ 'سیاست' حیدرآباد، 1 جولائی 2018)

20/ جون 2018 کو مشتاق احمد یوسفی کا انتقال ہوا تو ہند و پاک کے مختلف ادبی رسائل کے مدیران نے خصوصی گوشے شائع کیے۔ مدیر اعلیٰ شگوفہ (حیدرآباد) مصطفیٰ کمال نے بھی جولائی 18/ کا شمارہ یوسفی کے نام منسوب کر دیا وہ اداریہ میں لکھتے ہیں:

''یوسفی کے انتقال کی خبر جنگل کی آگ کی طرح ساری دنیا میں پھیل گئی۔ اخبارات، واٹس اَپ اور سارے میڈیا پر مشتاق احمد یوسفی کا ذکر خیر تھا۔ اردو والے سوچ بھی نہیں سکتے کہ کسی ادیب کے انتقال پر کروڑوں قارئین مرحوم کی تحریروں، جملوں اور فقروں کے حوالے سے اس نوعیت کے تعزیت نامے جاری کر سکتے ہیں۔''

بہ حیثیت طنز و مزاح نگار یوسفی کی پانچ تصانیف چراغ تلے، خاکم بدہن، آبِ گم، زرگزشت اور شام شعر یاراں شائع ہوئی ہیں۔ حکومت پاکستان نے ان کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں 'ستارۂ امتیاز' ایوارڈ سے نوازا ہے۔ تمام ہی کتابوں کو عالمی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ ہم ان کی کتاب خاکم بدہن سے چند اقتباسات آپ کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔ ان اقتباسات کے مطالعہ سے آپ کو پتہ چلے گا کہ یوسفی کے ندرت قلم میں کیسا بانکپن اور مشاہدے میں کس بلا کی گہرائی و توانائی ہے۔ خاکم بدہن یوسفی کی دوسری تصنیف ہے جو 1969 میں شائع ہوئی۔ کتاب میں زلیخا کے عنوان سے خود انہی کا لکھا ہوا دیباچہ، دو فرضی خاکے اور چھ مزاحیہ مضامین شامل ہیں۔ دست زلیخا کی ہر ہر سطر طنز و مزاح، شوخی و شگفتگی کی عمدہ مثال ہے۔ ملاحظہ فرمائیے 'دست زلیخا' سے لیے گئے اقتباسات:

''لوگ کیوں اور کب ہنستے ہیں جس دن ان سوالوں کا صحیح جواب معلوم ہو جائے گا انسان ہنسنا چھوڑ دے گا۔ رہا یہ سوال کہ کس پر ہنستے ہیں تو اس کا انحصار حکومت کی رواداری پر ہے۔ انگریز صرف ان چیزوں پر ہنستے ہیں جو ان کی سمجھ میں نہیں آتیں۔ اس کے برعکس ہم لوگ ان چیزوں پر ہنستے ہیں جواب ہماری سمجھ میں آ گئی ہیں مثلاً انگریز عشقیہ شاعری، روپیہ کمانے کی ترکیبیں اور جمہوریت۔''

''مزاح نگار اس لحاظ سے بھی فائدے میں رہتا ہے۔ اس کی فاش سے فاش غلطی کے بارے میں بھی پڑھنے والے کو یہ اندیشہ لگا رہتا ہے کہ ممکن ہے اس میں بھی مزاح کا کوئی لطیف پہلو پوشیدہ ہو جو اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔''

'صبغے اینڈ سنز' ایک کتب فروش کا فرضی خاکہ ہے۔ ملاحظہ فرمائیے اس سے لیے گئے اقتباسات:

''ایک دن میں نے پوچھا اختر شیرانی کی کتابیں کیوں نہیں رکھتے۔ مسکرائے فرمایا۔ وہ نابالغ شاعر ہے۔ میری حیرانی دیکھ کر خود ہی وضاحت فرما دی کہ وہ وصل کی اس طور پر فرمائش کرتا ہے گویا کوئی بچہ ٹافی مانگ رہا ہے۔ اس پر میں نے اپنے ایک محبوب شاعر کا نام لے کر کہا بے چارے ہوش خلیج آبادی نے کیا خطا کی ہے کہ ان کے مجموعے بھی نظر آتے۔ ارشاد ہوا کہ اس ظالم کے تقاضائے وصل کے یہ تیور ہیں گویا کوئی کابلی پٹھان ڈانٹ ڈانٹ کر ڈوبی ہوئی رقم وصول کر رہا ہے۔''

''نوجوان اس وقت تک اردو کی کوئی کتاب پڑھنے کی حاجت محسوس نہیں کرتے۔ جب تک پولیس اسے فحش قرار نہ دے دے۔ پولیس اگر دل سے چاہے تو تمام اچھی اچھی کتابوں کو فحش قرار دے کر نوجوانوں میں اردو ادب سے گہری دلچسپی پیدا کر سکتی ہے۔ اگر ایک پوری نسل کو ہمیشہ کے لیے کسی اچھی کتاب سے بیزار کرنا ہے تو سیدھی ترکیب یہ ہے کہ اسے نصاب میں داخل کر دیجیے۔''

'بائی فوکل کلب' اس انشائیے میں ڈاکٹرس امراض اور مریضوں کا ایسا دلچسپ اور دلکش ذکر ہے۔ ہر ہر سطر کو پڑھتے ہوئے گدگدی سی ہونے لگتی ہے: ملاحظہ فرمائیے اقتباس اس میں ایک نیم حکیم خطرۂ جان ڈاکٹر کا خاکہ کس طرح کھینچا گیا ہے:

''اللہ نے ان کے ہاتھ میں کچھ ایسا شفا دیا تھا کہ ایک دفعہ ان سے رجوع کرنے کے بعد کوئی بیمار خواہ بستر مرگ پر ہی کیوں نہ ہو مرض سے نہیں مر سکتا تھا دوا سے مرتا تھا مرض کے جراثیم کے حق میں ان کی دوا گویا آبِ حیات کا حکم رکھتی تھی۔ غریبوں کا علاج مفت کرتے مگر امیروں کو فیس لیے بغیر نہیں مارتے تھے۔''

مشتاق احمد یوسفی کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین ہوں کہ انشائیے ان کی ہر تحریر بیس پچیس صفحات سے کم نہیں ہوتی لیکن طرز اظہار کی شوخی زبان و بیان کی بلند آہنگی طوالت کا احساس ہونے نہیں دیتی۔ برخلاف اس کے قاری کے شوخ مطالعہ میں مزید اضافہ ہوتا ہے یوسفی کی زبان و بیان کی چاشنی و شوخی اس بلا کی ہے کہ قاری ان کے انشائیوں اور مضامین کی گرفت میں رہتا ہے۔ یوسفی اپنی تحریروں میں زندگی کے مکروہات، کھوکھلے رسم و رواج، فرسودہ اور مفلوج روایت پر ایسی کاری ضرب لگاتے ہیں کہ قاری دل ہی دل میں تلملا کر رہ جاتا ہے۔

مشتاق احمد یوسفی کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین ہوں کہ انشائیے ان کی ہر تحریر بیس پچیس صفحات سے کم نہیں ہوتی لیکن طرز اظہار کی شوخی زبان و بیان کی بلند آہنگی طوالت کا احساس ہونے نہیں دیتی۔ برخلاف اس کے قاری کے شوخ مطالعہ میں مزید اضافہ ہوتا ہے یوسفی کی زبان و بیان کی چاشنی و شوخی اس بلا کی ہے کہ قاری ان کے انشائیوں اور مضامین کی گرفت میں رہتا ہے۔ یوسفی اپنی تحریروں میں زندگی کے مکروہات، کھوکھلے رسم و رواج، فرسودہ اور مفلوج روایت پر ایسی کاری ضرب لگاتے ہیں کہ قاری دل ہی دل میں تلملا کر رہ جاتا ہے۔ باوجود اس کے قاری کے ہونٹوں پر تبسم رقص کرتا ہے۔ مروجہ تشبیہات اور محاوروں کا برمحل استعمال یوسفی کے کمال ہنرمندی کا ثبوت ہے۔ ان کے مضامین میں الفاظ و معنی کا ایک بحر بیکراں ہے جو قاری کو حیرت و استعجاب کی دنیا میں پہنچا دیتا ہے۔ ہمیں یہ اعتراف کرتے ہوئے فخر کا احساس ہوتا ہے کہ ہم پچھلے پچاس برسوں سے عہد یوسفی میں جی رہے تھے آج بھی عہد یوسفی میں جی رہے ہیں کیونکہ جب تک اردو زبان و ادب کی سانسوں کا سلسلہ برقرار رہے گا اس وقت تک مشتاق احمد یوسفی کا عہد زریں باقی رہے گا۔

■

Manzoor Viqar
Yadulla Colony,
Gulbarga - 585104 (Karnataka)
Mob:09731428416

غضنفر اقبال

مشتاق احمد یوسفی

بات برگ گلاب

مشتاق احمد یوسفی نے کارِ جہانِ بے ثبات میں معجزہ ہائے ہنر اور روشن گر تحریرات سے ایک عہد کو متاثر کیا تھا۔ ظرافت نگاری اُن کو ہر دہر اور ہر قرن میں یاد کرتی رہے گی کیونکہ وہ مستقل عنوان تھے اِس میدان کے۔ مجنوں گورکھپوری نے مرحوم کو ظرافت نگاری کا نیا دبستان کہا تھا۔ ابن انشا نے کہا کہ ہم عہد یوسفی میں جی رہے ہیں۔ یوسف ناظم نے یوسفی کے فن کو مونالیزائی تبسم قرار دیا۔ ڈاکٹر انور سدید نے علی الاعلان کہا مشتاق احمد یوسفی کا حریف کوئی پیدا ہی نہیں ہوا۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے کہیں لکھا یوسفی ہمارے دور کے سب سے بڑے طنز و مزاح نگار ہیں۔ ڈاکٹر مجتبیٰ حسین نے یوسفی مرحوم کو طنز و مزاح کا جیتا جاگتا معجزہ کہہ کر خراج عقیدت پیش کیا۔

مشتاق احمد یوسفی مزاح و ظرافت کے مردِ آگاہ تھے اِن کا فن جمیل جمالیاتی نشاط آفرینی سے عبارت ہے۔ اِن کے افکارِ عالیہ، بامعنی، پراثر، پرکار ہونے کے باعث بلاد و امصار تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہیں۔ علامہ سیماب اکبرآبادی کا ایک شعر مشتاق احمد یوسفی کی حیات اور افکار کا ماحصل ہے۔

پھیلے تو یوں کہ چھاگئے کل کائنات پر
سمٹے تو اِس قدر کہ رگِ جاں میں رہ گئے

راقم التحریر نے مشتاق احمد یوسفی کے انٹرویوز کا ایک مطالعہ کیا ہے۔ مشتاق احمد یوسفی صاحب اسلوب ظرافت نگار تھے۔ ان کے انٹرویوز انگلیوں پر شمار کیے جاسکتے ہیں۔ موقر افسانہ نگار اور انٹرویو کار ڈاکٹر آصف فرخی نے یوسفی سے ایک طویل انٹرویو کیا تھا۔ اس انٹرویو کو تاریخی اور یادگار ہونے کی حیثیت حاصل ہے کیونکہ اس میں صاحب انٹرویو نے کھل کر گفتگو کی ہے۔ ملاقات نگار نے بھی یوسفی کے ظاہر و باطن کو ٹٹولنے اور کھنگالنے کی سعی کی ہے۔ یہ انٹرویو یوسفی کے حقیقی باطن کو منکشف کرتا ہے۔ اِس ملاقات میں صاحب انٹرویو نے شعبۂ طنز و مزاح کے الگ الگ ہونے کا خلاصہ ان الفاظ میں کیا ہے۔

''طنز و مزاح، ہماری اردو میں بدقسمتی سے دونوں لفظ یک جا استعمال ہوتے ہیں کہ طنز و مزاح۔ مزاح کے اپنے تقاضے ہیں کہ مزاح کوئی شخص لکھ نہیں سکتا۔ جب تک کہ اس نے اپنے موضوع سے، یا اپنے ہدف سے جی بھر کے اور رَچ کے محبت نہ کی ہو۔ محبت شرط اوّل ہے۔ طنز میں یہ قطعی ضروری نہیں۔ طنز میں ایک تنفر سے ابتدا ہوتی ہے۔ ایک بیگانگی سے ابتدا ہوتی ہے کہ میرے گرد جو کچھ ہو رہا ہے میں اِس کا حصہ نہیں ہوں اور میں اپنے آپ کو اس سے کوئی رشتہ قائم کرنے کے لیے تیار نہیں پاتا۔''

طنز و مزاح کے کلاسیکی فن کاروں پطرس بخاری، شوکت تھانوی اور ابن انشا کے فن پر یوسفی نے اس انٹرویو میں رائے زنی کی ہے۔ پطرس کے بارے میں فرماتے ہیں:

''پطرس آج بھی ایسا ہے کہ کبھی گاڑی اٹک جاتی ہے تو اس کا ایک صفحہ کھولتے ہیں تو ذہن کی بہت سی گرہیں کھل جاتی ہیں اور قلم رواں ہو جاتا ہے۔''

شوکت تھانوی پر یوسفی مرحوم کا یہ خیال ہے:

''شوکت تھانوی میں یہ خوبی تھی کہ تحریر سے کہیں زیادہ دل چسپ اور شگفتہ وہ صحبت میں ہوتے تھے۔ ان سے بہتر MIMIC کوئی ملنا دشوار تھا۔''

ابن انشا کے فکر و فن پر یوسفی نے انشا جی کی مشہور کتاب خمار گندم پر اپنی رائے دی تھی جو کتاب میں درج ہے۔ زیر بحث گفتگو میں یوسفی کہہ اٹھتے ہیں:

''انشا جی لفظوں کے بڑے مزاج داں تھے۔ انشا جی ہمارے دور کے سب سے بڑے مزاح نگار ہیں۔ اس پر کچھ دوست آزردہ بھی ہوئے اور ایک آدھ تحریریں پریس میں بھی آئیں جس میں میری چھتاڑ کی گئی۔ حالانکہ میری چھتاڑ کرنے سے انشا جی کی عظمت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ مجھے آپ نالائق ثابت کر کے انشا جی کی عظمت میں کوئی کمی نہیں لا سکتے۔ اس کے باوجود آپ دیکھتے کہ جس وقت انشا جی کے سامنے کوئی لفظ آتا ہے تو وہ جھجکتے

نہیں ہیں۔''

مشتاق احمد یوسفی، اعلیٰ درجے کے ادیب تھے۔ ان کی تحریر میں بصیرت ہے۔ انھوں نے اپنی تحاریر میں شگفتہ لہجہ اختراع اور اختیار کیا۔ اپنے اس طویل انٹرویو میں مفید مطلب اور معقول باتیں کی ہیں۔ 'لفظ' کی معنویت پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے یوسفی کہتے ہیں:

''لفظ تو پورا ایک براعظم ہے۔ براعظم اس معنی میں کہ اس کی اپنی ایک Climate ہے۔ اس کا اپنا ایک درجۂ حرارت ہے۔ ایک لفظ، ایک معنی، میں صرف ایک ہی ملے گا آپ کو۔ اس معنی کا کوئی دوسرا لفظ نہیں ہوگا۔ یہ ایک نگینہ سا ہے جو انگوٹھی میں ایک خاص سائز کا اور خاص شکل کا ہی لگے گا۔ دوسرا لفظ اس کی جگہ نہیں آئے گا اگر دوسرا لفظ آتا ہے تو اس کے کچھ اور Shades ہوں گے۔''

مشتاق احمد یوسفی نے ایک طویل فن کارانہ، باوقار اطوار، بکمال جرأت اور خود اعتمادی والی زندگی گزاری۔ فن میں اتنا غرقاب ہوئے کہ 'فن' پر اپنی یہ رائے قائم کردی:

''ہر فن ایک ریاض چاہتا ہے اگر اس میں آورد معلوم ہوتی ہے تو وہ میری محنت کا قصور نہیں ہے۔ میرے فن کی خامی ہے تو یہ نہیں کہنا چاہیے کہ میں نے زیادہ محنت کی اس لیے خراب ہوگیا بلکہ یہ ہے کہ میرے فن میں خامی ہے۔ اگر ایسا ہے تو ٹھیک ہے لیکن یہ خیال کر لینا کہ بعض لکھنے والے ایسے ہیں جو قلم زد نہیں کرتے، یہ بہ ذات خود کوئی خوبی کی بات قطعی نہیں ہے اور اس کی اچھائی یا برائی سے کوئی تعلق نہیں۔''

مشتاق احمد یوسفی، صاحب نظر، صاحب فن شگفتہ نگار تھے۔ ڈاکٹر آصف فرخی کے پیش نگاہ گفتگو میں یوسفی مرحوم نے منشی سجاد حسین کے مشہور زمانہ اخبار 'اودھ پنچ' پر دوٹوک انداز میں کہہ دیا:

''اودھ پنچ کے جو لکھنے والے تھے۔ لکھنؤ سے جو نکلتا تھا۔ اس کے لکھنے والوں کے بارے میں یہ کہہ سکتے ہیں۔ خاص طور سے کہ ان کی ساری ظرافت اور ساری بزلہ سنجی اور ساری شگفتگی جو تھی وہ صرف الفاظ کے گرد گھومتی تھی۔ اس میں کوئی خیال یا کوئی Situation یا کوئی جذبہ آپ کو اس کے پیچھے نظر نہیں آتا۔ وہ الفاظ کا نیا گرا تھی۔ جیسے بچے Lago یا مکانو کے سیٹ سے مختلف چیزیں بناتے رہتے ہیں۔ اسی طریقے سے وہ الفاظ سے کھیلتے رہتے ہیں۔ چنانچہ ان کا مزاح جو ہے وہ ایک ہی سطحی قسم کا اور وقتی قسم کا مزاح رہا ہے۔ اس لیے ان کی پیشانی پر آپ سوچ کی کوئی لکیر نہیں دیکھیں گے۔ میرا اپنا عقیدہ ہے کہ وہ مزاح کہ جو آپ کو سوچنے پر مجبور نہ کرے وہ ناپختہ ہے۔

مشتاق احمد یوسفی سے 12 دسمبر 2017 کو اے آر نیوز پاکستان کے لیے محترمہ ماریہ میمن نے ایک انٹرویو کیا تھا۔ یہ انٹرویو مذکورہ چینل کا مشہور پروگرام 'سوال یہ ہے' کا حصہ ہے۔ اس مصاحبے کی خاص بات یہ رہی ہے کہ دکن دلیس کی تازہ کار ادیبہ ڈاکٹر بی بی رضا خاتون کی کتاب اردو طنز و مزاح کا یوسفِ لاثانی مشتاق احمد یوسفی (اشاعت: 2016) کا سرورق انٹرویو میں نمایاں طور پر دکھایا گیا ہے۔ ماریہ میمن نے یوسفی مرحوم سے مٹھی بھر سوالات، پسند ناپسند، متاثر کن شخصیت، کتابیں، کس کو پڑھ کر مایوسی وغیرہ ہوئی قائم کیے ہیں۔ اس گفتگو کی نوعیت رسمی اور سنجیدہ گفتگو کی ہے لیکن اس مصاحبے سے ایک سوال کا جواب خیال انگیز ہے۔ لکھنا کب ضروری ہے اس پر مشتاق احمد یوسفی گویا ہوئے:

''لکھنا اس وقت چاہیے جب واقعی ہم محسوس کرتے ہیں کہ کوئی نئی بات یا کسی انوکھے زاویے سے ہم اسے پیش کرنا چاہتے ہیں۔ محض لکھنے کی خاطر نہیں لکھتے رہنا چاہیے۔ جب کوئی نئی بات ہمارے خیال میں اس نئے زاویے سے نہیں کہی گئی ہے۔ تب کہنے کا مزہ ہے۔''

ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی کراچی نے اپنے ایک مضمون 'اب ہم سحر یوسفی میں جئیں گے' (مطبوعہ ماہ نامہ شگوفہ حیدرآباد دکن جولائی 2018) میں لکھا ہے کہ ڈاکٹر موصوف نے ایک انٹرویو مشتاق احمد یوسفی سے کیا تھا۔ یہ انٹرویو روز نامہ، ڈان کے سنڈے ایڈیشن میں 27 جنوری 1995 کو شائع ہوا تھا۔ مشتاق احمد یوسفی نے دوران انٹرویو آف دی ریکارڈ حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا:

''موجودہ حالات پر جو شخص بغیر گالی دیے اظہارِ خیال کردے وہ ولی ہے۔''

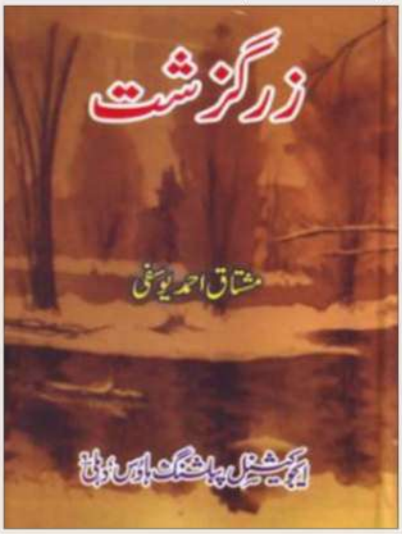

مشتاق احمد یوسفی نے اپنی اولین کتاب 'چراغ تلے' میں بہ قلم خود پہلا پتھر کے عنوان سے ایک انٹرویو ترتیب دیا ہے۔ اس کا انٹرویو کا طرز میں سے میں کی ملاقات کا ہے۔ 'میں کا تعارف' کے طور پر اس انٹرویو کی معنویت غیر معمولی ارتکاز کی حامل ہے۔ یوسفی مرحوم نے اس انٹرویو میں نام، خاندان، تاریخ پیدائش، پیشہ، پہچان، قد، وزن، جسامت، حلیہ، پسند، چڑ، مشاغل، تصانیف اور کیوں لکھتا ہوں جیسے سوالوں کے جواب بے تکلف اور لطف انگیز دیے ہیں۔ 'پیشہ' کے جواب میں یوسفی لکھتے ہیں:

''گو کہ یونیورسٹی کے امتحانوں میں اوّل آیا لیکن اسکول میں حساب سے کوئی طبعی مناسبت نہ تھی اور حساب میں فیل ہونے کو ایک عرصے تک اپنے مسلمان ہونے کی آسانی دلیل سمجھتا رہا۔ اب وہی ذریعہ معاش ہے۔ حساب کتاب میں اصولاً دو اور دو چار کا قائل ہوں مگر تاجروں کی دل سے عزت کرتا ہوں کہ وہ بڑی خوش اسلوبی سے دو اور دو کو پانچ کر لیتے ہیں۔''

مشتاق احمد یوسفی نے مختصر سوالوں کے اختصار میں جواب کس طرح سے دیے ملاحظہ کیجیے:

''قد: پانچ فٹ ساڑھے چھ انچ (جوتے پہن کر)
چڑ: جذباتی مرد، جذباتی عورتیں، مٹھاس شطرنج
تصانیف: چند تصویر بتاں، چند مضامین و خطوط''

مشتاق احمد یوسفی، اپنے آپ کو گوشہ نشین اور پردہ نشین ادیب سمجھتے تھے۔ وہ انٹرویو دینے سے عمر بھر اجتناب کرتے رہے۔ کئی صحیفہ نگار اور ملاقات نگار نے ان سے مصاحبے کرنے کی خواہش کی تھی مگر خاطر خواہ کامیابی نہیں مل سکی تھی۔ مشتاق احمد یوسفی کے چند انٹرویوز ہی ان کے راست گو، پرگو اور صاف گو ہونے کے گواہ ہیں۔ ان کی گفتگوئیں عقل و بصیرت کی آئینہ دار ہیں۔ سحر بیان اور سحر طراز اسلوب کے خالق یوسفی کے انٹرویوز مدتِ مدید تک روشن یاد کی شکل میں زندہ رہیں گے۔ قدیم اردو کے منفرد سخنور سلیمان خطیب کی مشہور نظم 'ساس بہو' کے چند ابیات مشتاق احمد یوسفی کے انٹرویوز کے عکاس ہیں۔

بات برگ گلاب ہوتی ہے
بات ام الکتاب ہوتی ہے
بات بوئے کلیم ہوجائے
سننے والا ندیم ہوجائے

■

Dr. Ghazanfar Iqbal
"Saiban' Zubair Colony
Hagarga Cross, Ring Road
Gulbarga -585104 (Karnataka)

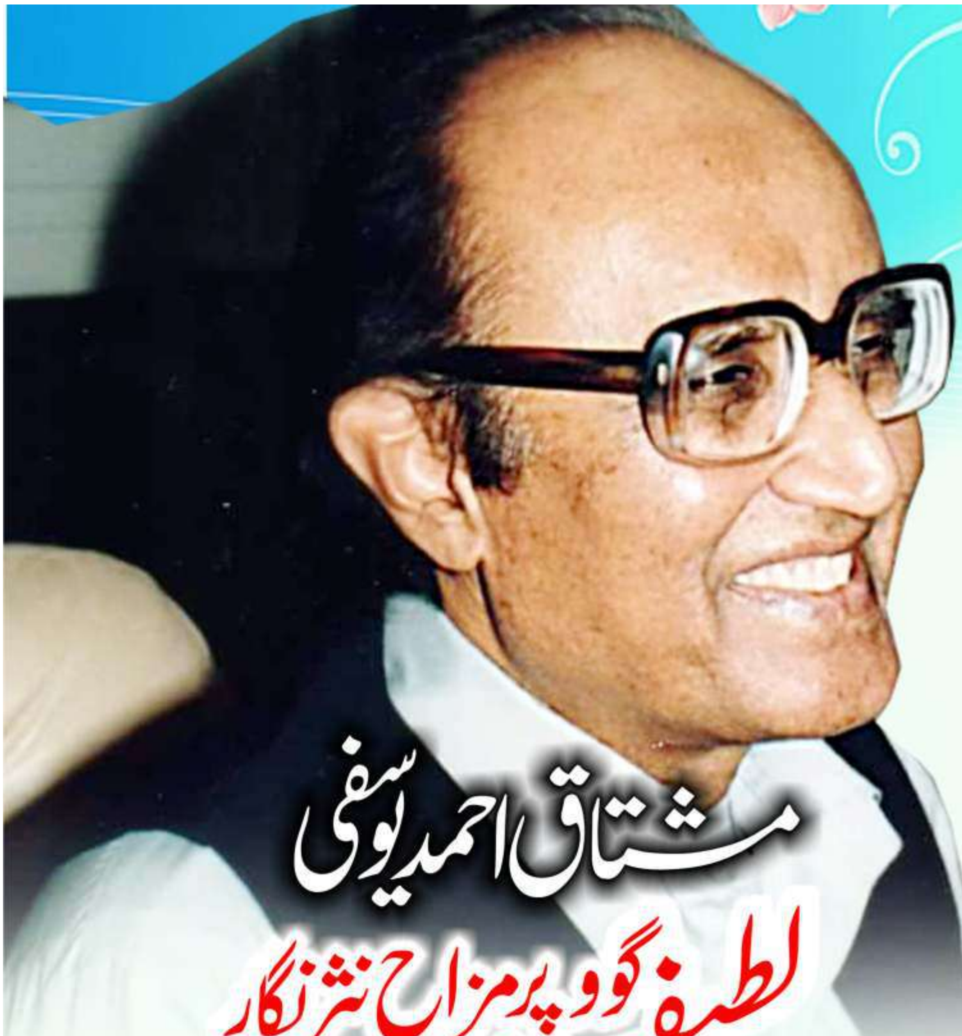

مشتاق احمد یوسفی

لطیفہ گو و پرمزاح نثر نگار

سید الفت حسین

مشتاق احمد یوسفی کا شمار اردو کے مشہور اور سربرآوردہ مزاح نگاروں میں ہے۔ ان کا تعلق تعلیم یافتہ پٹھان خانوادے سے تھا۔ ان کی پیدائش 4 ستمبر 1923 (یکم محرم الحرام 1342ھ) کو ان کے آبائی وطن جے پور کی مسلم ریاست ٹونک، راجستھان (ہند) میں ہوئی۔ ان کے والد عبدالکریم خان یوسفی ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور دیندار شخص تھے اور کئی نسل سے جے پور میں آباد تھے۔ یوسفی نے اپنی سوانح میں جو احوال و واقعات بیان کیے ہیں، بڑے دلچسپ ہیں۔ اپنی تاریخ پیدائش کے حوالے سے ایک جگہ فرماتے ہیں۔ میری اصل تاریخ پیدائش میں تھوڑا فرق ہے، جیسا کہ پہلے زمانے میں ہوتا تھا۔ ملازمت، پنشن وغیرہ کے متاثر ہونے کی وجہ سے میں اصل تاریخ پیدائش نہیں بتاؤں گا۔

یوسفی تیسری جماعت تک ٹونک میں زیر تعلیم رہے۔ پھر 1931 میں اپنے آبائی شہر واپس آ گئے۔ مہاراجہ ہائی اسکول جے پور سے میٹرک پاس کرنے کے بعد وہاں کے مہاراجہ کالج (راجپوتانہ بورڈ) سے فرسٹ ڈویزن سے انٹرمیڈیٹ کیا اور مہاراجہ کالج جے پور (آگرہ یونیورسٹی) سے 1943 میں امتیازی نمبروں سے بی اے میں کامیابی حاصل کی۔ انٹر میں انگلش لٹریچر، اردو اور تاریخ پڑھی جبکہ بی اے انگریزی، فلسفہ اور تاریخ میں کیا۔ انگریزی میں ریکارڈ قائم کیا اور انھیں کرنل اوگلوی گولڈ میڈل سے نوازا گیا۔ راجپوتانہ بورڈ سے گولڈ میڈل (انٹرمیڈیٹ) ملنے کے بعد وہ یونیورسٹی کے بھی پہلے مسلمان گریجویٹ ہوئے، جنھوں نے ریکارڈ قائم کیا اور میڈل حاصل کیا۔ اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے حصول کی غرض سے علی گڑھ پہنچے اور وہاں سے 1945 میں ایم اے ان فلاسفی ہوئے۔ یہ امتحان بھی فرسٹ ڈویزن میں پاس کیا۔ اسی عرصے میں ایل ایل بی میں بھی فرسٹ رہے۔ انھوں نے اپنے والد گرامی سے دینوی تعلیم اور قرآن پاک بارہ تیرہ سال کی عمر تک (ناظرہ) پڑھا اور اپنے والد سے قصص الانبیا مکمل سنی۔ ایک شامی اور ایک مصری ان کے استاد تھے، جن سے 57-1947 میں عربی سیکھتے رہے۔ تقسیم ہند کے بعد ان کے والد بچوں کے ہمراہ پاکستان ہجرت کر گئے اور 1950 ہی میں مسلم کامرشیل بینک سے وابستہ ہوئے۔ انھوں نے ''آب گم'' میں ہندو پاک کی تقسیم کے پس منظر میں یہاں سے ہجرت کرنے والوں اور ملک کے بٹوارے سے پیدا ہوئے خوشگوار اور ناخوشگوار نتائج پر خاص روشنی ڈالی ہے۔ پروفیسر محمد حسن اپنے ایک مضمون 'ست رنگے لمحوں کا تاجدار: مشتاق احمد یوسفی' میں رقمطراز ہیں:

''پیدائش ہندوستان کی ریاست راجستھان کے علاقہ مارواڑ کی ہے، جو بقول خود ان کے اونٹ، ریشماں اور مہدی حسن کے لیے مشہور ہے۔ سنہ یہی کوئی 65-64 کا ہوگا جس سے محققین ان کا سال پیدائش نکال سکتے ہیں (کیونکہ اپنی خود نوشت سوانح عمری 'زرگزشت' لکھنے کے باوجود اپنے حالات زندگی کی تدوین میں کسی قسم کا تعاون کرنے سے سختی کے ساتھ گریزاں ہیں) علی گڑھ یونیورسٹی میں زیر تعلیم رہے اور اس کے باوجود حس مزاح بچا کے لیے آئے (ایم اے او کالج کی بات دوسری تھی جس نے رشید احمد صدیقی کو پیدا کیا تھا) پاکستان بنا تو پہلے وہاں پھر لندن میں بقول ان کے کوچہ سودخوراں یعنی بینک کی ملازمت میں عمر بسر کی۔ دل کے آپریشن کے بعد اب پھر بینک آف کریڈیٹ اینڈ کامرس لندن سے سبکدوشی حاصل کر کے پاکستان پہنچ گئے ہیں۔ چار کتابوں کے مصنف ہیں جو چاروں کھونٹ شہرت اور مقبولیت حاصل کر چکی ہیں۔''[1]

یوسفی کو سرزمین ہند سے بہت لگاؤ تھا۔ پاکستان ہجرت کے بعد انھیں یہاں کی ہر چیز یاد آتی رہی۔ ان کی سوانحی تحریر یہاں کے شہر، گلی کوچے، صبح وشام، پھل پھول، پیڑ پودے، ندی پہاڑ، موسم اور رسم و رواج سے محبت کی مظہر ہے۔ ایک مضمون 'رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر' میں سرزمین ہند پر اپنے لڑکپن اور جوانی کے دن گزارنے کی طرف لطیف اشارہ کرتے ہوئے، یہاں کے قدرتی مناظر، مہکتی فضاؤں، تہذیبی شعاعوں کی عکاسی یوں کی ہے:

''جب تک ٹونک میں رہے اپنے مولد و آبائی مکن بُکن شے (بلند شہر کا وہ اسی طرح تلفظ فرماتے تھے) کے گن گاتے رہے۔ کراچی کو اپنا دارالقرار بنانے کے بعد بھی ان گلیوں سے نہیں نکلے جہاں جوانی کھوئی تھی۔ کہیں کسی بھلے آدمی کی تعریف ہو رہی ہو تو فوراً پوچھتے:

''کیا وہ بھی بُکن شے کا ہے؟''

کبھی کوئی لاہور کے موتیا، چناب روپ یا کراچی کی سہانی شام کی تعریف کردے تو مقابلے پر فوراً صبح بنارس، بدایوں کے پیڑے، ٹونک کے خربوزوں اور وَیں کی برقع پوش پٹھانوں کو کھڑا کر دیتے۔ دریائے بنارس کے کنارے کناے گلودگھاٹ کی ان مہکتی فالیزوں کو یاد کرتے، جہاں چاندنی راتوں میں لونگ کے لشکارے سے لہو میں شکارے ناچنے لگتے تھے۔ چھولداریوں کے سامنے دَف اور دائرہ پر وحشت بھرے 'چاربیت' گاتے گاتے ذراسی بات پر پنڈاری خانزادوں اور قائم خانی پٹھانوں کے سان چڑھے خنجر اور مرصّع پیش قبض لہرانے لگتے۔ ارمان بھرے سینے ان کے نیام بن جاتے اور خون میں نہاتے ہوئے جسم اُسی بالُو پہ تڑپ تڑپ کے ٹھنڈے ہوتے جہاں کیوڑے میں بسی ہوئی سُرخ صافی سے ڈھکی ہوئی، پانی کی قدآدم گول ٹھنڈی ہونے کے لیے دریائی ریتا میں گلے گلے تک گڑی ہوتی تھی۔ بنارس کی موجیں روز یہی منظر دیکھتی تھیں۔ پچھلے پہر تک جَوا سے باڑھ، بیلے کے گجروں، تازہ خون، لُو میں پکے ہوے خربوزوں، خَس کی پنکھیاں، مہندی رچے ہاتھوں کی نمی، سوندھے چھڑکاؤ، کوری ٹھلیا اور کورے پنڈے کی مہکار سے ہوائیں دیوانی ہوجاتیں۔ اور رات چاند کا جھومر اتار دیتی۔"[2]

یوسفی نے اس ملک میں شعور کی آنکھیں کھولیں، تعلیم کی تکمیل بھی یہیں کی اور ہجرت کے بعد اپنے کیریئر کا آغاز بینکر کی حیثیت سے کیا۔ ان کی تعلیم اور ملازمت کے متعلق یہ تحریر ملتی ہے کہ ان کی والدہ کی خواہش یوسفی کو ڈاکٹر بنانے کی تھی، وہ چاہتی تھیں کہ ان کا بیٹا معالج بن کر عرب جائے اور وہاں کے بدوؤں کا مفت علاج کرے۔ اس سلسلے میں طارق حبیب ان کی ادبی خدمات کے پیش نظر بہت اچھی اور پرلطف بات بیان فرماتے ہیں:

"دراصل قدرت مشتاق احمد یوسفی سے اس سے بھی بڑا کام لینا چاہتی تھی، اس لیے والدہ کی خواہش کے باوجود میڈیکل ڈاکٹر نہ بنے، بلکہ دنیائے ادب کے معالج بنے اور عرب کے بدوؤں کے بجائے ادب کے بدوؤں کا مفت نفسیاتی علاج کرنے لگے۔"[3]

مشتاق احمد یوسفی اردو ادب میں مزاح نگار کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں۔ انھوں نے طویل عمر پائی اور بہت سے شاہکار مزاحیہ مضامین لکھے جو ان کی شناخت بنے۔ 'صنف لاغر' ان کا باقاعدہ مطبوعہ مضمون ہے جو رسالہ ماہنامہ 'سویرا' لاہور میں پہلی بار شائع ہوا تھا۔ انھیں ان کے قیمتی ادبی خدمات کے اعتراف میں متعدد اعزازات اور ایوارڈ سے نوازا جاچکا ہے۔ انھیں ان کی کتاب 'خاکم بدہن' اور 'زرگزشت' کی اشاعت پر آدم جی ایوارڈ دیا گیا۔ 'آب گم' پر ہجرا ایوارڈ ملا، 1986 میں انھیں بولان ایوارڈ اور 2000 میں کمال فن ایوارڈ سے بھی نوازا گیا، نیز اعلیٰ اور باوقار ستارہ امتیاز (1999) اور ہلال امتیاز (2002) جیسے انعامات سے بھی سرفراز کیے گئے۔ پاکستان ایسوسی ایشن دبئی جسے ملک کے ادبی، ثقافتی اور سماجی روایات کو روشناس کرانے کا امتیاز حاصل ہے اس نے 22 جنوری 2009 کو 'جشن یوسفی' منعقد کر کے انھیں پہلا قائد اعظم ایوارڈ دیا اور ان کی عظمت کا بھرپور اعتراف کیا۔

یوسفی بینک کے شعبے میں مصروفیت کے باوجود خوب لکھتے رہے۔ ان کے بہت سے مزاحیہ ادبی مضامین، لطیفے اور اقوال وغیرہ دادوتحسین وصول رہے ہیں۔ ان کی تصانیف کے عنوان چراغ تلے، خاکم بدہن، زرگزشت، آبِ گم، شامِ یاراں اور 'اقوال یوسفی اور دیگر مضامین' ہیں۔ یہ سبھی کتابیں ان کی حیات میں ہی زیورطبع سے آراستہ ہوچکی ہیں۔ ان کی تمام تحریریں اپنے اندر خاص لطف واثر رکھتی ہیں۔ ان کے مضامین 'سویرا' لاہور، 'نصرت' لاہور، 'افکار' کراچی وغیرہ میں چھپتے رہے۔ ان پر 'شگوفہ'، حیدرآباد (مدیر، سید مصطفیٰ کمال) نے انجمن ترقی اردو (ہند) کی مدد سے مشتاق احمد یوسفی نمبر: شمارہ نمبر۔ 006 شائع کیا۔ یوسفی کی مزاح نگاری اور ادبی خدمات کے اعتراف میں دانشوران ادب نے طویل تحقیقی مقالے، مضامین اور آراقلم بند کیے۔ یہ سلسلہ ہنوز جاری وساری ہے۔

یوسفی کی مزاحیہ تحریریں اس امر پر دال ہیں کہ وہ ایک ذہین اور سنجیدہ انسان تھے اور ظرافت نگاری کی باریکیوں سے بخوبی واقف تھے۔ وہ صاحب اسلوب نثر نگار بھی تھے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ مختلف عہدہ ہائے جلیلہ پر فائز اور متمکن رہے جن کا ادب سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ انھوں نے باوجود اس کے اردو دنیا میں اپنی ایک منفرد پہچان بنائی۔ ایسا کیوں نہ ہو! اس لیے کہ ان کی شگفتہ تحریر ایک جگہ یہ اشارہ کرتی ہے کہ لکھنا اور پڑھنا شروع سے ان کا محبوب مشغلہ رہا ہے۔ اپنے ادبی انٹرویو کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا...... لکھنا پڑھنا ہمارے لیے منکوحہ نہیں بلکہ محبوبہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

عام طور پر یہ دیکھا جاتا ہے کہ جس فن کار کو عوام الناس کے درمیان رہنے کا موقع میسر ہوتا ہے اور وہ اپنی زندگی کے خاصے لمحات لوگوں کے درمیان رہ کر گزارتا ہے، اسے الگ الگ مکتب فکر کے لوگوں سے بھی بات چیت کا موقع میسر آتا ہے جن میں اس کا سامنا سماج اور افراد کے اعلیٰ وادنیٰ اذہان سے بھی ہوتا ہے۔ اسی لیے فن کار اور تجزیہ نگار اپنے اردگرد سے بہت متاثر دیکھے جاتے ہیں۔ ان کی تحریروں سے پتا چلتا ہے کہ یوسفی کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ جب وہ بینک کی ذمہ داریوں سے منسلک رہے سوسائٹی کے بے شمار لوگوں سے ان کا واسطہ پڑا۔ ان کے مشاہدے میں سوسائٹی کی جو تصویریں آئیں، انھیں بڑی فن کاری اور مہارت سے مزاح کے سانچے میں ڈھالنے کی سعی مستحسن کی۔

یوسفی کے یہاں طنز میں ہنسی اور ہنسی میں تنقید اس طرح گھل مل گئی ہے کہ ان کی باتوں میں ایک خاص کشش اور جاذبیت پیدا ہوگئی ہے جسے ہم فن اور فن کار کا کمال کہہ سکتے ہیں۔ ہنسی اور مسکراہٹوں کے ساتھ زندگی کے انتقاد میں جو چند اہم نام لیے جاتے ہیں ان میں مشتاق احمد یوسفی بھی خاص مقام رکھتے ہیں۔ انھوں نے یہ اشارہ دیا کہ وہ اس میدان میں مارک ٹوئن، سوئفٹ، اسٹیفن لی کاک، جیمز جوئس، جارج کمیش اور پھر انتھولی برجیس کو بہت پسند کیا، لیکن وہ کہتے ہیں کہ مجھ پر ایک زمانے میں لارنس ڈول بھی بہت سوار رہا۔ اس طرح سے مشتاق احمد یوسفی نے اردو مزاحیہ نثر نگاری کو رشید احمد صدیقی، خواجہ حسن نظامی، پطرس بخاری، فکر تونسوی، شفیق الرحمٰن، شوکت تھانوی کے بعد ایک نئی سمت سے ہم آہنگ کیا۔ ان کی سوشل اور پولیٹیکل بصیرت نے اردو مزاح کو نئی جہت دی۔ معاشرے کے نادان، بیوقوف افراد اور سماجی نظم ونسق میں آئی کمزوریوں پر ہنسی ہنسی میں وار کرنے کا ان کے اندر خاص ہنر پایا جاتا ہے۔ ان کے اکثر مضامین میں ہماری سوسائٹی کی مضحکہ خیز کمزوریوں اور غلطیوں پر طنز وتنقید ملتی ہیں۔ 'پہلا پتھر'، 'پڑیئے گر بیمار'، 'تو نے پی ہی لی'، 'چارپائی اور کلچر'، 'کرکٹ'، 'پروفیسر'، 'بائی فوکل'، 'چند تصویر بتاں'، 'سیزر، ماتا ہری اور مرزا' وغیرہ اس قبیل کی اہم مزاحیہ تخلیقات ہیں۔ ان کے ایک مضمون 'پڑیئے گر بیمار' کا یہ اقتباس دیکھیے۔ وہ بیمار کی عیادت میں جانے والے کم عقل وادنیٰ فکر بلکہ مکار شخص کی کس طرح سے خبر لیتے ہیں:

"کچھ ایسے عیادت کرنے والے بھی ہیں جن کے انداز پرسش سے ظاہر ہوتا ہے کہ بیماری ایک سنگین جرم ہے اور وہ کسی آسمانی ہدایت کے بموجب اُس کی تفتیش پر مامُور کیے گئے ہیں۔ پچھلے سال جب انفلوئنزا کی وبا پھیلی اور میں بھی صاحبِ فراش ہوگیا تو ایک ہمسائے جو کبھی پھٹکتے بھی نہ تھے، کمرۂ علالت میں بہ نفسِ نفیس تشریف لائے اور خوب کُرید کُرید کر جرح کرتے رہے۔ بالآخر اپنا مُنہ میرے کان کے قریب لا کر رازدارانہ انداز میں کچھ ایسے

بھی سوالات کیے جنکے پوچھنے کا حق میری ناچیز رائے میں بیوی اور منکر نکیر کے علاوہ کسی کو نہیں پہنچتا۔‘‘[4]

یوسفی میں انسان کے پرکھنے کی بے پناہ صلاحیت مضمر تھی۔انھوں نے اپنے مضمون میں انسان کے رکھ رکھاؤ، رفتار و گفتار، تہذیب و تمیز، افہام وادراک، رہن سہن وغیرہ پر خاص نظر رکھی۔ ان کے یہاں روایتی اور جدید طرزِ فکر ملتی ہے جو ان کی ظریفانہ پختگی اور شائستگی میں اضافہ کرتی ہے۔انسانوں کی عقلی اور عملی تنزلی کو لفظوں کے پیکر میں ڈھال کر ہنسی کا موقع نکال لینے میں انھیں مہارت حاصل ہے۔ان کے یہاں بہت قیمتی اور سبق آموز اقوال ملتے ہیں جو ان کی کتابوں میں جابہ جا بکھرے پڑے ہیں:

- جتنا وقت اور روپیہ بچوں کو 'مسلمانوں کے سائنس پر احسانات' رٹانے میں صرف کیا جاتا ہے، اس کا دسواں حصہ بھی بچوں کو سائنس پڑھانے میں صرف کیا جائے تو مسلمانوں پر بڑا احسان ہوگا۔
- یہ ایک حقیقت ہے کہ انگلستان کا موسم اگر اتنا ظالم نہ ہوتا تو انگریز دوسرے ملکوں کو فتح کرنے ہرگز نہ نکلتے۔
- دنیا میں غالب واحد شاعر ہے جو سمجھ میں نہ آئے تو دُگنا مزا دیتا ہے۔
- بقول مرزا 'دنیا میں جتنی لذیذ چیزیں ہیں' ان میں سے آدھی تو مولوی صاحبان نے حرام کر دی ہیں اور بقیہ آدھی ڈاکٹر صاحبان نے!
- جب مرزا عبدالودود نے ہم سے پوچھا کہ آخر مرغ اذان کیوں دیتا ہے؟ تو ہم نے سیدھے سبھاؤ یہی جواب دیا کہ اپنے مالک کی حمد وثنا کرتا ہے۔ کہنے لگے،''صاحب! اگر یہ جانور واقعی عبادت گزار ہیں تو مولوی اسے اتنے شوق سے کیوں کھاتے ہیں؟''
- اندرونِ لاہور کی بعض گلیاں اتنی تنگ ہیں کہ اگر ایک طرف سے عورت آ رہی ہو اور دوسری جانب سے مرد، تو درمیان میں صرف نکاح کی گنجائش بچتی ہے!!

ایک جگہ 14/ اکتوبر 2008 کی ہاتھ کی تحریر پر نظر گئی تو وہ یہ لکھتے ہوئے دیکھے گئے:

- یا اللہ' زوالِ نعمت سے پہلے' تیری نعمت کا احساس و اِدراک اس کی قدر' اس کا صحیح استعمال' تیرا شُکر اور تحدیثِ نعمت کی توفیق عطا کر۔ زوال نعمت سے پہلے۔

غرض ان کے یہاں زندگی کے ہر شعبے سے متعلق اقوال دیکھے جا سکتے ہیں۔'عطار بگوید' کے تحت ان کے فن و فکر کے سلسلے میں یہ صحیح کہا گیا ہے:

''ظرافت و بصیرت، تفکر و تفنن، مشاہدے اور مطالعے کا جو حسین امتزاج مشتاق احمد یوسفی کے یہاں ملتا ہے، وہ اردو مزاح میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔‘‘[5]

یوسفی کے کسی بھی مضمون کو پڑھ جائیے ان میں ایک نئی تازگی، نیا تجربہ، فکر کی عمدگی کا احساس ہوتا ہے۔ان کی شگفتہ نثر ان میں پائی جانے والی علمی و فنی بصیرت کا پرتو ہے۔مشتاق احمد یوسفی کے اکثر مضامین پر میں نے سرسری طور پر نگاہ ڈالی ہے۔ ان کے اکثر مزاحیہ مضامین انسانی شعبہ حیات سے متاثر ہیں۔حویلی، اسکول ماسٹر کا خواب، کار، کابلی والا اور الہ دین کا چراغ، شہر دو قصہ، دھیرج گنج کا پہلا یادگار مشاعرہ یا اسٹیشن، یادش بخیریا، مُذی، جنون لطیفہ، اور آنا گھر میں مرغیوں کا، موسموں کا شہر، کاغذی پیرہن، صنف لاغر سبھی مضمون مزاح سے بھرپور ہیں اور ان میں سوسائٹی میں در آئی خرابیوں پر سنجیدہ طنز و تنقید کی گئی ہے۔ان کی کتابوں میں اس مزاح سے لبریز جا بجا باتیں ملتی ہیں۔سب کو رقم کرنا مشکل ہے۔'زرگزشت' (سوانح عمری) بھی ان کا ایک اہم شاہکار ہے۔ یہ بھی ان کے اندر پائی جانے والی سنجیدگی و متانت اور بے پناہ علمی صلاحیت کا ثبوت ہے۔اس تصنیف کا اسلوب مزاحیہ ہے جس میں ان سے متعلق تفصیلات جمع ہوگئی ہیں۔ وہ اس میں ایک جگہ کراچی کے موسم کا مزاج بڑے مضحک انداز میں بیان کرتے ہیں اور استعارتاً اس شہر کی سردی کو منکوحہ کی جوانی سے تعبیر کرتے ہیں۔اس تصنیف کے پہلے سبق 'کتاب رِبا کا' کے اس اقتباس کو ملاحظہ کیجیے کس قدر لطیف انداز ہے:

''90 ڈگری ٹمپریچر اگر مئی میں ہو تو یہ موسم گرما کی علامت ہے۔اگر دسمبر میں ہو تو ظاہر ہے کہ جاڑا پڑ رہا ہے، البتہ جولائی میں 90 ڈگری ٹمپریچر ہو اور شام کو گرج چمک کے ساتھ بیوی برس پڑے تو برسات کا موسم کہلاتا ہے‘‘[6]

'پہلا پتھر' بھی ان کا ایک خوبصورت اور مزاح سے بھرپور مضمون ہے۔اس میں دیکھیے وہ گھر گرہستی کے حوالے سے کتنی اچھی رائے پیش کرتے ہیں:

''پھولوں، میں رنگ کے لحاظ سے' سفید گلاب اور خوشبوؤں میں نئے کرنسی نوٹ کی خوشبو بہت مرغوب ہے۔ میرا خیال ہے کہ سبز سبز تازہ تازہ اور کرارے کرنسی نوٹوں کا عطر نکال کر ملازمت پیشہ حضرات اور ان کی بیویوں کو مہینے کی آخری تاریخوں میں سنگھایا جائے تو گرہستی زندگی جنّت کا نمونہ بن جائے۔‘‘[7]

یوسفی کے یہاں ایک خاص بات یہ ملتی ہے کہ ان کے مضامین کا مجموعہ ہو یا ان کی سوانح، ہر تصنیف کی ابتدائی تحریر یعنی' مقدمہ' میں بھی مزاحیہ اسلوب اختیار کرتے ہوئے دیکھے گئے ہیں۔ان کا اپنا تعارف ہو یا کتاب کا تعارف، سادہ اور سہل الفاظ کے سہارے ظرافت کے پہلو نکال لیتے ہیں جسے ہم ان کا کمال ہی کہہ سکتے ہیں۔'دست زلیخا' بھی ان کی اسی سلسلے کی تحریر ہے جس میں انھوں نے اپنی ایک دوسری کتاب کا بڑے مزاحیہ انداز میں تعارف فرمایا ہے جس کو پڑھنے کے بعد قاری تبسم کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ انسان کی عمر گزرنے کے ساتھ اس میں پیدا ہونے والی صلاحیت اور ذہنی بالیدگی و پختگی کی طرف پرلطف انداز میں اشارہ کرتی ہے:

''یہ کتاب 'چراغ تلے' کے پورے آٹھ سال بعد شائع ہو رہی ہے۔جن قدردانوں کو ہماری پہلی کتاب میں تازگی' زندہ دلی اور جواں سالی کا عکس نظر آیا' ممکن ہے' ان کو دوسری میں کہولت کے آثار دِکھلائی دیں۔ اس کی وجہ ہمیں تو یہی معلوم ہوتی ہے کہ ان کی عمر میں آٹھ سال کا اِضافہ ہو چُکا ہے۔‘‘[8]

یوسفی نے جہاں انسان کی نادانی اور بیوقوفی سے ہونے والی پریشانیوں پر نگاہ رکھی، وہیں انھوں نے سطحی سوچ اور غلط شوق پالنے والے نیز شکوہ و شکایت سے کام لینے والے افراد کا بھی مضحکہ اڑایا ہے۔اس سلسلے میں کئی بہترین مضامین ملتے ہیں۔ ان کا مضمون 'موسموں کا شہر' جہاں انسان کی نادانی اور بیوقوفی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ وہیں 'صنف لاغر'، کچھ عورتوں میں پائی جانے والی حماقت کو ظاہر کرتا ہے۔اگر انسان کی بے حسی دیکھنی ہو تو ہمیں 'چارپائی اور کلچر' پر نظر ڈالنی چاہیے۔ 'پہلا پتھر' میں گرہستی زندگی کا عکس دیکھا جا سکتا ہے۔ ان کا مضمون 'کاغذی ہے پیرہن' سماج کی کچھ بے حیا عورت کی خبر لیتا ہے۔ ان کے دیگر مضامین میں سماجی، سیاسی، اخلاقی اور تعلیمی بوالعجبیوں کے علاوہ عورت کی بے حیائی اور مرد کی آوارگی پر خاص طنز و تنقید ملتی ہے۔

حواشی:

1. مآخذ تاریخ ادب اردو (جلد اول)، پروفیسر وہاب اشرفی، ص 16-17
2. زرگزشت، مشتاق احمد یوسفی، ص 67-68
3. ایضاً، ص 19
4. چراغ تلے مشتاق احمد یوسفی، ص 28
5. فلیپ کی تحریر خاکم بہ دہن، مشتاق احمد یوسفی
6. زرگزشت، مشتاق احمد یوسفی، ص 22
7. چراغ تلے، مشتاق احمد یوسفی، ص 15
8. 'خاکم بدہن'، مشتاق احمد یوسفی، ص 8

Syed Ulfat Hussain
C/o Rahat Manzil
Village: Alinagar, Bhekpur
Post:Chainpur, Distt: Siwan-8412031 (Bihar)

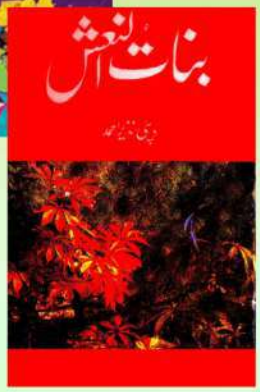

ڈپٹی نذیر احمد کی ناول نگاری

محمد احمد دانش روانوی

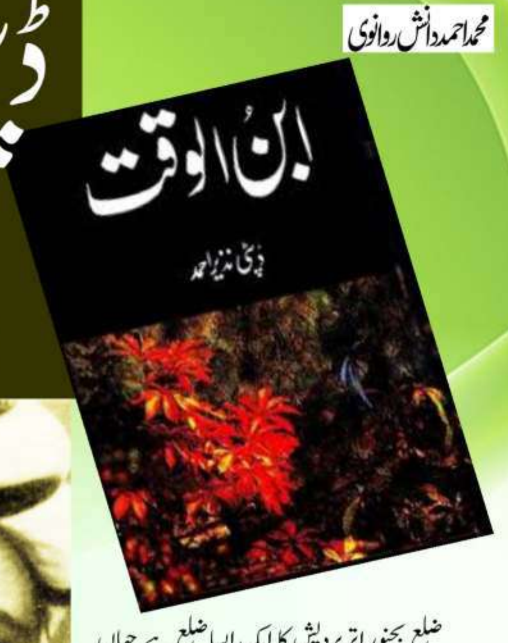

ضلع بجنور اتر پردیش کا ایک ایسا ضلع ہے جہاں مختلف شعری اصناف غزل، رباعی، قطعہ، پابند و آزاد نظم اوپیرا نگاری (منظوم، رقص ڈرامہ) وغیرہ میں یہاں کے شعرا نے نہ صرف طبع آزمائی کی بلکہ اپنی قادرالکلامی و پختگی فن سے مقبول عام بنایا تو وہیں نثری اصناف میں تاریخ نگاری، افسانہ اور ناول نگاری میں بھی یہاں کے ادبا نے شہرت وقبولیت عام کے جھنڈے گاڑے ہیں ضلع بجنور کی مردم خیز سرزمین سے ابھرے مایہ ناز ادیب ڈپٹی نذیر احمد نے 1869 میں 'مراۃ العروس' جیسا شاہکار ناول تصنیف کرکے نثر میں کہانی کی قدیم مروج صنف داستان گوئی کے بعد کہانی کی صنف جدید ناول سے اردو دنیا کو متعارف کرایا انھیں کے نشانِ قدم پر چلتے ہوئے نذر سجاد حیدر ولادت 1892 نے اختر النساء بیگم سنہ تصنیف 1910 جانباز 1935 آہ مظلوماں، 1914 ثریا 1931، نجمہ 1939 اور 'حرماں نصیب' وغیرہ ناول اردو دنیا کو دیے۔ بعدہ عشرت کرت پوری نے ناول 'بھرم' لکھا۔ فرقان احمد صدیقی نے 'پیاسی روح' اور 'کشمکش' جیسے ناول تحریر کیے تو کوثر چاند پوری نے ویرانہ، پیاسی جوانی، اغوا، توڑ دو، زنجیریں، مسکراتی کلیاں، مہکتی بہاریں، عشق نہ دیکھے، گونگا ہے بھگوان، میری شام غزل، مرجھائی کلیاں، سب کی بیوی، پتھر کا گلاب وغیرہ ناول اردو دنیا کو دیے۔ رفعت سروش، شہناز کنول نے بھی ناول نگاری میں نام کمایا تو وہیں اظہار اثر نے متعدد ناول لکھ کر سسپنس (تجسس) کے رنگ میں ابن صفی کی نمائندگی کی۔ معروف مصنفہ قرۃ العین حیدر نے میرے بھی صنم خانے، چاندنی بیگم، گردش رنگ چمن جیسے شہرۂ آفاق ناول تحریر کیے اور کرداروں کی زبانی واقعاتی بنت کے ذریعے ناول کے پلاٹ میں ہزاروں سال پرانی تہذیب کو سمیٹا الغرض سرزمینِ بجنور کے ادبا نے جو ناول تحریر کیے ان میں اصلاح معاشرہ خانگی مسائل، تعلیم نسواں، اصلاح نسواں جیسے مسائل اور موضوعات کو منفرد اور مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے جس میں نذیر احمد کو ناول کے موجد اور پیش رو کی حیثیت سے بقائے دوام حاصل رہا ہے۔ ناول داستان کے بعد کہانی کی جدید اور ترقی یافتہ صنف ہے جس میں انسانی زندگی سے وابستہ واقعات کو کہانی کی شکل میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے نیز واقعہ مخصوص کو ناول کے پلاٹ میں اس طرح مربوط کردیا جاتا ہے کہ کرداروں کی زبانی مکالماتی شکل میں بیان شخصی سیرت کے متعدد پہلو نفسیات اور جبلی خصوصیات کی ترجمانی کے ساتھ کچھ اس طرح ابھر کر سامنے آتے ہیں کہ ناول میں بیان واقعات کی تصویر کشی ہو بہو ہمارے ذہن و تخیل کے پردے پر پردۂ سیمیں کی طرح واضح طور پر منعکس ہونے لگتی ہے اور خیالات میں ہی تمام مناظر یکے بعد دیگرے ابھرتے چلے جاتے ہیں۔ ناول میں ابتدا سے ہی عشق و رومان کے ساتھ ساتھ زندگی کے مختلف پہلوؤں اور مسائل کو ذریعہ اظہار بنایا جاتا رہا ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد 6 دسمبر 1836، جائے پیدائش موضع ریہڑ پرگنہ افضل گڑھ تحصیل نگینہ بجنور متوفی 3/4 مئی 1912 بمقام دہلی نہایت ذہین تھے۔ ان کی تعلیم وتربیت، پرورش و پرداخت جس ماحول میں ہوئی اس میں روشن خیالی، فکری وسعت اور ذہنی کھلے پن کے برخلاف ایک ایسا ماحول تھا جس میں قدامت پرستی، فکری انحطاط کا غلبہ تھا۔ نذیر احمد اپنی فطرت کے مطابق اس ماحول سے بغاوت پر آمادہ تھے۔ اتفاقی طور پر دہلی کالج کے پرنسپل سے ملاقات کے سبب انھیں جنوری 1845 میں دہلی کالج میں داخلہ مل گیا جس کے نتیجے میں انھیں ان کے ناپسندیدہ ماحول سے چھٹکارا مل گیا۔ ان کے مزاج کے اسی تنوع نے انھیں ایسی فکری جلا بخشی جو ان کے لیے حصول علوم عصریہ اور ان کی وسعت فکر و خیال کا سبب بنا جس کی بنا پر وہ نہ صرف جید ادیب بنے بلکہ ناول جیسی جدید صنف کے موجد کہلائے اور ناول میں مکالمہ نگاری کے باوصف ایک ایسے جدید طرز بیان کو متعارف کرایا جس کی تقلید موجودہ عہد کے فکشن میں قرۃ العین حیدر (آگ کا دریا)، جیلانی بانو (ایوانِ غزل)، حیات اللہ انصاری (لہو کے پھول)، عبداللہ حسینی (اداس نسلیں)، شوکت صدیقی (خدا کی بستی) جیسے لجنڈ فنکاروں کے فن پاروں میں دیکھے جاسکتے ہیں جنھوں نے اپنے فن پاروں میں منفرد طرزِ نگارش کے سبب میدان ادب میں شہرت و ناموری کے جھنڈے گاڑے ہیں اور ڈپٹی نذیر احمد کی ایجاد کردہ اس نئی طرز کو

بام عروج تک پہنچایا ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں مراۃ العروس، بنات النعش، توبۃ النصوح اور ابن الوقت سبھی کا موضوع اصلاح معاشرہ، مثبت اور صالح اخلاقی قدروں کی آبیاری، تعمیری فکر اور وسعت خیال کی ترویج اشاعت رہا ہے جس کو انھوں نے اپنے ناولوں کے پلاٹ میں کرداروں کی نفسیات کی گرہ کشائی، مکالمہ نگاری، پلاٹ میں واقعات کی بنت اور بیانیہ اسلوب کے ذریعہ بخوبی نبھانے کی کوشش کی ہے۔

'مراۃ العروس' نذیر احمد کا پہلا ناول ہے جو 1869 میں شائع ہوا جس کے دو مرکزی کردار دور اندیش خان کی دو بیٹیاں اکبری اور اصغری دونوں سگی بہنوں میں بڑی بہن اکبری کی پیدائش نانیہال میں ہونے کے سبب اس میں جہالت، بدمزاجی، عقل اور امور خانہ داری سے ماورا خود کے چونچلوں کی آسودگی بے ہنری بدسلیقگی جیسے برے او صاف اس کی شخصیت وسیرت میں درآتے ہیں جن کے سبب سسرال کی لاکھ کوششوں کے باوجود اس کی اصلاح نہیں ہوپائی۔ شوہر کو لے کر گھر سے علیحدہ ہوجاتی ہے، اپنی بیوقوفیوں، بچکانہ حرکتوں سے خانہ داری کو تباہ کرکے رکھ دیتی ہے گھر کا اثاثہ مٹا ڈالتی ہے اور گھر کو برباد کرکے رکھ دیتی ہے۔

اکبری کی چھوٹی بہن جس کی پرورش، تعلیم وتربیت گھر پر اچھے انداز میں ہوتی ہے جو سلیقہ مندی، امور خانہ داری میں ماہر ہے، جب شادی ہوکر اپنی سسرال جاتی ہے تو گھر کو جنت نظیر بنا دیتی ہے۔ لڑکیوں کی تعلیم کے لیے مکتب کھولتی ہے جہاں لڑکیوں کو بلامعاوضہ پڑھاتی ہے اپنی نند محمودہ میں بھی اپنی کوشش سے بڑے گھرانے کی تمام صلاحیتیں پیدا کردیتی ہے جس کے نتیجے میں سسرال والوں کی توجہ اور چاہت کا مرکز بن جاتی ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے ناول میں ان دونوں سگی بہنوں کی سیرت و شخصیت کا تقابلی اظہار اتنے مؤثر انداز میں کیا ہے کہ قاری پر بخوبی واضح ہوجاتا ہے کہ تربیت کا اثر انسان کی زندگی، شخصیت و کردار پر پڑتا ہے اور نتیجے کے طور پر تربیت کے نقوش اس کی شخصیت پر مرتسم ہوتے ہیں۔

بنات النعش:

نذیر احمد کا دوسرا ناول ہے جس میں ناصحانہ رنگ غالب ہے۔ واعظانہ طرز ناول مذکور کی سطروں میں نمایاں دیکھا جاسکتا ہے جو قاری کے لیے سپاٹ پن، روکھا اور پھیکا پن کا سبب بن جاتا ہے جس کے نتیجے میں پلاٹ قاری کو اپنے ساتھ مطالعہ کے لیے باندھے رکھنے میں ناکام رہتا ہے قاری اکتا جاتا ہے اور نذیر احمد کا استانی کے الفاظ میں یہ دعویٰ ہے کہ اس کتاب میں تم مکتب کی سب لڑکیوں کی ہو بہو تصویریں پاؤ گی، اور تصویر سے مراد یہ ہے کہ تمہارے مزاج تمھاری عادت، تمھاری خوبیوں کا اس میں ایسا بیان کامل ہے جو تمھارے حالات سے واقف ہے، کتاب کے پڑھنے کے ساتھ سمجھ جائے گا کہ تمھارا تذکرہ ہے۔ میں دعوے کی یکسر نفی ہوتی ہے۔

مذکورہ ناول 'مراۃ العروس' کا تتمہ ہے جس میں اصغری لڑکیوں کے لیے مکتب کھولتی ہے اور ان کی تعلیم واصلاح کا کام اپنے ذمے لیتی ہے۔ ناول میں حسن آرا بیگم کا کردار اکبری سے بھی زیادہ بدمزاج ہے مگر اصغری کی تعلیم وتربیت سے وہ سدھر کر معاملہ فہم اور شائستہ بن جاتی ہے۔

قصبہ کے ضمن میں نذیر احمد نے زمین کی کشش، وزن مخصوص، زمین کی مقناطیسیت، زمین کی جسامت، تمدنی ضروریات، لوازم شہرت و معاشرت جیسی علمی باتوں کے تذکرے سے ناول کو قصہ گوئی سے زیادہ علمی کتاب بنا دیا ہے۔

توبۃ النصوح سنہ تصنیف 1873، ڈپٹی نذیر احمد کا اصلاحی ناول ہے جس کو چند ناقدین نے اردو کا پہلا ناول قرار دیا ہے حالانکہ اس سے قبل ڈپٹی نذیر احمد کے دو ناول 'مراۃ العروس' (1869)، 'بنات النعش' (1872) میں زیور طباعت سے آراستہ ہوکر منصۂ شہود پر آچکے تھے اور قارئین سے شرف قبولیت حاصل کرچکے تھے جن ناقدین نے 'توبۃ النصوح' کو اردو کا پہلا ناول قرار دیا ہے ان کے نزدیک مذکورہ ناول میں ناول کے جملہ عناصر کو پختگی فن سے فنی مہارت کے ساتھ برتا گیا ہے۔ توبۃ النصوح کا پلاٹ ڈینئل ڈیفو کے ناول فیملی انسٹرکٹر سے ماخوذ ہے لیکن نذیر نے اسے اپنے فنی مشاہدے اور تجربے سے الفاظ و بیان کا ایسا جامہ پہنایا ہے اور واقعاتی بنت اور تسلسل سے کہانی کے پلاٹ میں اس انداز سے لکھا ہے کہ قارئین میں انتہائی مقبول ہوگیا ہے۔ 'توبۃ النصوح' کا موضوع خاندانی اصلاح ہے جس میں راوی کے طور پر خود نذیر احمد نصوح کے کردار میں مرکزی حیثیت سے جلوہ گر نظر آتے ہیں جیسے نصوح خود نذیر احمد کا ہی ہمزاد ہو اس کے علاوہ کلیم، نصوح کا بڑا بیٹا، نصوح کی بیگم، نصوح کی خادمہ، ان کی بڑی بیٹی نعیمہ، چھوٹی بیٹی فہمیدہ اور ضمنی کردار کے طور پر کلیم کا دوست مرزا ظاہر دار بیگ جو اگرچہ ناول میں بہت کم وقت کے لیے نمودار ہوتا ہے مگر اپنا تاثر قارئین پر دیرپا چھوڑ جاتا ہے ظاہر دار بیگ کا کردار بحیثیت دوست خلوص و ہمدردی سے عاری صرف لفظی ظاہر دارانہ ہمدردی کا عکاس ہے جسے ظاہر دار کے کردار میں انتہائی خوبصورتی کے ساتھ نبھایا گیا ہے ناول میں نصوح کے عارضۂ ہیضہ میں مبتلا ہونے کے بعد ڈاکٹر کے ذریعہ نشہ آور دوائی دیے جانے کے نتیجے میں عالم خواب میں روز محشر کا عالم بپا ہونے کے نتیجے میں خواب سے بیدار ہوکر گھر کی اصلاح کرنے کے لیے اٹھائے گئے اقدام پر ابتدا سے کلائمکس تک ناول کے کینوس پر مرکوز ہے۔ نصوح کا خیال ہے کہ تربیت اولاد والدین کی اہم ذمہ داری ہے اور وہ بھی عمر کے مخصوص وقت میں انجام دے کر اس کے مثبت نتائج حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ بے وقت تربیت کا نتیجہ حاصل ہوتا ہے جسے نصوح کے بڑے بیٹے کلیم جو ناز ونعم میں پلنے کے سبب چوسر اور شطرنج کا شوقین ہوگیا ہے اور تمام اصلاحی کوششوں کے باوجود بغاوت پر آمادہ ہوجاتا ہے دوسرا کردار خود ان کی بڑی بیٹی نعیمہ کا ہے جو بے حد خودسر اور ضدی ہے اور دینی امور نماز وغیرہ کو غیر ضروری اور بے کار سمجھتی ہے۔

ناول زبان و بیان، مکالمہ نگاری، منظرنگاری کے لحاظ سے پرتاثیر ناول ہے کلیم ناراض ہوکر جب گھر سے فرار ہوتا ہے اور رات کو ایک مسجد میں قیام کرتا ہے اس مسجد میں چمگادڑ کے گھونسلوں، دیوار کے پلستر جھڑنے، دیوار کی دراز اور کواڑ کے روزنوں اور صفوں میں کھٹملوں کی بہتات وغیرہ کے بیان نے پلاٹ میں مزاح کا رنگ بھر دیا ہے اور پلاٹ میں انوکھی اور دلچسپ منظرکشی پیدا کردی ہے۔ ناول کے بیانیہ میں اصلاح کے زعم میں ڈپٹی نذیر احمد نے نصوح کا کردار کچھ اس طور پر پیش کیا ہے کہ نصوح کے نزدیک مثنوی بدر منیر، آرائش محفل، قصہ بکاؤلی، ہزلیات چرکین، اور گلستان سعدی جیسی ادبی و معتبر کتابیں بھی مخرب اخلاق اور معاشرتی بگاڑ کا سبب قرار دے کر ممنوع اور ترک مطالعہ قرار دی جاتی ہیں۔ 'ابن الوقت' ناول کی تکنیک میں ڈھلی ایسی طویل کہانی ہے جس کا مرکزی کردار ایک ایسا شریف زادہ ہے جو معاشرتی طور پر مغربی وضع قطع اور مغربی طرز زندگی کا پروردہ ہے مگر انگریز نما حکومت کے غرور کو قطعاً پسند نہیں کرتا، نتیجے میں انگریزوں کے معاشرے میں اس مغرب زدہ شریف کو بھی قبول عام حاصل نہیں ہوتا۔ ناول میں دکھایا گیا ہے کہ اپنی مخصوص خوبی اور تشخص چھوڑ کر کوئی بھی انسان غیروں میں مقبول نہیں ہو پاتا۔ اس لیے انسان کو اپنی مخصوص وضع اور طرز زندگی کا پابند اور پروردہ رہ کر ہی زندگی گزارنی چاہیے جو اس کے تشخص کی ضمانت کے ساتھ ساتھ اس کے معاشرتی وقار اور قبولیت کی بھی عکاس ہو۔ بلاشبہ ڈپٹی نذیر احمد اپنے جملہ ناولوں میں جوان کا اصلاحی، مقصدی موضوع ہے، کو نبھانے میں بحیثیت مجموعی کامیاب رہے ہیں۔

■

Mohd Ahmad Danish Ravanvi
Kashany-e-Gulzar, Bilmuqabil Taj Palace
Taj Colony, Raja Katajpur
Bijnore - 246735 (UP)
Mob.:9759418047

محمد شارب

قاضی عبدالستار
ایک منفرد فنکار

قاضی عبدالستارایک کامیاب ناول نگار تھے۔ ان کی زبان اوراسلوب تخلیقی ہے۔ اسی وجہ سے انھوں نے اپنے ناولوں میں بڑی مہارت کے ساتھ ابتدا تا انتہا باندھے رکھاہے۔ وہ اردو کے معروف فکشن نگاراور پدم شری اعزاز یافتہ تھےجن کا گزر جانا اردو فکشن کاایک بڑا سانحہ ہے۔ فکشن کی ایسی قدآور شخصیت خال خال ملتی ہیں۔ وہ عہد حاضر کےممتاز، معتبراور معمار فکشن ہونے کےساتھ ساتھ ایسی تخلیقی قوت کے مالک تھے جن کی عظمت کا اعتراف ان کے معاصرین کرتے ہیں۔ 8فروری 1933 میں سیتا پور ضلعے کے مچھریٹا گاؤں، اترپردیش میں پیدا ہوئے۔ وہ لمبے عرصے سے بیمار چل رہے تھے اور علاج کے دوران ہی 28اکتوبر 2018 کی رات کوسر گنگا رام ہاسپٹل، دہلی میں اپنے چاہنے والوں کوداغ مفارقت دے گئے لیکن ان کی ادبی خدمات انھیں تاحشر زندہ رکھے گی جسے فکشن کا قاری کبھی فراموش نہیں کرسکتا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے منٹوسرکل قبرستان میں انھیں سپرد خاک کیا گیا۔علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، شعبۂ اردو کے پروفیسراور صدر شعبہ بھی رہے۔ ملازمت کے فرائض سے باعزت سبکدوش ہونے کے بعد بھی ادبی مصروفیات سے وابستگی رہی اوراپنے قلم کالوہامنوایا۔

قاضی صاحب نے جہاں کثرت سے ناول رقم کیے وہیں افسانے بھی لکھے۔ان کے افسانوں کا مجموعہ'پیتل کا گھنٹہ' ہے جس میں شامل افسانوں کو پڑھ کران کی افسانوی صلاحیت کا اندازہ بخوبی لگا یاجا سکتا ہے۔ ان کا پہلا ناول 'شکست کی آواز' ہے جسے انھوں نے 1953 میں لکھا اور ادارۂ فروغ اردو، لکھنؤ سے جنوری 1954 میں شائع کیا۔ بعد میں یہ ناول 'دودِ چراغ' کے نام سے بھی شائع ہوا۔ ہندی والوں نے ا سے 'پہلا اور آخری خط' کے نام سے شائع کروایا۔ قاضی صاحب کا دوسرا ناول 'شب گزیدہ' ہے جو 1959 میں رسالہ 'نقوش' میں شائع ہوا۔ اس کے بعد ان کے کئی ناول بادل، داراشکوہ (1976)، صلاح الدین ایوبی (1968)، مجو بھیا (1974)، غبار شب (1974)، غالب (1968)، خالد بن ولید (1995)، وغیرہ تواتر کے ساتھ منظر عام پرآئے اور انھیں فکشن کی دنیا میں حیات جاویدانی عطا کی۔ان کے اسلوب بیان نے ایک ادبی مزاج کی تعمیر وتشکیل میں نمایاں رول ادا کیا ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ ان کے ناول 'حضرت جاں' اور 'تاجم سلطان' نے ان کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کی رفتارکومتاثر بھی کیا بلکہ یوں کہا جائے کہ قاضی صاحب کے کیرئیر میں عارضی ٹھہراؤ پیدا کیاتو غلط نہ ہوگا۔ بقول خالداشرف:

''قاضی عبدالستار کے ناول عام طور پر دوموضوعات کا احاطہ کرتے ہیں— اول تقسیم وطن کے نتیجہ کے طور پر یوپی کے مسلم جاگیرداروں کا زوال اور دوم مسلم فاتحین ومفکر کی تاریخ۔ اسی لیے ان کے کچھ ناول بنیادی طور پر تاریخی ناولوں کے زمرے میں آتے ہیں۔ 'آنگن' کی طرح قاضی عبدالستار کے یہاں بھی کہیں سیاست گھروں میں باپ بیٹوں اور بھائیوں کے درمیان دیواریں کھڑی کرتی نظرآتی ہےتو کہیں یہ نوجوان رئیس زادوں کوسب کچھ تیاگ کرگاندھی جی کے بتائے ہوئے راستے پرچل کر جدوجہد کی تلقین کرتے ہیں۔''[1]

قاضی صاحب کاپسندیدہ موضوع اودھ کے جاگیردارانہ نظام کا زوال ہے جسے انہوں نے اپنے کئی ناولوں میں برتا ہے۔ ان کومکمل طور پرتاریخی ناول نگار کی حیثیت سے دیکھنا میری سمجھ سے زیادتی ہوگی کیونکہ ان کے ناولوں

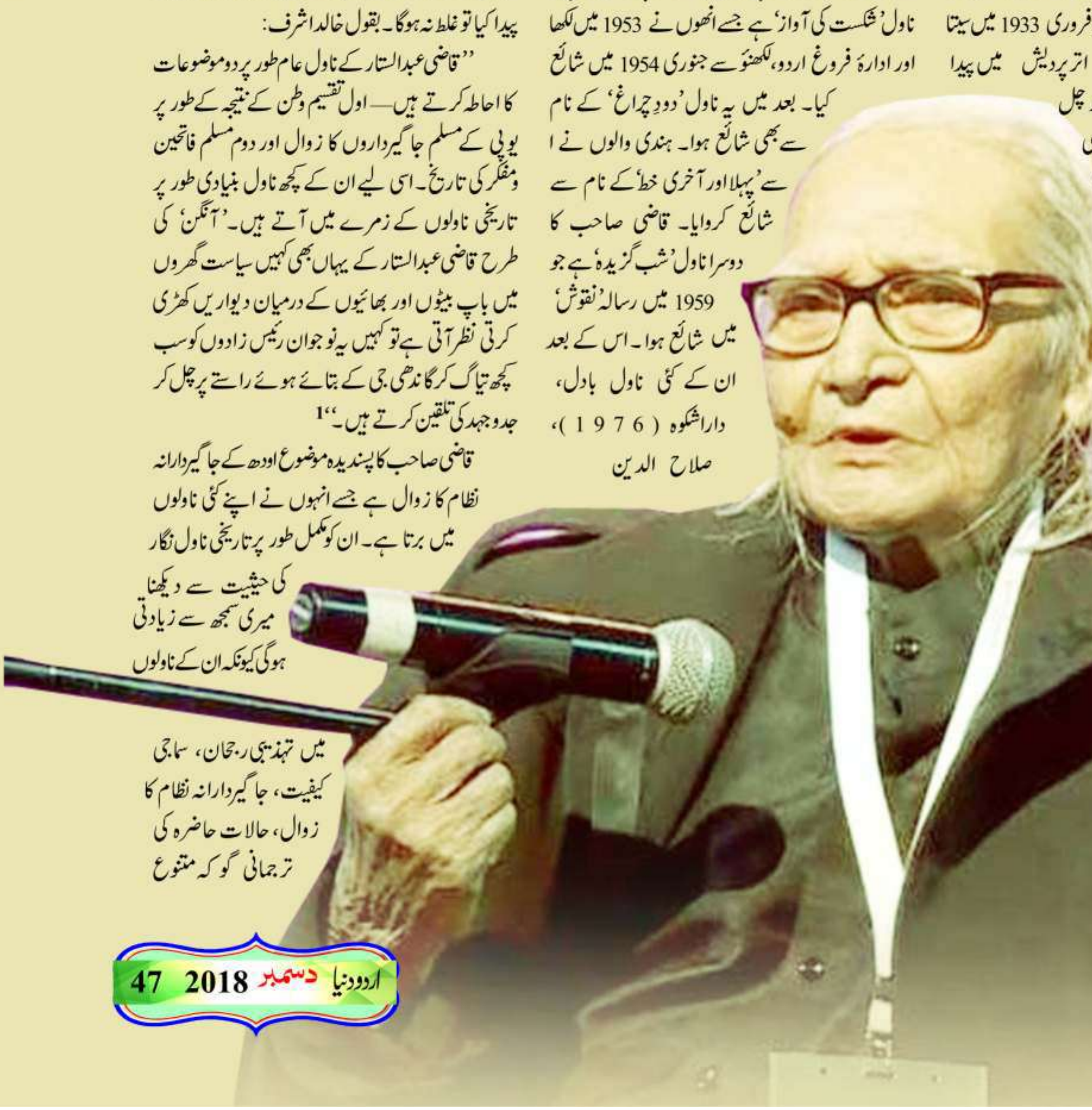

میں تہذیبی رجحان، سماجی کیفیت، جاگیردارانہ نظام کا زوال، حالات حاضرہ کی ترجمانی گو کہ متنوع

موضوعات ان کے فکشن کے ترکش میں موجود ہیں جس کے جواز میں شکست کی آواز، شب گزیدہ، مجو بھیا اور 'بادل' کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ ناول 'شکست کی آواز' میں زمینداری کے خاتمے اور اس سے پیدا ہونے والے حالات کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ اس میں دکھایا گیا ہے کہ لال پور کے جاگیردار چودھری نعمت رسول کی تمام جاگیریں ختم ہو جانے کے بعد بھی وہ سابقہ آن بان اور شان وشوکت کو قائم رکھنے کا جھوٹا بھرم رکھتے ہیں اور اس کو برقرار رکھنے کے لیے ناجائز دولت کی حصولیابی میں منہمک ہو جاتے ہیں۔ یہ ناول اودھ کے جاگیرداروں کی کسمپرسی اور ان کے افلاس کا اظہار ہے۔ ذرا دیکھیں یہ اقتباس:

''اپنی بے کاری کا اسے بڑا غم ہے۔ مگر کیا کرے۔ نوکریاں تو موئی جیسے عنقا ہو گئیں — اس ہندو حکومت میں کون پوچھتا ہے ہم لوگوں کو۔ ورنہ اب تک تو ڈپٹی ہو گیا ہوتا میرا لال۔ انگریزوں کے وقت معلوم نہیں تمھاری اس گڑھی میں کتنے آئے اور تحصیل دار اور ڈپٹی ہو گئے۔''[2]

جاگیرداری ہاتھ سے نکل جانے کے بعد تعلیم یافتہ خاندانوں کے نوجوانوں نے ہندوستان ہی میں رہ کر سرکاری ملازمتیں حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن فرقہ واریت اور تنگ نظری کے اس دور میں مسلمان امیدواروں پر ملازمتوں کے دروازے بند کر دیے گئے۔ اس ناول میں جاوید، اجے اور سلمیٰ کے عشق کو بھی دکھایا گیا ہے جو اقتصادی کمزوریوں کی بنا پر ناکام رہتے ہیں۔ اس میں ایک اور جاندار کردار کنور وکرم راج سنگھ ہے جسے مصنف نے بھائی چارے کے نمائندے کے طور پر پیش کرتے ہوئے اپنے مسلم دوست کا انتقام ایک ہندو زمیندار کو قتل کر کے لیتا ہے۔ قاضی صاحب کا دوسرا ناول 'شب گزیدہ' کا موضوع بھی تقسیم ہند سے قبل کے اودھ کے جاگیردارانہ ماحول کی سسکتی زندگی اور اس کے خاتمے کا آئینہ دار ہے جس کا ہیرو جمی اپنے باپ کی ریاست کے نظم ونسق میں کمی لانا چاہتا ہے لیکن اس کا باپ اپنی نپی تلی زندگی اور کسی بھی طرح کی تبدیلی کے خلاف ہے کیونکہ وہ عہد جدید کے بدلتے تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کی صلاحیت کھو بیٹھا ہے۔ ملاحظہ ہو یہ اقتباس:

''آپ موٹر بھی رکھ لیجیے، فرنیچر بھی خرید لیجیے، آج کل کی مٹیا چینی سے دو چار الماریاں بھی بھر لیجیے لیکن دماغ سے یہ خناس نکال دیجیے کہ مصارف اس طرح کم ہو سکتے ہیں مصارف انہی کے ہوتے ہیں جن کو خدا مصارف کے لائق بناتا ہے۔ بدھو، خیراتی کے یہاں مصارف نہیں ہوتے۔''

''ابو — یہ بات میں نے اس لیے گوش گزار کی تھی کہ آئے دن اخباروں میں یہ آتا رہتا ہے کہ ہندوستان آزاد ہونے والا ہے اور ہندوستان آزاد ہونے کے بعد کانگریس حکومت جو کام سب سے پہلے کرے گی وہ یہ کرے گی کہ زمینداری ختم کرے گی۔''

''کیا؟''

ابوا تنے زور سے گرجے کہ جمی پریشان ہو گیا۔

''میری زمینداری چٹائی ہے؟ دری ہے؟ جاجم ہے؟ آخر کیا ہے؟ آخر کیا ہے؟''[3]

مذکورہ بالا اقتباس سے پتہ چلتا ہے فرسودہ تصورات کو اپنائے ہوئے ہے۔ اس طبقے کی ذہنی سخت گیری ہی اس کے خاتمے کی بڑی وجہ بنتی ہے۔ قاضی عبدالستار کے تخلیقی میلانات پر اس ماحول کے گہرے نشانات ہیں جس میں ان کی پرورش و پرداخت ہوئی۔ جاگیردارانہ نظام کی دم توڑتی زندگی، بدلتے نظام کی آئینہ داری، حالات حاضرہ کی ترجمانی اور اس سے پیدا شدہ اضطراری اور ماضی کی بازیافت نے ان کے ذہنی، فکری اور تخلیقی میلان کو توانائی عطا کی ہے۔ ناول 'غبار شب' کا موضوع بھی جاگیردارانہ معاشرے کا ہی اختتامیہ ہے۔ یہ ناول ہندو مسلم تنازعہ کا عکاس ہے۔ یہ تنازعہ تعزیہ اور پیپل کے پیڑ سے شروع ہوتا ہے اور پھر پوری بستی کو اپنے نرغے میں لے لیتا ہے۔ جھام پور کا جاگیردار جمیل اس کا مرکزی کردار ہے جو ہندو مسلم کے بھید بھاؤ کو سمجھ نہیں پاتا ہے کیونکہ دونوں فرقے اس کی رعیت ہیں۔ دونوں اس سے اور وہ دونوں سے محبت کرتا ہے لیکن چودھری اقبال نرائن اور عنایت خاں کی سازشیں پورے ماحول کو پراگندہ کر دیتی ہیں۔

قاضی صاحب کسی خاص تحریک سے وابستہ نہیں تھے۔ ان کے یہاں زندگی کا ہر پہلو اور ہر جزو پایا جاتا ہے۔ بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ ان کا ذہن اور ان کا قلم بھی تغیر پذیر رہا۔ انھوں نے اپنا رشتہ زندگی سے جوڑا ہے اس لیے انسانی معاشرہ کی مکمل اور جامع تصویریں ان کے یہاں دکھائی دیتی ہیں۔ وارث علوی نے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ ''جب ہم قاضی صاحب کی ادبی تخلیقات کا ذکر کرتے ہیں تو ان میں عموماً ان کے تاریخی ناولوں کا ذکر نہیں کرتے ہیں۔'' قاضی صاحب اس کے جواز میں کچھ یوں رقمطراز ہیں:

''تاریخی ناول، ناول کی ایک الگ ہی قسم ہے جس میں عموماً ناول نگار اپنے بیتے ہوئے عہد کو اس کے تمام تہذیبی اور تمدنی دبدبے کے ساتھ قد آور کرداروں اور ان کی شاندار مہمات اور پُر وقار ڈرامائی مکالموں، ان کے ہوش رُبا معاشقوں اور ان کے عروج وزوال کی ولولہ انگیز کہانیوں کو رفیع الشان رزمیہ اسلوب میں بیان کرتا ہے۔ ایسی شاندار تاریخی ناولوں پر تنقید کے اصول اور آداب بھی

قاضی عبدالستار کا الفاظ کا ذخیرہ انتہائی وسیع ہے، وہ الفاظ پر اس قدر قدرت رکھتے ہیں کہ اسے مختلف پیرائے میں استعمال کر لیتے ہیں۔ انہوں نے ہرقل اعظم کے حشم جاہ وجلال اور بادشاہ کی شان وشوکت کو قائم رکھا ہے۔ یہ ناول نگار کا ہی کمال ہے کہ چند الفاظ کی وجہ سے کردار کی شخصیت پڑھنے والے قاری پر واضح کر دیتے ہیں۔

وہ نہیں ہوتے جو ایک عام آدمی کی زندگی کا نقشہ کھینچنے والی حقیقت نگار اور نفسیاتی یا سماجی ناول کی تنقید کے ہوتے ہیں۔ میں ذاتی طور پر تاریخی ناولوں میں دلچسپی نہیں رکھتا اس لیے ان پر تنقید کے آداب سے واقف نہیں اور نہ چلتا ہے کہ جمی کا باپ روایتی شان وشوکت اور وضعداری نبھانے کے نام پر اپنے پچاس ہزار فولاد سواریوں کو رکاب میں لیے لوہے کا لباس پہنے احکامات عالیہ کا انتظار کر رہے تھے۔''[6]

قاضی عبدالستار کا الفاظ کا ذخیرہ انتہائی وسیع ہے، وہ الفاظ پر اس قدر قدرت رکھتے ہیں کہ اسے مختلف پیرائے میں استعمال کر لیتے ہیں۔ انہوں نے ہرقل اعظم کے حشم جاہ وجلال اور بادشاہ کی شان وشوکت کو قائم رکھا ہے۔ یہ ناول نگار کا ہی کمال ہے کہ چند الفاظ کی وجہ سے کردار کی شخصیت پڑھنے والے قاری پر واضح کر دیتے ہیں۔ ان کی تمام تصانیف کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد نورالحسنین اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ:

''تاریخ کے جھروکوں سے عبدالحلیم شرر اور نسیم حجازی وغیرہ ادیبوں نے نیم تاریخی اور فرضی کرداروں کے حسن وعشق کی داستانوں سے قاری کی آنکھوں کو خیرہ کرنے کی کوشش کی تو قاضی عبدالستار نے تاریخ کے پردوں میں سے حقائق کو بیان کرتے ہوئے شاہی خاندانوں کی عظمتوں کے نشان، ان کے رعب داب، رہن سہن، جاہ ہ جلال اور زبان وبیان کے انداز کو قاری کے حافظے کا حصہ بنا دیا۔''[7]

قاضی صاحب نے اپنی 85 سالہ زندگی میں کئی ادبی کارنامے انجام دیے جن کی بنیاد پر انہیں اہم اعزازات سے نوازا گیا جن میں پدم شری ایوارڈ، غالب ایوارڈ، میر ایوارڈ، یوپی اردو اکادمی ایوارڈ، عالمی ایوارڈ، پہلا نشان سرسید ایوارڈ، بہادر شاہ ظفر ایوارڈ، دوہا (قطر) کا بین الاقوامی ایوارڈ، قومی اقبال ایوارڈ قابل ذکر ہیں۔

■

Mohd Sharib
Research Scholar, Dept of Urdu
Ranchi University
Ranchi (Jharkhand)

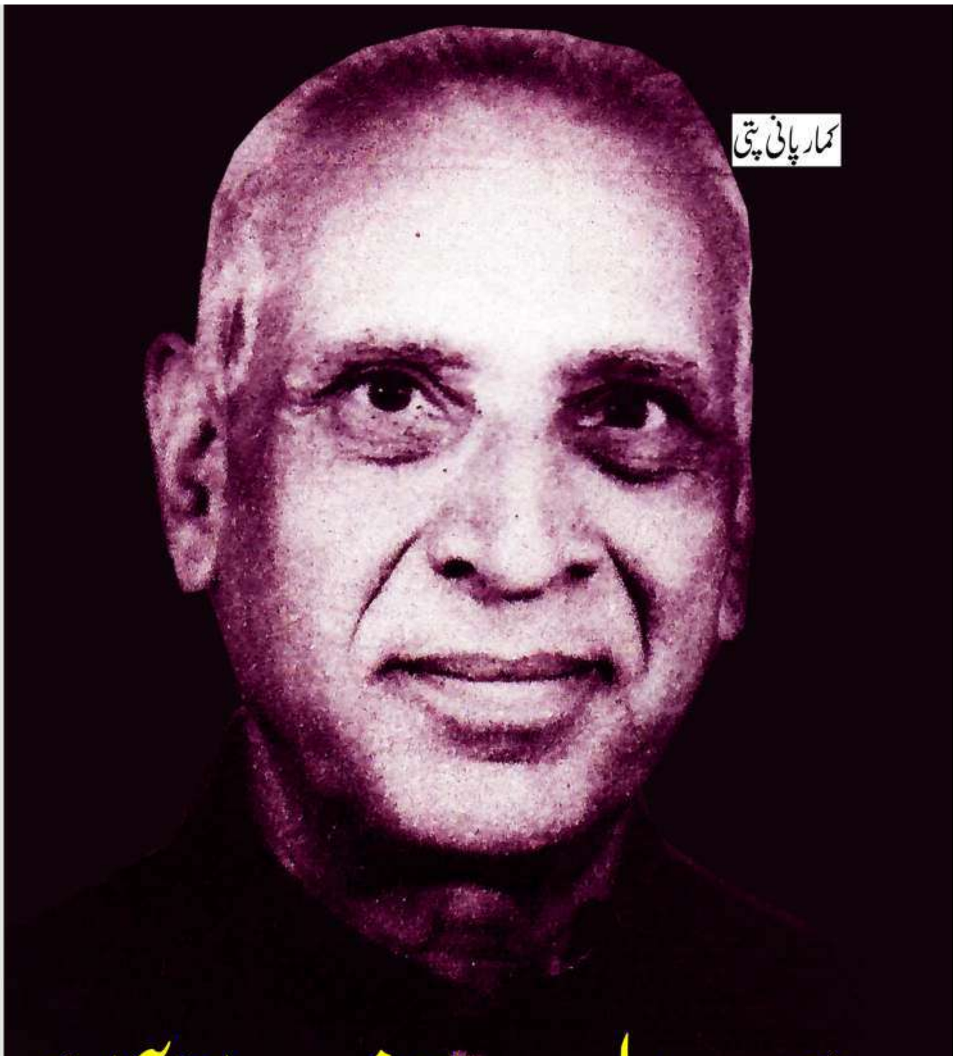

کمار پانی پتی

ڈاکٹر ہیرالال چوپڑہ عشرت حافظ آبادی
بحیثیت غزل گو

ڈاکٹر عشرت حافظ آبادی (2 دسمبر 1906 - 21 جنوری 1994) شاگرد تو علامہ اقبال کے تھے مگر جانے انجانے میں فیض کے ان مستند الفاظ کا مفہوم بخوبی سمجھ چکے تھے: ''شعر کہنا جرم نہ سہی، لیکن بے وجہ شعر کہتے رہنا ایسی دانشمندی نہیں... '' موصوف غزل کہتے ہوئے بھی موقع اور محل ہمیشہ دھیان میں رکھتے تھے۔ کوئی نہ کوئی مقصد ان کے سامنے ضرور ہوتا تھا۔ عام مجلسی شعرا کی طرح یونہی آسمانی اڑانیں بھرنے کے عادی نہیں تھے۔ دوسروں کے بھی ایسے ہی شعروں پر داد دیتے تھے جو ان کے اپنے جذبات کی ترجمانی کرتے ہوں۔ مجھے آج بھی اچھی طرح یاد ہے کہ انھوں نے ایک بار میرے اِن اشعار پر داد کے دریا بہا دیے تھے:

کوئی مقصد بھی اس اڑان میں رکھ
یونہی خود کو نہ آسمان میں رکھ
جس پہ ہر کوئی ٹوٹ کر لپکے
کوئی ایسی بھی شے دکان میں رکھ
کچا پکا سہی یہ اپنا ہے
دل سے خود کو اسی مکان میں رکھ...

یہی وجہ ہے کہ عشرت اپنے عہد کے عام شعرا کی طرح محض ''غزلیاتی اشعار کی ہی دکان سجانے میں کوئی زیادہ وشواس نہیں رکھتے تھے۔'' وہ ایسی غزل کے تو حق میں ہی نہیں تھے جو محض رسمی روایتی مضامین کی گت پر ناچتی نظر آئے۔ غزل میں وہ مولانا حالی ہی کی طرح ''درس و پیام کے عظیم گھونسلے تعمیر کرنے کے حق میں تھے۔'' انھیں وہ غزل ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی جس میں درس و پیام کی گنجائش نہ ہو۔ وہ تو علامہ سیماب اکبرآبادی کی اس بات سے پوری طرح متفق تھے:

''غزل ضرور کہیے اور ضرور پڑھیے۔ میں بھی آپ کی ہمنوائی کروں گا، لیکن شعر پڑھنے سے پہلے یہ غور کر لیجیے کہ اس کا اہلِ فن اور اہل علم پر کیا اثر ہوگا؟ اس کے بعد نوجوانوں پر کیا ہوگا؟ اس کے بعد عام سوسائٹی پر کیا ہوگا؟ اگر آپ کے خیال میں یہ سہہ گونا اثرات خوشگوار ہوں تو ضرور پڑھیے۔ ایسے ہی اشعار پڑھنے اور سننے سے تعلق رکھتے ہیں، خواہ اس سے سوسائٹی کے جذبۂ تفریح میں حرکت پیدا ہو یا نہ ہو، لیکن ان کے دل اس شعر سے متاثر ضرور ہوں گے... ''

(خطبۂ صدارت: مشاعرہ جھانسی، 3/اپریل 1940)

چنانچہ عشرت کے ہاں بہت ہی کم ایسی غزلیات ملیں گی جو رسمی روایتی غزل کی طرح محض عشق و محبت، گل و بلبل، شمع و پروانہ، دیر و کعبہ تک ہی محدود رہ کر دم توڑ گئی ہوں۔ ان کے سارے کلام میں (جتنا بھی میری نظر سے گزرا ہے) ایسی غزلیات کی گنتی آدھا درجن سے بھی کم ہوگی۔ اکثر تسلسل کی پتوار تھامے غزل کی کشتی کو دھیرے دھیرے بڑے تحمل کے ساتھ نظم ہی کی اخلاقی لہروں پر بہاتے چلے جاتے ہیں اور وہ بھی اپنی بین الاقوامی بہترین تہذیب کے دائرے میں رہ کر، اس تغزل کو بری طرح دھتکارتے ہوئے جس کے متعلق شہر حالی و سلیم کے لیے تاج بادشاہ ڈاکٹر صابر پانی پتی نے (جو خود بھی ڈاکٹر عشرت ہی کے علاقے سے اجڑ اکھڑ کر پانی پت میں آکر آباد ہوئے تھے) نے کہا تھا:

تظلم کی رسوائیاں دیکھ صابر
تغزل حیا بیچ کر کھا گیا ہے!

ان کی کوئی بھی ایسی غزل نہیں جس میں عشرت انسانیت کو خیرباد کہہ کر ننگے پن کے سہارے داد بٹورنے کی کوشش کرتے دکھائی دے رہے ہوں۔ مثال کے طور پر دیکھیے ان کی ایک غزل کے یہ اشعار:

فغاں میں، نالے میں، فریاد و آہ و زاری میں
کٹے گی عمر، یہ ایک دو نفس کی بات نہیں
جو تم نہیں تو کوئی بھی سہی، یہ کیوں کر ہو
ہم اہل عشق ہیں، اہلِ ہوس کی بات نہیں

عشرت ہر شعر میں کوئی نہ کوئی بات پیدا کرنے کی کوشش کرتے نظر آرہے ہیں۔ رنگ علامہ ہی کا ہے اگرچہ انداز

ان کا اپنا ہے، ایک دم نیا اور انفرادی، روایات سے قدرے ہٹ کر...

عشرت طرحی غزل کہنے سے اکثر کتراتے تھے۔ وہ اسے محض سمع خراشی ہی گردانتے تھے۔ ''دن رات ایک کرکے اگر کبھی آپ نے دو اچھے شعر کہہ بھی لیے تو کیا ہوا؟'' ایک بار انھوں نے خود فرمایا تھا: ''لوگ تو ہمیشہ غالب ہی کے اشعار کا حوالہ دیں گے۔ چنانچہ کیوں مغز پچی کی جائے۔ کیوں نہ کوئی نئی زمین تیار کرکے کوئی نرالی فصل بوئی جائے۔ پڑھنے یا سننے والے یہ تو کہیں کہ کچھ کیا ہے یا کچھ نیا کرنے کی کوشش کی ہے...''

لیکن کبھی کبھی کسی اچھے مصرع طرح پر کچھ نرالے اشعار موزوں کرنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ شعر منہ سے بولتے تھے اور طرح مصرع پر اکثر بھاری پڑتے تھے۔

کسی بے کس کے کاسے میں جو تو مقدور ہوجائے
گدا ہوکر وہ رشکِ قیصر و مغفور ہوجائے
تری درگہ سے جذبِ عشق گر منظور ہوجائے
کوئی موسیٰ، کوئی عیسیٰ، کوئی منصور ہوجائے
ترے عزمِ مصمم پر فدا ہیں منزلیں لاکھوں
ہو عزم الجزم، ناممکن ہے منزل دور ہوجائے
خودی کو دیکھ، تونے پالیا اس کو، تو دیکھے گا
تری مرضی پہ قدرت خود بخود مجبور ہوجائے
جو میں مسرور ہوتا ہوں، تجھے مغموم پاتا ہوں
جو میں مغموم ہوجاؤں تو تو مسرور ہوجائے
سکندر بھی پکارے جذبِ دل سے تو بنے موسیٰ
اگر ظلمات کا چشمہ ہو کوہِ طور ہوجائے
مرے دل میں تصور یوں جما ہے میرے دلبر کا
یہ کہتا ہے نہیں پروا، مری ہو، حور ہوجائے

جب عشرت نے شعر کہنا شروع کیا غزل غالب کی صفت آسمانی اڑان سے ہوتے ہوئے حالی کی نظریاتی سطح پر آ پہنچی تھی اور جوش، فراق، اور اقبال اِس پر اپنے ہی انداز کی مہر ثبت کررہے تھے۔ عشرت اکثر اقبال کے آس پاس ہی چنگیاں بھرتے نظر آتے تھے۔ ہیئتی تبدیلیاں تو ابھی کسی کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھیں۔ 'آزاد غزل' ابھی مستقبل کی کوکھ میں ہی اپنی جگہ بنا رہی تھی۔ 'غزل یک قافیہ' کا کسی نے نام بھی نہیں سن رکھا تھا۔ ہاں، ترقی پسند شعرا ضرور اسے نظمیہ شاعری کے نزدیک لاکر ایک نئی صنف کی طرف اشارہ کررہے تھے جو تسلسل کے سہارے برق رفتار پرواز بھرتے ہوئے 'نظم نما غزل' یا 'غزل نما نظم' کا روپ اختیار کرتی جارہی تھی۔ چنانچہ 1947 میں ملک کے بٹوارے کے دنوں میں عشرت نے جو غزلیں کہیں وہ تسلسل کا دامن تھامے نظم ہی کی طرف بڑھتی دکھائی دیتی ہیں۔ دیکھیے ان کی یہ مشہور غزل جو انھوں نے 1948 میں قدرے لٹ پٹ کر سرحد کے اُس پار سے آکر کہی تھی:

ہمارے واسطے کیا ہے خوشی اپنی، غمی اپنی
خوش و ناخوش بسر کرتی ہے شامِ زندگی اپنی
بھلا یہ بھی ہے کوئی زندگی، یہ زندگی اپنی
فنا چاروں طرف ہے اور بقا ہے عارضی اپنی...

اور حالات کے زیر اثر ایک دم اپنے سرحد پار کے وطن کو یاد کرتے ہوئے مفہوم کی کڑیاں ملاتے ہوئے فرماتے ہیں:

تجھے پنجاب ہم نے اپنا خوں دے دے کے سینچا تھا
کہ پیری میں عصا بن کر کرے گا دلبری اپنی
ہزاروں انقلاب آئے، وہی تو تھا وہی ہم تھے
کبھی اس طرح پہلے تو نظر بدلی نہ تھی اپنی
مگر اب کی دفعہ کیسا نیا یہ انقلاب آیا
خدا جانے وہ دیرینہ مروت کیا ہوئی اپنی
''نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے، لیکن''
کہیں بڑھ چڑھ کے آدم سے ہوئی بے عزتی اپنی...

پھر دیکھیے سرحد پار سے لٹ پٹ کر آنے کا منظر جو عشرت نے خود اپنی جان پر بھگتا ہے:

نکالا سرزمینِ پاک سے یوں بے سروساماں
ہماری بے کسی میں رورہی ہے بے بسی اپنی...

مگر پھر ایک دم تھام لیتے ہیں اپنی بے مثال پنجابیت کا دامن، جس کی ہمیشہ اپنی ہی آن بان شان رہی ہے، اور حالات کو للکارتے ہوئے فرماتے ہیں:

توکل ہے خدا پر اور اپنے زور بازو پر
کسی محفل میں بھی جاکر نہیں گردن جھکی اپنی
اگرچہ بے طرح کوہِ مصائب ہم پہ ٹوٹا ہے
نہ دیکھی آج تک دنیا نے دریوزہ گری اپنی
ملے تو خاک میں لیکن اٹھیں گے خاک میں مل کر
کوئی صبر و تحمل میں کرے گا ہمسری اپنی؟

اور پھر اپنے مستقبل کی یوجناؤں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، کیا ہمت کا ثبوت دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

ٹھکانا گر نہیں لاہور کیا غم بے ٹھکانوں کو
وہیں کعبہ بنا دیں گے جبیں جس جا دھری اپنی
اثاثہ دوش پر لے کر سرِ بازار بیٹھے ہیں
نہیں سرمایہ داروں کو یہ حالت بھی جچی اپنی...

اور پھر اپنی وطن پرستی اور قربانی پر فخر و ناز کرتے ہوئے اپنے دیش واسیوں کو قدرے جھنجھوڑتے ہوئے کچھ کہنے کی کوشش کرتے ہیں:

مرے ہم ہیں کہ تا زندہ رہیں ہندوستاں والے
'رقیبوں کے بچانے کو لٹا دی زندگی اپنی...

وہ دِلّی یا دِلّی سرکار پر بھی بوجھ نہیں بننا چاہتے تھے کیونکہ پنجابی ہی اس ملک کا ایسا پودا ہے جو کسی حال میں کہیں بھی سرسبز و شاداب ہوسکتا ہے۔ چنانچہ عشرت کے الفاظ میں:

بھلا کیوں بار دِلّی پر ہوں یا سرکار دلی پر
کسی پر بار ہونے کی نہیں عادت رہی اپنی...

پنجابیوں کی سب سے بڑی خوبی ہمیشہ یہی رہی ہے کہ وہ دوسروں کے لیے ہمیشہ جان تک دینے کے لیے تیار رہتے ہیں اور بے مثال قربانی دے کر، لٹ پٹ کر وہ سرحد پار سے آئے ہیں:

کسی کے واسطے جینا ہی تو اپنا شیوہ تھا
کسی کے واسطے مرنا یہی عادت تو تھی اپنی...

پنجابی اپنی ہمت اور جرأت کے سہارے اپنی زندگی کو سنوارنے اور نکھارنے کا ہنر بھی خوب جانتے ہیں۔ ''وہ جم کے واہنے اور رج کے کھانے والے لوگ ہیں'' وہ کسی حالت میں گھبرانا جانتے ہی نہیں:

کمانا اور گنوانا، پھر کمانا اپنا جوہر ہے
عمل کے راز میں مضمر ہے گویا زندگی اپنی...

اور پھر ایک اور بات بھی تو ہے۔ حالات کا گلہ شکوہ کرنا بھی تو بزدلی کے مترادف ہے۔ عشرت پنجابی ہونے کے ناطے اس کے بالکل حق میں نہیں تھے۔ وہ بخوبی جانتے تھے کہ ہر برائی میں کوئی نہ کوئی اچھائی بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ مقطع میں وہ یہ بات بھی کھل کر کہہ جاتے ہیں:

نہیں زیبا کہ حالِ زار پر عشرت ہو تو گریاں
خدا جانے کچھ اس میں بھی چھپی ہو بہتری اپنی

کیا نام دینا چاہیں گے آپ عشرت کی اس تخلیق کو؟ بہ الفاظِ دیگر یہ غزل ہے کہ نظم؟ کیا کہنا چاہیں گے آپ اس بارے میں؟ مگر عشرت کے قریب یہ ایک بہترین 'غزل نما نظم' یا 'نظم نما غزل' کا وہ نمونہ ہے جس کی کئی مثالیں 1947 کے دور میں منظر عام پر آتی رہیں اور ساحر آج بھی اس سلسلے میں اپنی ایسی ہی ایک تخلیق میں اپنی مثال آپ ہیں۔ انھوں نے بھی 1947 کی حیوانیت کی عکاسی کرتے ہوئے کہا تھا:

طرب زاروں پہ کیا بیتی، صنم خانوں پہ کیا گزری
دلِ زندہ ترے مرحوم ارمانوں پہ کیا گزری
زمیں نے خون اگلا آسماں نے آگ برسائی
جب انسانوں کے دن بدلے تو انسانوں پہ کیا گزری
ہمیں یہ فکر ان کی انجمن کس حال میں ہوگی
انھیں یہ غم کہ ان سے چھٹ کے دیوانوں پہ کیا گزری

مرا الحاد تو خیر ایک لعنت تھا، جواب بھی ہے
مگر اس عالمِ وحشت میں ایمانوں پہ کیا گزری

یہی تسلسل فراق کی غزلیات کا جزوِ اعلا رہا اور اس کی روشنی سے جگمگا رہی ہیں۔ جوش کی غزلیاتی تخلیقات، جوش جو بذات خود بھی فراق اور عشرت کے قدرے نزدیک رہے، انہی کی زندگی کے ایک واقعہ کو اکثر دہراتے رہے۔ ایک بار جوش، فانی بدایونی سے ملنے ان کے یہاں گئے۔ فانی نے جوش کا حال احوال پوچھا، تو جوش کہنے لگے: ''گرمی بہت بڑھ گئی ہے۔ میرے جوتے میں کیل نکل آیا ہے، جو بہت تنگ کر رہا ہے۔ آٹا بہت مہنگا ہو گیا ہے...'' ''کیا بکواس کر رہے ہو، جوش! فانی نے قدرے کھیج کر کہا۔ ''غزل عرض کر رہا ہوں جناب!'' جوش نے جواب دیا! عشرت اس سلسلے میں جوش کے پکے ہمنوا تھے۔ وہ بھی جوش ہی کی طرح رسمی روایتی غزل کے ہر شعر کے جداگانہ مفہوم کے حامی نہیں تھے۔ ایسی غزل کو اکثر 'ایک بیکار صنف' ہی قرار دیتے رہے۔ بیشتر غزل گو شعرا کی رائے نہ سہی مگر مذاق کی اس بات سے حظ اٹھانے میں تو کوئی کسر نہیں چھوڑتے تھے۔ بات اکثر شعرا کی سمجھ میں تو آتی تھی، مگر ان کی باتوں سے حظ اٹھانے کے باوجود ان سے اتفاق کرنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔ ان کے بیشتر ہمعصر شعرا کی غزلیات ہمیشہ کی طرح اپنے ہی رنگ میں رواں دواں رہیں...

اور عشرت نے ایک بار یہ پوچھے جانے پر کہ بہترین غزل سے متعلق آپ کا اپنا نظریہ کیا ہے، ایک لمحہ بھر خاموش رہنے کے بعد کچھ یوں کہنا شروع کیا: ''میں غزل یعنی بہترین غزل کو لفظوں میں تو بیان نہیں کر سکتا، ہاں، ایک اچھی غزل آج کے دور میں کیا ہو سکتی ہے، یا پھر ہونی چاہیے، اس کی مثال ضرور پیش کر سکتا ہوں۔ پر یہ ضرور دھیان میں رہے کہ یہ میری ذاتی رائے ہے۔ آپ کی یا کسی اور کی کچھ اور بھی ہو سکتی ہے۔''

انھوں نے اپنی غزل پیش کر دی، جو بہت پسند کی گئی اور عشرت مشاعرہ لوٹ کر لے گئے۔

زباں میٹھی ہے، لب ہنستے ہیں، صورت بھولی بھولی ہے
سرابِ حسن ہے یہ ناؤ یاں ہم نے ڈبو لی ہے

اور سامعین پر ایک عجیب سا عالم طاری ہو گیا۔ وہ نوجوان ساتھی، جن کا اردو زبان سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا جھوم اٹھے۔ مشاعرہ خالص ادبی ماحول کی پہچان بن گیا اور عشرت شعر پیش کرتے گئے۔

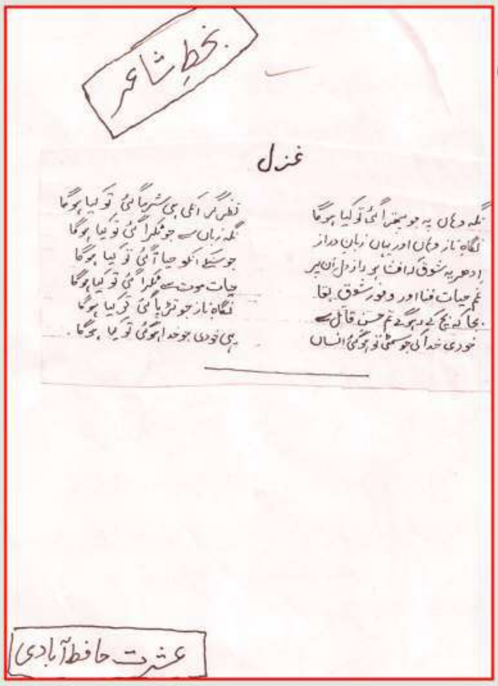

بہا کر اشکِ خون، دن رات کاٹے ہیں محبت میں
شمارِ سجدہ کو ہم نے یہی مالا پرو لی ہے

کچھ اس انداز سے انھوں نے یہ شعر پڑھا، یقیناً ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے شاعر کی پلکیں سرخ موتیوں کی مالا پرو رہی ہوں۔ زبان اور معنی کے اعتبار سے اگلا شعر اپنے ہی انداز کا تھا۔

ستمگر کہہ دیا ہم نے تو کیوں تم اس قدر بگڑے
چلو جانے بھی دو، یہ عاشقوں کی بولی ٹھولی ہے!

'عاشقوں کی بولی ٹھولی' کے ٹکڑے کا جواب نہیں۔ پورے پانی پت میں ایک ضرب المثل کی طرح چھا گیا اور ایک ایک کی زبان پر آ گیا...

اور اگلے شعر نے تو سامعین پر عجیب طرح کا جادو سا کر دیا۔

یہ ہے اک معجزہ یا جذبِ الفت ہے کہ فرقت میں
تری تصویر کو ہم نے بلایا ہے، وہ بولی ہے!

ہر شعر میں کوئی نہ کوئی نئی بات سامنے آ رہی تھی۔ مضامین کی مناسبت نہ ہوتے ہوئے بھی ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے ایک ہی کہانی کے مختلف پہلوؤں کی ویڈیوگرافی کی جا رہی ہے۔

الٰہی خیر ہو کیوں پوچھتے ہیں وہ پتہ میرا
قیامت راہ دکھلانے کو ان کے ساتھ ہو لی ہے!

'وہ'، 'میرا' یعنی 'میں' اور 'قیامت' ایک دلچسپ کہانی کے مختلف کردار چن کر بات آگے ہی بڑھاتے جا رہے ہیں... اور پھر اگلے شعر میں فلسفۂ موت و حیات کی بات کرتے ہوئے عشرت اور دو قدم آگے نکلتے ہیں تو کچھ اور ہی ماحول تیار ہونے لگتا ہے۔

مری ہستی کا کیا مقصد ہے اس کو کیا کوئی سمجھے
گرہ تھی یہ مگر آ کر اجل نے خوب کھولی ہے!

'مری ہستی کا مقصد' واقعی ایک ٹیڑھی پہیلی ہے۔ اسے سمجھ پانا یقیناً آسان نہیں۔ یہ ایک پیچیدہ گانٹھ ہے۔ مگر دیکھیے 'آخر اجل نے خوب کھولی ہے' کسی ذہن میں نہیں ابھر رہا تھا۔ مخمور دہلوی کا یہ شعر:

دمِ آخر بس اک ہچکی سی ساری داستاں کہہ دی
فسانہ زیست کا اس سے بھی کم کہتے تو کیا کہتے؟

اور پھر دو قدم آگے بڑھ کر انھوں نے یہ شعر پیش کیا۔

دیارِ عشق میں پیہم سفر آئینِ قدرت ہے
اجل ہے زندگی اس میں، خموشی اس کی بولی ہے

اور پھر دیکھیے ایک اور ہی انداز میں ایک اور منظر دکھاتے ہوئے کیا فرماتے ہیں۔

کھلا ہے آج صحرا میں جو کثرت سے گلِ لالہ
ترے کشتوں نے کیا زیرِ زمیں یہ کھیلی ہوئی ہے؟

اور پھر مقطع میں 'غزل کیا ہے؟' کے سوال کا جواب جس خوبصورت ڈھنگ سے پیش کرتے ہیں، وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ذہن نشین ہو جاتا ہے۔

پس از مدت تقاضائے محبت سے غزل لکھی
غزل کیا ہے چمن والو یہ گلچیں کی جھولی ہے!

غزل کو 'گلچیں کی جھولی' کہنا ڈاکٹر عشرت حافظ آبادی ہی کا حصہ ہو سکتا ہے۔ یہاں وہ کئی سوالوں کا جواب دے رہتے ہیں۔ وہ اکثر غزل نہیں کہتے تھے۔ اکثر نظم پر ہی اکتفا کرتے تھے۔ لیکن جوش ملیح آبادی کے مستند الفاظ میں وہ کوئی ''ڈیڑھ آنے والی بیڑی نہیں تھے جو ایک دم کچھ کہنے کے بعد ترقی پسند شعرا کی طرح ایک دم ٹُھس ہو جائے۔'' وہ تو ایک شاعر تھے، بنیادی شاعر جو زندگی بھر اپنے مزاج ہی کی شاعری تخلیق فرماتے رہتے۔ ٹھیک ہے ان کی جو غزلیں آج ہمارے پاس ہیں وہ عام شعرا کی غزلوں کی طرح سیکڑوں کی تعداد میں نہیں، مگر ان کا اپنا ہی مزاج ہے۔ اپنی ہی شان نزول ہے۔ ان کا اپنا ہی رنگ ہے اور اپنا ہی نرالا پن۔ ان کے اسی انداز کی بنا پر عشرت کی غزل کو عشرت ہی کی غزل کہہ سکتے ہیں۔ اس کے لیے کوئی دوسرا لفظ یا نام ڈھونڈ نکالنا یا تجویز کر پانا جوئے شیر لانے کے مترادف ہوگا۔

■

Dr. 'Kumar' Panipati
1375/ MIG-B, Sector 11-12
New Housing Board Colony
Panipat - 132103 (Haryana)
Mob.:09253193704

محمد سمیع الدین

ابراہیم نامہ میں بیجاپور

عادل شاہی خاندان کو دکن کی سماجی، تہذیبی اور ادبی تاریخ میں ایک نمایاں مقام ومرتبہ حاصل ہے۔ دکنی زبان وادب کی ترقی میں فن تعمیر، موسیقی اور مشترکہ تہذیب کی نشو ونما میں اس خاندان نے بے پناہ خدمات انجام دی ہیں۔ عادل شاہیوں کا اقتدار تقریباً دوسو برس تک دکن کی سرزمین پر رہا۔ عادل شاہی حکمران بڑے صاحب علم اور صاحبِ ذوق تھے، بیشتر سلاطین خود شاعر تھے اور موسیقی میں کافی مہارت رکھتے تھے۔ عادل شاہی سلاطین نے شعراوادبا، علمااور فضلاء کی ایسی سرپرستی کی کہ عراق وعجم تک تحسین وتعریف کا چرچہ بلند ہوگیا۔ ان سلاطین کی قدردانی نے سیکڑوں نامورادیبوں عالموں اورارباب فن و کمال کو دربار سے وابستہ کردیا۔ بیشتر سلاطین اہلِ سیف ہونے کے ساتھ ساتھ اہل قلم بھی تھے۔ تیر وتلوار کے تقاضوں کے ساتھ انھیں مختلف علوم سے بھی گہری دلچسپی تھی۔ یہی بات ہے کہ ان کے درباروں میں ایک طرف ماہرین سیاست و مدبّر موجود تھے تو دوسری طرف علماء فضلاء کا اجتماع موجود رہا کرتا تھا۔ یہاں تک کہ ایران، عرب، روم اور دور دراز کے مقامات سے اہل ہنراور ذی علم حضرات کو بلاکر ان کی قدرافزائی کیا کرتے تھے۔ عادل شاہی حکومت کا آغاز 1490 سے ہوتا ہے اس سلطنت کے جملہ یکے بعد دیگرے نو بادشاہ تخت وتاج کے مالک بنے اور بحسن وخوبی حکومت کی باگ ڈور سنبھالی اور اُردو ادب کی آبیاری میں اہم خدمات انجام دیں۔ لیکن 1686 میں اورنگ زیب نے بیجاپور کو فتح کیا اوراس طرح عادل شاہی حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔ اس عہد کا ایک شاعر عبدل دہلوی ہے جو ابراہیم عادل شاہ ثانی کا درباری شاعر تھا۔ افسوس ہے کہ گول کنڈہ کے بعض شعراء کی طرح بیجاپور کے اس شاعر کے نام سے بھی بہت کم لوگ واقف ہیں۔ اس کے پورے نام اور حالات زندگی پر تاریکی کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ البتہ اس کا تخلص عبدل اس کی مثنوی 'ابراہیم نامہ'' میں کئی جگہ آیا ہے لیکن بعض محققین عبدل کی مناسبت سے اس کا نام عبدالغنی پیش کرتے ہیں مگراس میں بھی متضاد آرا پائی جاتی ہیں مگر حتمی طور پر یہ فیصلہ کرنا محال ہے کہ اس کا نام عبدالغنی تھا لیکن 'ابراہیم نامہ' سے یہ بات تو ثابت ہو جاتی ہے کہ اس کا تخلص عبدل تھا اور دہلی سے بیجاپور میں اس نے سکونت اختیار کرلی تھی اس کا اندازہ اس کی زبان و بیان سے لگا سکتے ہیں۔ عبدل ابراہیم عادل شاہ ثانی کے زمانے میں تھا اوراپنے آپ کو سلطان کا شاگرد کہتا تھا عبدل کی مثنوی 'ابراہیم نامہ' بادشاہ وقت ابراہیم عادل شاہ ثانی کی فرمائش پر لکھی گئی ہے ایک دن بادشاہ نے عبدل کو بلاکر حکم دیا کہ ایک ایسی کتاب لکھی جائے جس کا جواب نہ ہو یہ سن کر اس نے پوچھا کہ کس زبان میں شعر کہوں۔ میں عربی اور فارسی تونہیں جانتا، صرف ہندوی زبان آتی ہے اس سلسلے میں مثنوی کے دوشعر دیکھیے

سو یو بچن سن شاہ استاد کاں
پوچھیا جگت گروشعر کہہ کس زباں
زبان ہندوی مجھ، سو ہوں دہلوی
نہ جانوں عرب ہو رعجم مثنوی

اس کے بعد پھر ابراہیم عادل شاہ ثانی نے جواب دیا کہ زبان کی کوئی پابندی نہیں ہے جس زبان میں چاہو اس زبان میں لکھو۔ شاعر کوتب کہیں جاکر ہمت بندھی اوراس نے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے بادشاہِ وقت کی تعریف و توصیف میں بہترین مثنوی تخلیق کی۔

بقول پروفیسر مسعود حسین خاں:

''ابراہیم نامہ دراصل ایک توصیف نامہ یا قصیدہ ہے جس کی جزئیات تاریخی صداقت پر کی گئی ہیں۔ یہ ایک شاہنامہ ہے جس میں عبدل دہلوی نے اپنے ممدوح ابراہیم عادل شاہ ثانی کی ذاتی صفات کے علاوہ اس کے دارلسلطنت بیجاپور کی عظمت ورونق، محلات، قلعہ جات، باغات، فوجوں، ہاتھیوں، گھوڑوں، بادشاہ کی بزم ورزم آرائیوں، معاشرت، بازاروں سڑکوں وغیرہ کی تصویرکشی شاعرانہ تخیل اور ادبی پیرائے میں کی ہے۔ نادر تشبیہات اور ہندی تلمیحات کی کثرت ہے۔''

(ابراہیم نامہ: عبدل دہلوی مرتب مسعود حسین خاں ص نمبر 7)

اس کے علاوہ نصیرالدین ہاشمی لکھتے ہیں:

''اگر چہ یہ مثنوی ابراہیم عادل شاہ کی پوری سوانح عمری نہیں ہے لیکن اس میں سلطان کی خانگی زندگی کے حالات ہمیشہ کے لیے محفوظ ہوگئے ہیں۔ اس طرح ادبی اور لسانی اہمیت کے ساتھ تاریخی لحاظ سے بھی قابل قدر ہے۔'' (دکن میں اُردو: نصیرالدین ہاشمی ص نمبر 185)

ابراہیم نامہ دبستانِ بیجاپور کا پہلا ادبی نقش ہونے کے ساتھ ساتھ لسانی وادبی اعتبار سے بڑی اہمیت کا حامل ہے جس کو عبدل دہلوی نے 1020-21ھ مطابق 1611-12 عیسوی میں تصنیف کی۔ دوسری مثنویوں کی طرح عبدل بھی اس مثنوی کی ابتدا حمد، نعت، منقبت، اور درمدح بادشاہ وقت سے کرتا ہے۔ عبدل کی یہ مثنوی دراصل توصیف نامہ یا قصیدہ ہے جس کی جزئیات تاریخی صداقت سے پر کی گئی ہے۔ صحیح معنوں میں یہ شاہ نامہ ہے۔ ہر چند کہ شاہ نامہ دکن لکھنے کا اعزاز ملک الشعرا نصرتی کو حاصل ہوا جس نے 'علی نامہ' لکھ کر علی عادل شاہ ثانی کو زندہ جاوید کردیا۔ اسی طرح عبدل نے ابراہیم نامہ کے توسط سے ابراہیم عادل شاہ ثانی کے عہد میں شہر بیجاپور، اس کا قلعہ، اس کا لشکر، اس کا عدل، اس کی سخاوت، اس کی ادب نوازی اوراس کی بزم آرائی وغیرہ کو پیش کیا ہے۔ یہ کوئی تاریخی مثنوی تونہیں ہے لیکن اس کی شخصیت ونقش ابھر کر آتے ہیں اور تاریخی صداقتیں اس میں جلوہ گر ہیں۔

ابراہیم نامہ میں عبدل ابراہیم عادل شاہ ثانی کو مختلف القابات سے یاد کرتا ہے جیسے۔ شہ ابراہیم، شاہ استاد، شاہِ نورس، شاہ عالم، عالم پناہ، شہ دکن اور جگت گرو، وغیرہ۔

ابراہیم عادل شاہ ثانی اپنے چچا علی عادل شاہ اول کے انتقال پر نو سال کی عمر میں سنہ 1580 میں بیجاپور کے تخت پر بیٹھا۔ کم عمر کی وجہہ سے سنہ 1590 تک وہ چار متولیان سلطنت کامل خاں، کشور خاں، اخلاص خاں اور دلاور خاں کا تختۂ مشق بنا رہا۔ اس کی ابتدائی تربیت اس کی چچی احمد نگر کی معروف شہزادی اور زوجہ علی عادل شاہ اول چاند بی بی سلطان کے زیر نگرانی ہوئی۔ جس سے اسے بے انتہا محبت وعقیدت تھی۔ چاند بی بی کے قید کیے جانے کے بعد اور آخری متولی دلاور خاں کے زوال کے بعد ابراہیم کی اصل بادشاہت کا آغاز 91-1590 میں ہوتا ہے مختصر عرصہ میں معرکہ آرائی کے ذریعہ سے سلطنت کو مستحکم ومضبوط بنا دیتا ہے اور آخر کار اپنی توجہ علوم وفنون کی طرف مبذول کرلیتا ہے جس کی وجہ سے دارالسلطنت بیجاپور فنون لطیفہ کا گڑھ بن جاتا ہے۔ جہاں دنیا بھر کے موسیقار، شاعر، اہل فن آ کر جمع ہونے لگتے ہیں۔ جس کی وجہہ سے 1012ھ/ 1603 عیسوی میں دارلسلطنت بیجاپور کا نام بدل کر بدّیاپور رکھا گیا جس کا تذکرہ ابراہیم نامہ میں اس طور پر کیا گیا ہے۔

در تعریف شہر بیجاپور گوید

سنوں اب صفت شہ رہن تخت ٹھاوں
بدیاپور نگر ہے بھی اس کا جو ناؤں

در تعریف دربار حضرت شاہ عالم پناہ

ولیکن بدیاپور شہر سمند بھر
گگن شاہ دہلیز تل موج کر

بیجاپور، وجے پور کا تدبھو ہے۔ وجے کے معنی فتح کے ہوتے ہیں۔ اسی طرح بدیاپور، ودیاپور کا تدبھو ہے۔ ودیا کے معنی علم وہنر کے ہیں۔ ابراہیم کا رشتہ اہل ہنر سے استاد اور شاگرد کا سا تھا اور وہ اہل فن کا قدرداں تھا اور اہل فن اس کے پرستار تھے۔ وہ ان لوگوں کی محفلوں میں شریک ہوتا اور اپنی گہری فنکارانہ بصیرت سے ان کی رہنمائی کرتا یہ اسی کا فیضان تھا جو عبدل جیسا گمنام شاعر ایک اہم ادبی کارنامہ چھوڑ گیا۔

اس مثنوی میں بیجاپور کی تاریخی عمارتوں کا تذکرہ جا بجا کیا گیا ہے جیسے ارک قلعہ:

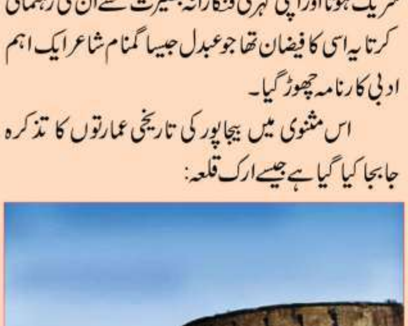

فصیل کے وسیع چبوتروں پر توپیں چڑھی رہتی تھیں۔ اور فصیل کے اردگرد ایک گہری اور چوڑی خندق پائی جاتی ہے

اس کے علاوہ اس عہد کی عمارتوں میں آنند محل اور سات کھن کے محلات ابراہیم کے عہد کی تعمیرات ہیں۔ عبدل نے بیجاپور شہر کا بیان کرتے وقت جن محلات شاہی کی جھلکیاں دکھائی ہیں ان کا تعلق اس ارک قلعہ کے محلات سے ہے۔ جہاں اس کا ممدوح ابراہیم عادل شاہ ثانی مقیم تھا۔

شہر بیجاپور کی تاریخی عمارتوں کی خوبصورتی کا تذکرہ ایک سے زائد مورخین اور سیاحوں نے خوبصورت انداز میں قلمبند کیا ہے یہاں تک کہ خود ابراہیم عادل شاہ ثانی کے عہد کے دو انگریز سیاح Fich اور Newberry ،عالی شان مکانات اور پتھر میں بنائے گئے نقش ونگار کی بڑی ستائش کی ہے اور بیش قیمت جواہرات سے بنی ہوئی اشیاء کی بڑی تعریفیں کیں ہیں۔

ابراہیم کے زمانے میں مغل سفیر اسد بیگ کو شہر دیکھنے کا موقع ملا جب کہ وہ مغلیہ سلطنت کی عصبیت کا شکار ہے لیکن اس کے باوجود وہ شہر بیجاپور کی شان وشوکت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا بلکہ وہ یہ کہنے پر مجبور ہوگیا کہ یہاں کی آب وہوا صحت بخش ہے اس ضمن میں اشعار ملاحظہ ہو۔

عجب شہر دستارابا نگار
زمیں باہیا گل پدک کر سنگار
دلیس برج بیچ بیچ عجب یوں نمائے
جڑے پاچ الماس کے خرش لائے

دارلسلطنت بیجاپور کے نام کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ ابراہیم عادل شاہ ثانی کو ایک نئے شہر نورس پور کی بنیاد ڈالنے کی سوجھی اور اس نے 1600-1599 عیسوی میں بیجاپور سے تقریباً آٹھ کیلومیٹر کے فاصلے پر یہ شہر بسایا۔ اس شہر میں بادشاہ نے اپنے لیے ایک خوبصورت محل تعمیر کروایا جو سنہری اور لاجوردی رنگ آمیزی سے سجایا گیا تھا۔ عبدل نے اس مثنوی میں نورس محل کی تعریف کی ہے اس کے اشعار دیکھیے۔

ولے محل نورس ہو ایوان اٹھان
دسے گگن آگن ہو اس کا نشان
گگن سات سیڑھی ہو مل جوڑ کر
نہ لگ محل نورس کے ایک کھن اوپر
جڑت نورتن مل کندن زر نگار
سورج چاند مل کر جڑے نوستار

ابراہیم اس شہر کا نام نورس پور اور شاہی محل کا نام نورس محل رکھا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ابراہیم کو لفظ 'نورس' سے زیادہ لگاؤ تھا اور اس پر بے حد فریفتہ تھا اور اسے اپنے لیے نیک شگون

خیال کرتا تھا جس کی وجہہ سے اس نے کتاب نورس تخلیق کی۔ اب یہ نورس محل سنگیت محل کے نام سے زیادہ مشہور ہے۔ بہر حال عبدل کی یہ مثنوی 1012ھ میں مکمل ہوتی ہے۔

■

Dr. Md. Samiuddin
Assistant Professor of Urdu
SECAB ARS Inamdar Arts Science &Commerce
College for Women
Jalanagar Bijapur- 586109 (Karnataka)
Cell No. 09341044679
Email I.D: samibagdal@gmail.com

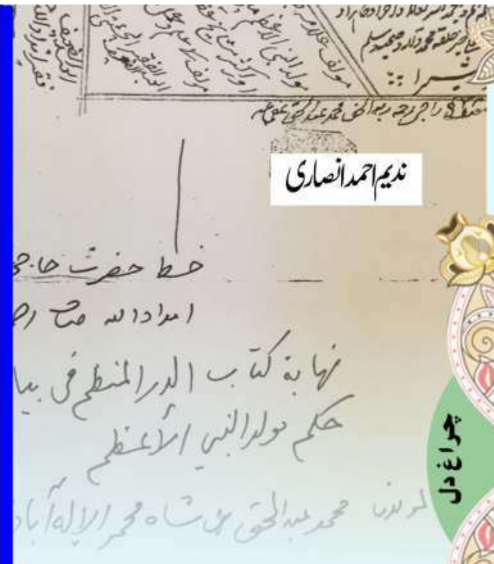

حاجی امداداللہ مہاجر مکی اور ان کی منظومات و منثورات

ندیم احمد انصاری

قادرالکلام شاعر، عظیم صوفی بزرگ، مجاہدِ تحریکِ آزادی، اکابر علمائے ربانیین کے پیر و مرشد، حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکی کی ذات اہلِ علم و دانش اور خصوصاً دینی حلقوں میں کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ آپ کی دس تصنیفات یکجا 'کلیاتِ امدادیہ' کے نام سے بار بار شائع ہوتی رہی ہیں، جن میں ضیاء القلوب، فیصلہ ہفت مسئلہ، ارشادِ مرشد منثور اور مثنوی تحفۃ العشاق، غذائے روح، گلزارِ معرفت، 'جہادِ اکبر، نالۂ امدادِ غریب اور دردِ غم ناک منظوم ہیں۔

حاجی صاحب غالب و مومن کے ہم عصر ہیں۔ مومن دہلوی آپ سے بے حد اعتقاد رکھتے تھے اور آپ کے پیر شاہ نور محمد صاحب خلیفۂ سید احمد سے بھی۔ مومن نے شاہ نور محمد صاحب کی تاریخِ وفات بھی کہی تھی۔ شعری مسائل پر بھی حاجی صاحب اور مومن کی گفتگو ہوجاتی تھی۔[1] اس تعلق کی بنا غالباً یہ تھی کہ خود مومن بھی سید احمد بریلوی کے مرید تھے۔[2]

حاجی صاحب نے ایک طرف جہاں علم وعرفان اور رشد وہدایت کا جہاں آباد کیا وہیں اپنی صوفیانہ شاعری سے مئے محبت کے جام بھی لنڈھائے۔ پروفیسر انوارالحسن انور شیر کوٹی 'حیاتِ امداد' میں لکھتے ہیں:

حاجی امداد اللہ صاحب شعرا وعلمائے دارالعلوم دیوبند کے 'ولی' یا 'باوا آدم' تھے ۔ ان کو اردو اور فارسی دونوں زبانوں کی شاعری سے شوق ودلچسپی اور ذوق تھا۔[3]

اور 'اردو ادب اور علمائے دیوبند' کے مصنف عبداللہ قاسمی رقم طراز ہیں:

جس طرح ولی دکنی کو شعرا کا باوا آدم کہا جاتا ہے اور سنجیدہ تعبیر میں جس طرح ولی دکنی کو اولیت کا تاج پہنایا جاتا ہے، اسی طرح حضرت حاجی صاحب علمائے دیوبند کے قافلے میں ولی دکنی ہیں' جو نظم ونثر، فارسی، اردو میں مقامِ اولیت رکھتے ہیں۔[4]

نیز آپ کے فن پر گفتگو کرتے ہوئے ڈاکٹر مظفر مہدی نے لکھا ہے:

آپ نے جو غزلیں کہی ہیں ان میں جو جذباتِ عشق ومحبت ہیں' وہ مجازی نہیں، حقیقی ہیں یعنی آپ کا سارا کلام معرفتِ ربانی میں ڈوبا ہوا ہے۔ اردو میں 'دردنامۂ غم ناک' 'جہادِ اکبر' اور 'گلزارِ معرفت' آپ کی یادگار شعری تصانیف ہیں۔ ان کی شاعری کا مزاج مقصدی واصلاحی ہے، یعنی ان کی شاعری کا مقصد اپنے مریدین اور امتِ محمدیہ کو اپنے فکر وخیال کے مطابق چلانا اور ان کے ذہن و مزاج کی تربیت کرنا رہا ہے، نیز ان میں قربت الی اللہ اور جذبۂ حب وعشقِ رسولؐ جاگزیں کرنا ہے۔[5]

نام و نسب اور مقام و تاریخِ ولادت

حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمہ اللہ کی ولادت بروز شنبہ، 22 صفر کو 1233ھ، مطابق 1817 میں قصبہ نانوتہ ضلع سہارنپور میں ہوئی۔ آپ کا نامِ نامی آپ کے والد مرحوم 'حافظ محمد امین' نے 'امداد حسین' رکھا تھا، لیکن حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب نبیرۂ شاہ عبدالعزیز صاحب نے آپ کو 'امداد اللہ' لقب سے نوازا۔ آپ کا تاریخی نام 'ظفر احمد' ہے۔ حاجی صاحب کا سلسلۂ نسب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔[6]

تعلیم و تربیت اور فیضِ عام

حاجی صاحب کی عمر ابھی فقط سات سال تھی کہ والدہ محترمہ بی بی حسینی بنت حضرت شیخ علی محمد صدیقی نانوتوی انتقال کر گئیں اور بہ وجہِ شفقت یہ وصیت کی کہ میرے بعد اس بچّے کو کوئی ہاتھ نہ لگائے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کی تعلیم وغیرہ کا کوئی خاص اہتمام نہ کیا جا سکا، البتہ آپ نے 1258ھ میں خود اپنے شوق سے قرآن مجید چند دنوں میں حفظ کر لیا۔ سولہ سال کی عمر میں مولانا مملوک علی صاحب جو آگے چل کر مشہور استاد ومدرس اور صدر شعبۂ مشرقی علوم، دہلی کالج ہوئے اور مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی اور ڈپٹی نذیر احمد وغیرہ جن کے شاگرد ہیں کے ہمراہ دہلی کا سفر کیا اور فارسی کی مختصر کتابوں کے ساتھ ساتھ صرف ونحو پر عبور حاصل کیا۔ اسی دوران مولانا رحمت علی تھانوی سے 'تکمیل الایمان' اور شیخ عبدالحق دہلوی کی قرات اخذ فرمائی۔ خدا کی عجب شان کہ ابھی تک علوم ظاہری سے فراغت نہ ہوئی تھی کہ آپ کے دل میں خدا طلبی کا ولولہ موجزن ہوا اور آپ فقط اٹھارہ سال کی عمر میں مولانا نصیرالدین صاحب نقشبندی مجددی دہلوی کے ہاتھ پر بیعت ہو گئے۔ ان کے انتقال کے بعد مولانا میاں جی نور محمد جھنجھانوی سے بیعت کی اور ہر دو سے خرقۂ خلافت سے سرفراز کیے گئے۔[7]

اس طرح آپ کی ظاہری تعلیم گو کہ زیادہ نہ ہوئی لیکن آپ کے باطنی اور لدنّی علوم کے سبب بڑے بڑے علما وصلحا آپ کے مرید وخلیفہ ہوئے۔ حاجی صاحب کے سلسلے میں ہندستان، پاکستان، بنگلہ دیش ہی کے نہیں حجاز، شام، عراق، ترکی، مصر اور مراقش کے علما اور درویش بھی وابستہ تھے۔ ہندستان میں مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا محمد یعقوب نانوتوی، مولانا ذوالفقار

نانوتوی، مولانا محمود حسن گنگوہی، مولانا خلیل احمد سہارنپوری اور مولانا اشرف علی تھانوی جیسے کبار علما آپ ہی کے ارادت مند ہیں۔ ایک بار کسی نے مولانا اشرف علی تھانوی سے پوچھا کہ حضرت حاجی صاحب کے پاس ایسا کیا ہے جو علما کے پاس نہیں کہ وہاں جاتے ہیں۔ مولانا موصوف نے جواب دیا 'ہمارے پاس الفاظ ہیں اور وہاں معانی ہیں'۔[8]

صاحب 'گلِ رعنا' مولانا عبدالحیٔ نے اپنی مشہور عربی تصنیف 'نزہتہ الخواطر' میں بھی حاجی صاحب کی خدمات کا اعتراف نہایت احترام کے ساتھ کیا ہے۔[9]

ایک سچّے صوفی کی مانند حاجی صاحب کی ایک خاص صفت جو اولیاے کرام میں ان کا خاص طرہ امتیاز تھا ان کی وسعتِ قلبی اور رواداری تھی۔ کسی کی دل شکنی تو ان کے مذہب میں قطعاً روا نہ تھی، کسی سے معاصرانہ چشمک کا دور دور تک نشان نہ تھا۔ فروعی یا مسلکی مسائل کی بجائے اصلاح و ارشاد پر توجہ دیتے تھے۔[10]

ذوق شعری

حاجی صاحب ایک فطری شاعر تھے۔ آپ کے اشعار میں پند و نصائح کا عنصر غالب اور آپ کا اندازِ بیان دل چسپ اور موثر ہے۔ اس فن کے حصول کے لیے آپ نے کسی کے سامنے زانوے تلمذ تہ نہیں کیا۔ پروفیسر انوارالحسن انور وثوق کے ساتھ لکھتے ہیں:

راقم الحروف پوری تحقیق کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ آپ کا شاعری میں کوئی استاذ نہ تھا۔ طبیعت میں شاعری کا چشمہ ابلا اور بہہ پڑا۔ جس طرف کو بہا اسی رخ بہنے دیا اور جس طرح بہا اس کو اسی طرح چلنے دیا۔ کسی سے اصلاح لینے کی اپنے خیال میں ضرورت نہ سمجھی، کیوں کہ کچھ کہنے سے ان کا مدعا شاعری نہ تھی بلکہ دل کے جذبات کی کیف ما اتفق ترجمانی تھی البتہ' جائے استاذ خالیست' کا نظریہ اگر درست ہے اور یقیناً درست ہے تو استاذ کی رہبری سے شاعری کے خط و خال سنور جاتے ہیں، بشرطیکہ کسی کا مدعا اس کے چہرے کو نکھارتا ہو۔ بسا اوقات فطری طور پر ایسے شاعر بھی گذرے ہیں کہ جنھوں نے زندگی بھر کسی کو استاذ نہیں بنایا لیکن وہ اسے زندگی کا مشغلہ بنائے رہے اس لیے وہ بہ ہمہ وجود آسمان شعر و سخن کے آفتاب بن کر چمکے۔ آخر غالب کا بھی تو کوئی استاذ نہ تھا جس سے شعر و سخن میں انھوں نے اصلاح لی ہو، لیکن اس کا مقام اتنی بلندی پر پہنچا کہ اس فن کا امام بن گیا۔[11]

حاجی صاحب نے اکثر اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ حمد، مناجات، نعت، منقبت، قصیدہ، مرثیہ، غزل، مثنوی، مثلث، رباعی اور مخمس تمام اصناف میں

آپ کا شاعری میں کوئی استاذ نہ تھا۔ طبیعت میں شاعری کا چشمہ ابلا اور بہہ پڑا۔ جس طرف کو بہا اسی رخ بہنے دیا اور جس طرح بہا اس کو اسی طرح چلنے دیا۔ کسی سے اصلاح لینے کی اپنے خیال میں ضرورت نہ سمجھی، کیوں کہ کچھ کہنے سے ان کا مدعا شاعری نہ تھی بلکہ دل کے جذبات کی کیف ما اتفق ترجمانی تھی البتہ' جائے استاذ خالیست' کا نظریہ اگر درست ہے اور یقیناً درست ہے تو استاذ کی رہبری سے شاعری کے خط و خال سنور جاتے ہیں، بشرطیکہ کسی کا مدعا اس کے چہرے کو نکھارتا ہو۔

آپ کا کلام موجود ہے۔ بقول مرتب 'گلزار معرفت':

حضرت پیر و مرشد کا کلام منظوم اس کثرت سے ہے کہ اس کا احصا اور ضبط دشوار ہے، اس لیے آپ کے اشعار کی کوئی حتمی تعداد بیان کرنا ہمہ شما کے بس سے باہر ہے... تاہم محققین نے اس سلسلے میں جو تحقیق پیش کی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے اردو اشعار کی کل تعداد 5995، فارسی اشعار 93 اور مجموعی تعداد 6088 ہے۔[12]

جبکہ حاجی صاحب اپنی شعر گوئی کے متعلق فرماتے ہیں۔

ہے نہ یہ شعر و غزل ہے اپنی مجذوبانہ بڑ
بڑ نہیں یہ مشق کو کرتے ہیں کچھ ارشاد ہم
ڈر ہے کیا فوجِ گنہ سے، ہے خدا بخش اپنا نام
اور تجھ پر رکھتے ہیں اللہ کی امداد ہم

'گلزار معرفت' کی موجود ایک غزل میں فرماتے ہیں۔

ہم نہ شاعر ہیں، نہ ملا ہیں، نہ عالم ہیں و لے
رکھتے ہیں ہر باب میں اللہ سے امداد ہم
اے خدا بخش اس زمین میں لکھ غزل اک اور تو
تا کہ جانیں شعر گوئی میں تجھے استاذ ہم

آگے آپ کی منظوم و منثور تمام تصنیفات کا مختصر تعارف ملاحظہ ہو!

منظومات

(1) حاشیہ مثنوی مولانا روم

حاجی صاحب کو مولانا روم کے کلامِ معرفت سے والہانہ لگاؤ تھا۔ آپ نے مثنوی منشی عبدالرزاق صاحب جھنجھانوی سے سبقاً پڑھی تھی، اور منشی صاحب مثنوی کے دفترِ ہفتم کے مصنف یعنی خاتمِ مثنوی حضرت مفتی الٰہی بخش صاحب نشاط کاندھلوی کے صاحب زادے مولانا ابوالحسن کاندھلوی کے شاگرد تھے۔ حاجی صاحب نے فارسی زبان میں اس پر حاشیہ بھی لکھا، جو اپنے آپ میں ایک بڑا کارنامہ ہے۔ آپ کی حیات میں اس کے صرف دو حصے طبع ہو سکے، باقی حصص بعد میں طبع ہوئے۔ پروفیسر نثار احمد فاروقی کی اطلاع کے مطابق اس کا دفترِ اول 1314ھ، 1896-97 میں مولانا احمد حسن کانپوری کی زیرِ نگرانی مطبعِ نامی کانپور میں طبع ہوا، دوسرا دفتر غالباً 1316ھ، 1898-99 میں چھپا۔[13] بعد میں مولانا اشرف علی تھانوی نے اس میں مزید تشریحات کا اضافہ کر کے مکمل مثنوی کو تقریباً تیس جلدوں میں بنام 'کلیدِ مثنوی' شائع کیا، جو دستیاب ہے۔

(2) غذائے روح

تعلیم و تلقین کے لیے اس مثنوی میں قصص و حکایات سے مدد لی گئی ہے۔ اول حمد و نعت اور خلفاے راشدین کی منقبت ہے، پھر اپنے پیر و مرشد حافظ نور محمد جھنجھانوی کا ذکرِ خیر کیا ہے۔ بعدہ عنوان کی مناسبت سے غذاے روح کو موضوعِ سخن بنا کر سیر حاصل بحث کی ہے۔ یہ تصنیف 85 صفحات کو محیط ہے، جس میں تقریباً 1600 اشعار ہیں۔ سنہ تحریر اور نامِ تصنیف کو شعر میں اس طرح نظم کیا ہے۔

سالِ ہجری بھی ہوا جب ختم یار
یک ہزار دو صد و شصت و چہار
جب ہوئی یہ مثنوی یارو تمام
رکھ دیا اس کا غذاے روح نام

(3) تحفۃ العشاق

جیسا کہ نام سے ہی ظاہر ہے، یہ مثنوی عشقِ حقیقی اور معرفت سے پُر ہے۔ اس میں عاشقانِ الٰہی کے لیے ایسے عمدہ مضامین بیان کیے گئے ہیں، جن سے خدا کی معرفت کے حصول کا طریق معلوم ہوتا ہے۔ یہ کتاب 65 صفحات کو محیط ہے، جس میں شامل اشعار کی تعداد تقریباً 1324 ہے۔ تاریخ تصنیف اس طرح موزوں کی ہے۔

بارہ سو تھے اور اکاسی سالِ ہجر
ہو چکا جب حضرت تحفہ کا ذکر
ہو چکی جب مثنوی تحفہ تمام
تحفۃ العشاق رکھا اس کا نام

(4) گلزارِ معرفت

یہ حاجی صاحب کے اردو و فارسی دونوں کلام کا مجموعہ ہے، جس کے جامع و مرتب آپ کے ایک مرید 'میاں نیاز احمد' ہیں۔ 33 صفحات کو محیط اس کتاب میں 319 اشعار زبانِ اردو اور 93 اشعار زبانِ فارسی میں ہیں۔ اس میں حمد، نعت کے علاوہ بعض غزلیات اور مدینہ

منورہ میں قیام پذیری کے شوق و جذبات پر مبنی اشعار شامل کیے گئے ہیں۔نمونہ ملاحظہ ہو۔

ہے بڑا اچھا جو سمجھے آپ کو
اور بالا سب پہ کھینچے آپ کو
مردمِ دیدہ سے سیکھ امداد تو
سب کو دیکھے اور نہ دیکھے آپ کو

متذکرہ مثنوی سے مزید چند نہایت سلیس اور موثر اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

الٰہی یہ عالَم ہے گلزار تیرا
عجب نقشِ قدرت نمودار تیرا
عجب رنگ بے رنگ ہر رنگ میں ہے
یہ ہے رنگِ صنعت کا اظہار تیرا
تو اول تو آخر تو ظاہر تو باطن
تو ہی ہے تو ہی یا کہ آثار تیرا
جہاں لطفِ گل ہے وہیں خاکِ گل ہے
ہے گل خار میں گل میں ہے خار تیرا
خوشی غم میں رکھی ہے اور غم خوشی میں
عجب تیری قدرت عجب کار تیرا

(5) **جہاد اکبر مع نالۂ امداد غریب**

'جہادِ اکبر' کسی غیر معلوم شخص کی فارسی تصنیف کا منظوم ترجمہ ہے، جس میں اصلاحِ نفس کو موضوع بنایا گیا ہے۔اسی مناسبت سے اس کا نام 'جہادِ اکبر' تجویز کیا گیا ہے، کیونکہ حدیث کے مطابق سرحد پر جنگ کے مقابلے میں نفس سے جہاد کرنا اکبر ہے۔جیسا کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجاہدین کی ایک جماعت جناب حضرت نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی تو آپ ﷺ نے فرمایا: آگئے ؟ بہت ہی خوب آئے! تم لوگ جہادِ اصغر سے جہادِ اکبر کی طرف آگئے ہو، جس میں بندے کو نفس سے جہاد کرنا پڑتا ہے۔20

اس کا سنہ تصنیف 1268ھ ہے۔اس میں کل 36 صفحات اور 679 اشعار ہیں۔مزید 12 صفحات کو محیط ایک منظوم رسالہ بنام 'نالۂ امدادِ غریب' اس کے ساتھ منسلک ہے، جس میں ایک رباعی کے بعد، ایک مثنوی، ایک غزل اور پانچ مناجاتیں ہیں۔چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

بیاں اب یہ حال اپنا کرتا ہوں میں
کہ جس فکر میں روز مرتا ہوں میں
مجھے آ گیا جو خیال ایک رات
لگا سوچنے اپنے دل میں یہ بات
کہ افسوس غفلت میں جاتی ہے عمر
سدا کوس رحلت بجاتی ہے عمر

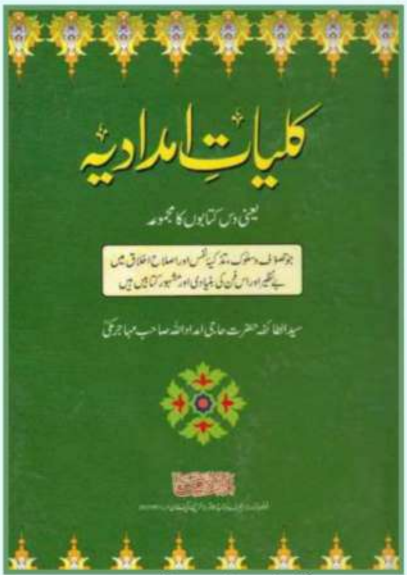

مجھے فکر کل کی ہوئی آج یوں
کہ کی دولتِ عمر برباد کیوں
نہ سویا شب اس فکر میں ایک دم
رہا رات بھر اس سے میں چشمِ نم
اسی میں گئی رات ساری گزر
شش و پنج کرتا رہا تا سحر
کہا نفس کو آخرش میں نے رات
کہ کیا ہو گیا تجھ کو اے بد صفات
خبر حال کی تجھ کو اپنے نہیں
کہ آیا تھا یاں کس لیے اے لعیں
بتا تجھ سے کیا حق کو منظور تھا
یہاں آکے کیا کام تو نے کیا

(6) **دردنامۂ غم ناک**

دس صفحے کی اس مثنوی میں 175 اشعار ہیں۔اس میں بھی حسبِ عادت جذبۂ عشقِ حقیقی کا موثر بیان ہے۔ابتدائی چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

سنو یارو عجب قصہ ہمارا
بیاں کرتا ہوں میں جو غم کا مارا
سناتا ہوں تمھیں اس کو سراسر
گزرتا ہے جو کچھ اب میری جاں پر
گزرتا ہے جو مجھ پر ان دنوں حال
نہ تھا کچھ اس سے پہلے غم کا جنجال
پڑا سوتا تھا میں خوابِ عدم میں
نہ تھا کچھ مبتلا ہستی کے غم میں

منثورات

(1) **ضیاء القلوب یا مرغوب دل**

96 صفحات پر مشتمل یہ کتاب گویا سلوک وتصوف کا جوہر اور خلاصہ ہے، جو اپنے موضوع پر نہایت عمدہ اور جامع تصنیف ہے۔اس میں نماز وتلاوتِ قرآن مجید سے متعلق بیش بہا معارف بیان کیے گئے ہیں۔مصنف نے اسے شیخ زادے حافظ محمد یوسف کی فرمائش پر قیامِ مکہ مکرمہ کے دوران 1282ھ میں بزبانِ فارسی تصنیف کیا اور اس کا نام 'مرغوبِ دل' رکھا، جیسا کہ ابتدائے کتاب میں رقم طراز ہیں:

امداداللہ فاروقی چشتی باادب عرض کرتا ہے کہ میرے بعض مخلصین علی الخصوص میرے عزیز حافظ محمد یوسف نے' جو امام العاشقین عارف باللہ کامل اکمل حضرت حافظ محمد ضامن شہید فاروقی چشتی کے لختِ جگر ہیں، بہ اصرار کہا اور تحریک کی، خاندانِ چشتیہ صابریہ قدوسیہ جن اشغال میں مشغول ہوئے تھے اور جو اذکار و مراقبات ان کے معمول بہا تھے، ان کو ایک کتاب کی صورت میں جمع کر دیجیے، جس پر عمل کیا جائے اور آئندہ کے لیے کام آئے۔21

یہ کتاب آج بھی 'ضیاء القلوب' کے نام سے دستیاب ہے۔حاجی صاحب کی حیات میں اس کا عربی زبان میں ترجمہ بھی ہوا، جو مولانا محمد حسین الٰہ آبادی کی معرفت طبع ہوا۔ایک خط میں حاجی صاحب نے لکھا ہے:

مولوی محمد حسین الٰہ آبادی کو تحریر کریں کہ اگر ضیاء القلوب عربی طبع ہو گئی ہو تو بہت جلد مطلع کریں۔اکثر مشائخِ عرب وشام واستنبول اس کے منتظر ہیں۔فقیر بھی دیکھ کر خوش ہوگا۔22

(2) **فیصلہ ھفت مسئلہ**

یہ کتاب جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، سات اہم مسائل پر مشتمل ہے، جو حسبِ ذیل ہیں: مولد شریف، فاتحہ، عرس وسماع، نداء غیر اللہ، جماعتِ ثانیہ، امکانِ نظیر، امکانِ کذب۔حاجی صاحب نے اپنے مخصوص مزاج و مذاق کے مطابق ان تمام مسائل پر سیر حاصل گفتگو کی ہے اور سببِ تصنیف یہ بیان کیا ہے:

یہ امر مسلّمات سے ہے کہ باہمی اتفاق باعثِ برکاتِ دنیوی اور دینی اور نااتفاقی موجبِ مضرتِ دنیوی و دینی ہے اور آج کل بعض مسائلِ فرعیہ میں ایسا اختلاف واقع ہوا ہے جس سے طرح طرح کے شر اور فتنے پیدا ہو رہی ہیں اور خواص کا وقت اور عوام کا دین ضایع ہو رہا ہے، حالاں کہ اکثر امور میں محض نزاع لفظی ہے اور مقصود متحد۔چوں کہ عموماً مسلمانوں کی اور خصوصاً اپنے تعلق والوں کی یہ حالت دیکھ کر نہایت صدمہ ہوتا ہے، اس لیے فقیر کے دل میں آیا کہ مسائلِ مذکورہ کے متعلق مختصر مضمون قلم بند کر کے شایع کر دیا جائے۔امیدِ قوی ہے کہ یہ نزاع وجدال رفع ہو جاوے گا۔۔۔کوئی صاحب اس تحریر کے

جواب کی فکر نہ کریں کہ مقصود میرا مناظرہ کرنا نہیں۔[23]

مذکورہ بالا اقتباس سے ثابت ہوتا ہے کہ مصنف متذکرہ مسائلِ اختلافیہ میں اپنا موقف پیش کرنا چاہتے ہیں، جس میں مزید قیل و قال کو پسند نہیں کرتے۔ اس لیے تقریباً تیس صفحات کے اس رسالے کو ختم کرتے ہوئے نصیحت فرماتے ہیں:

مفت کی بحث و تکرار میں عمرِ عزیز کو تلف نہ کریں کہ یہ حجاب ہے محبوبِ حقیقی سے۔[24]

(3) ارشاد مرشد

24 صفحات پر مشتمل اس مختصر مگر جامع رسالے میں نفل نمازوں اور روزوں کے ذکر کے بعد اوراد و وظائف، اثباتِ طریق، اثباتِ مجرد، طریقِ اسم ذات، طریقِ ذکرِ پاس انفاس، ذکرِ اسمِ ذاتِ ربانی اور لطائفِ ستہ کا ذکر مذکور ہے۔ رسالے کے اخیر میں چاروں سلسلوں؛ چشتیہ، قادریہ، نقشبندیہ، سہروردیہ کے شجروں کا بیان ہے۔ رسالے کے آغاز میں لکھتے ہیں:

فقیر حقیر امداد اللہ غفرلہ یہ کہتا ہے اور برادرانِ طریقت اور طالبانِ معرفت کی خدمت میں' خصوصاً جو اس فقیر سے رابطۂ محبت اور ارادت رکھتے ہیں، عرض کرتا ہے کہ شاغلِ اشغالِ قلبیہ پر ضرور ہے کہ سوائے فرائض اور واجبات اور سنن کے بعض عبادات اور طاعات اور اوراد اور وظائف جو مددگار اور قوت بخشنے والے صفائی دل اور جلا دینے والے روح کے ہوں، عمل میں لاوے۔[25]

اسی کتاب میں مراقبے کا طریقہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

مراقبے کا طریقہ یہ ہے کہ دوزانو نمازی کی طرح سر جھکا کے بیٹھے اور دل غیر اللہ سے خالی کر کے حق سبحانہ کی حضوری میں حاضر رکھے، اول اعوذ باللہ اور بسم اللہ پڑھ کے تین بار اللہ حاضری، اللہ ناظری، اللہ معی یعنی زبان سے تکرار کر کے پھر مراقب ہو کر ان کے معنوں کو دل سے ملاحظہ کرے اور تصور کرے یعنی جانے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ حاضر و ناظر میرے پاس ہے، اس جاننے میں اس قدر خوض کرے اور مستغرق ہو کہ شعور، غیرِ حق کا نہ رہے یہاں تک کہ اپنی بھی خبر نہ رہے۔ اگر ایک آن بھی اس سے غافل ہوا، مراقبہ نہ ہوا۔[26]

اس اقتباس میں متانت و سنجیدگی اور لطافت و سادگی کے ساتھ زبان و ادب کی پوری پوری چاشنی ہے، چناں چہ دقیق علمی باتوں کے لیے آسان اور دل کش پیرایۂ بیان، تفصیل طلب مضمون کے واسطے مختصر اور سہل اسلوب و انداز، پر مغز و پر معانی الفاظ، غرض یہ کہ زبان و ادب کی شریعت میں واجب ہونے والی تمام چیزوں کی رعایت آپ کی تحریر میں موجود ہے۔[27]

(4) وحدة الوجود

10 صفحات پر مشتمل فارسی زبان میں لکھا گیا یہ رسالہ در اصل ایک طویل مکتوب ہے، جس میں مسئلۂ وحدۃ الوجود پر گفتگو کی گئی ہے، جو نہایت نازک، دقیق اور مختلف فیہ مسئلہ ہے۔ رسالے کی آخری سطر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسالہ 21 ذوالحجہ 1299ھ یعنی ایک سو چالیس سال قبل مکہ مکرمہ کے قیام کے زمانے میں تحریر کیا گیا۔[28]

(5) مرقومات امدادیه

یہ آپ کے ان مکتوبات کا مجموعہ ہے، جن کو آپ نے مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا محمد یعقوب نانوتوی، مولانا حکیم ضیاء الدین اور حاجی عابد حسین وغیرہ جیسی ممتاز ترین ہستیوں اور بزرگوں کے نام تحریر فرمایا ہے۔ اس میں کل ایک سو گیارہ خطوط شامل ہیں، جس کو مولانا وحید الدین رام پوری نے مرتب کیا ہے۔ یہ تمام خطوط فارسی میں تھے جس کو اردو زبان میں ترجمہ کرنے کی خدمت جامعہ عثمانیہ حیدرآباد، دکن کے سابق پروفیسر مولانا عبدالحی نے انجام دی ہے۔ جس کی تمہید میں وہ لکھتے ہیں:

چونکہ ان مکتوبات کے مخاطب اکثر وہ حضرات ہیں جو اپنے وقت کے شیخ بلکہ غوث و قطب تھے، اس لیے ان مکتوبات کے مضامین بھی نہایت عالی اور مسائلِ سلوک سے مملو ہیں۔ گویا ہر خط سلوک کا ایک مستقل درس ہے اور چوں کہ بعض مضامین ان میں ایسے عالی بھی تھے جو فہمِ عوام بلکہ فہمِ بعض خواص سے بھی عالی تھے، اس لیے حضرت مولانا مولوی محمد اشرف علی صاحب دام ظلہ (رحمہ اللہ) نے ان مکتوبات پر توضیح کے لیے ضروری حواشی بھی تحریر فرما دیے ہیں۔[29]

(6) مکتوبات امدادیه

یہ بھی آپ کے مکتوبات کا ایک مجموعہ ہے، جس میں 50 خطوط مولانا اشرف علی تھانوی کے نام ہیں۔ یہ تمام خطوط اردو زبان میں ہیں اور بالکل آخری دور کے ہیں۔ آخری خط 20 ربیع الاول 1317ھ میں تحریر کیا گیا ہے، جس کے دو ماہ بعد آپ انتقال فرما گئے۔

(7) نوادراتِ امدادیه

'نوادراتِ امدادیہ' کے نام سے حاجی صاحب کے خطوط کا ایک مجموعہ ڈاکٹر نثار احمد فاروقی نے 1996 میں حضرت سید محمد گیسودراز تحقیقاتی اکیڈمی، کرناٹک سے شائع کیا۔ اس مجموعے میں وہ خطوط شامل ہیں جو حاجی صاحب نے مصنفِ 'انوارِ ساطعہ' مولانا عبدالسمیع بیدل کو لکھے تھے۔ مرتب نے مولانا بیدل کے صاحب زادے حکیم محمد میاں کے نواسے جناب رؤف الحسن (ایڈووکیٹ، میرٹھ) کی عنایت سے حاصل کر کے مرتب کیے۔[30]

اس تمام تفصیل سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اردو زبان و ادب میں حاجی صاحب کی خدمات گو نا گوں ہیں۔ ضرورت اس کی ہے کہ عینکِ ادب کے توسط سے ان کی تمام منظومات و منثورات کی باز قرات کی جائے اور ان میں ادبی محاسن تلاش کیے جائیں۔

حوالہ جات:

1. فکرِ انقلاب، ص: 134، جلد: 5، شمارہ: 112، دہلی
2. دیکھیے تعارف مومن، ص: 8، امیر حسن نورانی، رام کمار بک ڈپو
3. حیاتِ امداد، ص: 188 بحوالہ ماہنامہ دار العلوم، بابت: اگست 2006، آن لائن
4. اردو ادب اور علمائے دیوبند، ص: 13، بحوالہ ماہنامہ دار العلوم، ماہنامہ دار العلوم، بابت: اگست 2006، آن لائن
5. اردو کی تحریکی شاعری، ص: 176-177، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
6. دیکھیے امداد المشتاق، ص: 9-10، مکتبہ امداد اللہ، دیوبند، 2014
7. دیکھیے شمائمِ امدادیہ، ص: 10-11، قومی پریس لکھنؤ، 1314ھ
8. قصص الاکابر، ص: 48، بحوالہ تذکرہ مشائخِ دیوبند، ص: 71
9. نزہۃ الخواطر: 8/ 71
10. چالیس بڑے مسلمان، ص 69
11. حیاتِ امداد: 188-189، بحوالہ ماہنامہ دار العلوم، اگست 2006، آن لائن
12. ماہنامہ دار العلوم، بابت: اگست 2006، آن لائن
13. نوادراتِ امدادیہ، ص: 47-48
14. کنز العمال، بہ رقم: 11775
15. کلیاتِ امدادیہ، ص: 3
16. نوادراتِ امدادیہ، ص: 47
17. کلیاتِ امدادیہ، ص: 100، مکتبہ تھانوی، دیوبند
18. کلیاتِ امدادیہ، ص: 115
19. کلیاتِ امدادیہ، ص: 118
20. وحدۃ الوجود، ص: 7
21. ماہنامہ دار العلوم، بابت: اگست 2006، آن لائن
22. دیکھیے کلیاتِ امدادیہ، ص: 207-217
23. مرقوماتِ امدادیہ، ص: 45
24. دیکھیے نوادراتِ امدادیہ، ص: 8

■

Nadeem Ahmed Ansari
403, Mangaldarshan, Turner Road
Bandra (w), Mumbai - 400050. (MS)
Mobile : 9022278319
Emai ID : nadeem@afif.in

کوکن کتنا حسین ہے!

محمد دانش غنی

تھانے، رائے گڈھ، رتناگری اور سندھو درگ اضلاع پر مشتمل خطۂ کوکن نہ صرف مہاراشٹر بلکہ ہندوستان بھر میں خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ اس کے علاوہ کوکن کا رشتہ دنیا بھر کے مختلف ممالک سے جڑا ہوا ہے۔ بطور خاص عرب دنیا سے کوکنی مسلمانوں کی ہم رشتگی خاصی قدیم ہے اور یہی ہم رشتگی کوکن کی معاشیات کو قابلِ رشک بناتی ہے۔ اسی ہم رشتگی نے کوکنیوں کی مالی حالت کو خاصا مضبوط کر دیا ہے اور وہ پر آشوب ہندوستان میں بھی نہایت آسودہ اور بے فکری کی زندگی گزارتے ہیں۔ پرلطف و خوشگوار اور بے فکر و آسودہ حالت کی بدولت کوکنی مسلمان مستقبل کے لایعنی خوف سے محفوظ ہے۔ اس کی معاشی توانائی اور مضبوط مالی دیواریں اس کی ذات کے گرد ایک ایسا قلعہ تعمیر کرتی ہیں جس میں وہ خود کو اور آنے والی نسلوں کو محفوظ سمجھتا ہے... اور یہی خوش فہمی وہ سب سے بڑا سبب ہے جس سے کوکن کی خوبصورتی اور خوب سیرتی کے ڈانڈے ملائے جاسکتے ہیں۔

یوں تو خطۂ کوکن کو قدرت نے صورت و سیرت اور ذہانت و دولت کی بیش بہا نعمتوں سے سرفراز کیا ہے۔ ساتھ ہی یہاں کے پہاڑ، جنگل، ندی نالے، کھاڑیاں اور دریا... آم، ناریل، سپاری، چیکو، کاجو، ساگوان، بانس، نیلگری، مرغ و ماہی اور چاول وغیرہ کی پیداوار بھی عطیۂ پروردگارار اور انعامِ الٰہی کی مظہر ہے۔ رتناگری، چپلون، کالستہ، ٹھاکور واڑی، ترلوٹ، واگھیورے، داپولی، رائے گڑھ، علی باغ، وہور، شری وردھن،، جنجیرہ مروڈ، دیگھی، امبیت، لونیرے، ہری ہریشور، مہاڈ، دابھول، مارلیشور، بانکوٹ، کیلشی، انجرلا، گوہاگڑھ، مالگنڈ، گنپتی پھلے، آرے وارے، گنیش گلے، پنر گڑھ، امبول گڑھ، جئے گڑھ، پاوس، ساونت واڑی، راجاپور، آمبولی، مالون، سندھودرگ جیسے اور بھی کئی علاقے ہیں جو نہایت خوبصورت اور دیکھنے کے قابل ہیں۔ ان علاقوں میں سیاحت کو فروغ دیا جاسکتا ہے جس سے روزگار کے مواقع بھی میسر ہو سکتے ہیں۔

رتناگری خطۂ کوکن کا سب سے اہم شہر ہے اور زمانۂ قدیم سے یہ شہر علم و فن کا گہوارہ بنا ہوا ہے۔ اس خطۂ مردم خیز سے مختلف شعبۂ حیات میں تاریخی ہستیوں کا ظہور ہوا ہے۔ یہ شہر جہاں مراٹھی زبان و ادب اور تعلیمی باب میں سرفراز ہے وہیں اردو زبان و ادب اور تعلیمی میدان میں بھی تیز ہے۔ مثنوی عکسِ کوکن کے شاعر اختر راہی اس شہر کو 'نورتنوں کا رتن' کہہ کر خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں اور اس شہر کی وجہِ تسمیہ سے متعلق لکھتے ہیں:

'' رتناگری شہر کا نام آتے ہی ہاپوس کا گیروا رنگ ابھر آتا ہے۔ شیلا ہار اور چالوکیہ خاندانوں کے حکمرانوں نے اس سرزمین پر ایک قلعے کی بنیاد رکھی تھی۔ قلعے کے صدر دروازے کے پاس بیٹھ کر، روشنی کے مینار کی طرح 'رتن گری' نام کا سادھو ماہی گیر کشتیوں کی رہنمائی کرتا تھا۔ ہندو مسلم ماہی گیروں کی ایک چھوٹی سی بستی جو عقیدت میں 'رتن گری' سادھو مہاراج کے نام سے منسوب تھی۔ شہر نے گاؤں کے نام میں 'الف' کا اضافہ کیا اور وہ 'رتن گری' سے 'رتناگری' بن گیا اور وہ بھی نورتنوں کا رتناگری!''

(دورۂ کوکن کا آخری مرحلہ، مطبوعہ ماہنامہ نقشِ کوکن ممبئی، نومبر 1989، ص 14)

غرض رتناگری خوبصورت اور خوشحال شہر ہے جو ہرے بھرے قدرتی مناظر کی گود میں ایک نہایت پرسکون و پرفضا مقام پر واقع ہے۔

آکاش وانی رتناگری کیندر کے ٹرانسمیشن سینٹر کے بعد رتناگری شہر کی صنعتی ترقیاں اپنی بہار دکھاتی نظر آتی ہے۔ ایک سمت ایم آئی ڈی سی ایریا کی دور تک پھیلی ہوئی آبادی تو دوسری جانب محکمۂ آبپاشی کے دفاتر نظر آتے ہیں۔ چوڑی چکلی سڑک کے دونوں طرف کشادہ احاطوں میں بنگلوں کی قطاریں، پھل پھول کے پیڑ پودے ہاتھ ہلا ہلا کر مسافروں کا استقبال کرتے ہیں۔ آم (ہاپوس)، ناریل، کاجو، سپاری اور کٹھل کے باغات کا منظر جنت نگاہ ہے تو دور افق سے بغل گیر ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر فردوسِ گوش ہے۔ غرض یہ شہر اپنے قدرتی نظاروں، دلکش بہاروں، موسموں کے نکھار، ہواؤں کے خمار، دریا کی روانی، دھرتی کے جوبن اور پہاڑوں کی جوانی سے حسنِ فطرت کا ایک مرقع معلوم ہوتا ہے۔

رتناگری خوبصورتی اور خوب سیرتی سے عبارت ہے۔ اس کے فرزندوں نے چہار دانگِ عالم میں اپنے علم و تجربے، فن و کمال اور جوہر و ہنر سے کامرانیوں اور ظفر مندیوں کا ایک جہاں پیدا کیا ہے۔ دراصل رتناگری علم و

فن کا گہوارہ ہے۔ اردو دوستی اور تعلیم پسندی یہاں کے بزرگوں کی میراث تھی جسے نئی نسل نے اپنے مضبوط ہاتھوں سے سنبھال رکھا ہے۔ اس شہر میں اردو میڈیم کے دو بڑے ہائی اسکول موجود ہیں جن میں طلبا و طالبات کی اچھی خاصی تعداد ہے۔ گوگٹے جوگلے کر کالج کوکن کی سب سے قدیم درس گاہ ہے جس میں تقریباً پانچ ہزار بچے تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ یہاں کا شعبۂ اردو بھی کافی متحرک ہے۔ ہر سال یومِ اردو کے موقع پر اردو شعرو ادب کے مشاہیرِ اہلِ قلم کو بطور خاص بلایا جاتا ہے اور وہ طلبا و طالبات سے خطاب کرتے ہیں۔اس کے علاوہ شعبۂ اردو کے زیرِ اہتمام مختلف پروگرامس بھی کیے جاتے ہیں جس میں اساتذہ کے ساتھ ساتھ طلبا و طالبات کی ایک کثیر تعداد موجود رہتی ہے۔ کالج کی شاندار عمارت بہارآفریں مناظر کا ایک انوکھا روح پرور سماں پیش کرتی ہے۔ عقب میں بہتے ہوئے دریا، شاداب اور ہرے بھرے درختوں کی خنکی اور خوبصورتی۔ حصولِ علم کے لیے نہایت موزوں ماحول طالبِ علموں کی ذہنی اور جسمانی تشکیل وتعمیر کا مفید وسیلہ! چنانچہ یہاں کے طالبِ علم دونوں میدانوں میں تیز گام بھی رہے اور نیک نام بھی!

ضلع رتناگری حسنِ فطرت کی بہاروں سے ہی مزین نہیں ہے بلکہ اس کشتِ زار سے ایسے ایسے لعل و جواہر بھی نمودار ہوئے ہیں جن کی آب وتاب سے یہ علاقہ 'رتنوں کا رتن' کہلاتا ہے۔ رتناگری شہر کے علاوہ رتناگری کے چھوٹے چھوٹے گاؤں بھی اپنی مردم خیزی کے سبب خاصے نمایاں ہیں۔ربع صدی سے زیادہ عرصہ ہوا کہ موضع کالستہ اپنی دو چیزوں کے دم سے چاروں جانب جانا پہچانا جاتا ہے۔ ان میں ایک چیز تو مرحوم حضرت شرف کمالی صاحب کی علمی و ادبی شخصیت تھی اور دوسری چیز 'حاجی داؤدامین اردو ہائی اسکول اینڈ جونیئر کالج کالستہ' ہے۔سر سبز و شاداب پہاڑیوں کا دامن، ہرے بھرے درختوں کے جھنڈ، صبح وشام کے سنہرے مناظر اور ایک گنگناتی، گیت گاتی ہوئی ندی... پورا اطراف حسنِ فطرت کی پرنور صہبائے انبساط کی پھواروں سے شرابور! بھیگی بھیگی نرم ہواؤں کے جھکولے اور اڑتی ہوئی چاروں طرف پھیلتی ہوئی بھینی بھینی خوشبو...! اخوت، محبت، خلوص، یک رنگی، عزم وعمل اور تابناک مستقبل کی آرزوؤں سے رچی ہوئی خوشبوؤں میں آباد ایک جزیرہ نما بستی، کالستہ! خطۂ کوکن کے خوب صورت اور دلکش دیہاتوں سا ایک دیہات لیکن مردم خیز سرزمیں، جیالے انسانوں، علم وادب کے قدر دانوں اور تعلیم کے شیدائیوں کی ایک چھوٹی سی جنت جسے دیکھتے ہی دیکھتے رتناگری ضلع کا ایک ممتاز ومعروف 'تعلیمی نگر' کہلانے کا شرف حاصل ہوا ہے۔

وجے درگ (رتناگری) کی کھاڑی سے لگے ہوئے ایک چھوٹے سے قصبے کو ٹھاکورواڑی بھی کہتے ہیں اور ترلوٹ بھی۔ یہ مقام تین طرف سے پانیوں اور ایک طرف سے پہاڑیوں سے گھرا ہوا ہے۔ تین طرف سے پانی کی لوٹ (لاٹ یا موج) پہاڑی سے ٹکراتی ہے اور زندگی کا پرشور ثبوت پیش کرتی ہے۔ شاید اسی لیے اس قصبے کا ترلوٹ (تین طرف کی موجوں والا) کہتے ہیں۔ سرسبز وشاداب پہاڑی کے دامن میں انگڑائیاں لیتی ہوئی موجوں کے ساز پر، نہایت ہی پرکیف و پرفضا ماحول میں 'ابراہیم بابا ٹھاکور ہائی اسکول'' میں اردو ذریعۂ تعلیم کا بھی معقول انتظام ہے۔

'واگھیورے' تعلقہ چپلون کی ایک چھوٹی سی بستی ہے۔ رات کے تقریباً ساڑھے گیارہ بجے جب میں اپنی کار سے اترا تو سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کیا جگہ ہے دوستو! یہ کون سا دیار ہے؟ یوں لگ رہا تھا جیسے جنگل مجھے چاروں طرف سے گھیر رہا ہے۔اوبڑکھابڑسی پگڈنڈی پر میں اپنے راہبر کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا۔ یہ پگڈنڈی کسی نقطۂ نور، کسی روشنی کے مینار تک تو لے جائے گی۔ میں اسی دھن میں آگے بڑھتا رہا۔ میرے راہبر نے ہیڈ ماسٹر صاحب کے گھر دستک دی تو آنکھیں ملتے ہوئے باہر آئے اور پھر خاطر مدارت میں لگ گئے۔

صبح ساڑھے چھ بجے آنکھ کھلی۔ ماہ نومبر کا بائیسواں دن تھا۔ سورج کی ٹھنڈی ٹھنڈی کرنیں کہرے کی دبیز دیواروں سے چھن چھن کر اطراف میں پسر رہی تھیں۔ ملگجا اجالا کہرے کے بانات سے چاروں طرف چھٹک رہا تھا۔ کسی نوخیزسی، لجائی ہوئی مشرقی دوشیزہ کی طرح آہستہ قدم صبح کی نرم شعائیں ہرے بھرے درختوں کی اوٹ میں چھپ کر سرخ سرخ پہاڑیوں سے اتر رہی تھیں۔ایسی سہانی اور پرکشش صبحیں کہاں نصیب ہوتی ہیں۔ 'ڈاکٹر قاسم دلوی اردو ہائی اسکول' کی خوبصورت عمارت اپنے دلفریب رنگ و روغن کے ساتھ آنکھوں میں سمائی جارہی تھی۔ ٹھنڈی ہواؤں کے گدگداتے ہوئے نرم جھونکوں میں دور تک پھیلا ہوا آسماں اپنی طرف بلا رہا تھا۔ واقعی یہ بستی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

خوبصورت پہاڑیوں کے دامن میں واشِشٹی ندی کے زرخیز ساحل پر سرسبز وشاداب چپلون کی سرزمین آم، کاجو، ناریل، چیکو اور رنگین ودل نشیں خوشبودار پھولوں کا ہی دیس نہیں ایک تیزی سے اٹھتا ہوا ترقی پذیر تعلقہ بھی ہے۔ چاروں سمتوں میں اپنی راہیں کھولتا ہوا یہ شہر جہاں سے مشہور مراٹھی روزنامہ 'ساگر' تازہ ترین علاقائی اور ملکی خبروں کی پھواریں گھروں گھر اور قریہ قریہ چھوڑ جاتا ہے۔ مراٹھی کے علاوہ اردو زبان کی نشر واشاعت میں بھی ایک خصوصی مقام رکھتا ہے۔ یہاں اردو میڈیم کا ایک اسکول بھی ہے جس کا نام 'مہاراشٹر ہائی اسکول چپلون' ہے۔ 'ڈی بی جے کالج آف آرٹس، کامرس اینڈ سائنس چپلون' کے نام سے ایک سینئر کالج ہے جہاں اردو بھی پڑھائی جاتی ہے۔ خوب سیرتی اور خوبصورتی کے حامل اس شہر میں مسلم آبادی سکون واطمینان کے ساتھ علم وادب اور تہذیب وثقافت کی کیاریوں کو سینچ رہی ہے۔ رتناگری ضلع کے اس خوبصورت شہر میں حسنِ فطرت کی جلوہ گری قابلِ دید ہے۔

داپولی، رتناگری کا ایک اہم تعلقہ جہاں پہنچ کر میں نے بڑی فرحت محسوس کی۔ کھلا کھلا آسمان، سرسبز وشاداب اطراف، کوکن کی زراعتی یونیورسٹی اور کوکن کا راجا 'ہاپوس' کی سرزمین داپولی دور تک اپنی جاں بخش ہریالی کے ساتھ

GOGTE COLLEGE OF COMMERCE BELGAUM

پھیلی ہوئی تھی۔ ہواؤں میں ہلکی ہلکی خوشبواور بدیع الزماں خاور کے اشعار اور نظموں کی خوشبو... نیشنل ہائی اسکول کے وسیع وعریض میدان میں پہنچا تو چاروں طرف دیکھتا ہی رہ گیا۔ یہاں پر بھی ایک سینئر کالج ہے جو اطراف میں وراڈکر کالج کے نام سے جانا پہچانا ہے۔ میرے خیال سے یہاں پروفیسر خالد آرائی صاحب اردو پڑھاتے تھے۔ موجودہ صورتِ حال کا مجھے علم نہیں۔ اس کالج کی عمارت بھی بڑی دیدہ زیب ہے اور دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

شری وردھن کوکن کے مغربی ساحل پر ایک تاریخی اور پرفضا مقام ہے جو زمانۂ قدیم سے اہلِ علم وفضل کا مرکز بنا رہا۔ دین سے لگاؤ اور قدیم روایات یہاں کے مسلمانوں کے رہن سہن اور بود و باش میں خصوصیت سے نمایاں ہیں اور مدرسۂ حسینیہ جیسی درسگاہ یہاں کے دیندارانہ معاشرہ کی علامت ہے۔ یہاں اردو میڈیم کا ایک ہائی اسکول ہے اور ساتھ ہی ساتھ جونیئر کالج بھی۔ اب تو ہم یہ بھی سن رہے ہیں کہ یہاں دو سینئر کالج کھل چکے ہیں جو شہر اور اطراف کے طلبا و طالبات کی تعلیمی تشنگی کو دور کرنے میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ یہ شہر بھی شاندار روایات کا امین رہا ہے۔

جنجیرہ قلعہ اور مروڈ میں واقع محل آج بھی کوکن میں مسلمانوں کی شان و شوکت کے جیتے جاگتے شواہد ہیں لیکن افسوس کہ ان عظیم الشان تاریخی آثار و یادگار کے تحفظ وسلامتی کی طرف کسی کی توجہ نہیں۔ جس طرح یہ پتہ نہیں چلتا کہ مطبع عباسی مروڈ میں کس جگہ واقع تھا اور کس کی ملکیت تھا۔ اسی طرح آنے والی صدی میں کہیں ایسا نہ ہو کہ قلعۂ جنجیرہ کی تاریخی حیثیت وحقیقت بھی مٹا دی جائے اور اس کے وجود پر کسی اور کا نام ٹانک دیا جائے۔ جنجیرہ کا قلعہ سیدی حکمرانوں کے دور کی ایک شاندار تاریخی یادگار ہے۔ قلعے میں موجود شاہی مسجد، عمارات، میٹھے پانی کے تالاب، حسین و پرکشش باغات، دھنسی ہوئی قبریں اور مٹتے ہوئے کتبات اب بھی خطۂ کوکن میں مسلمانوں کے عروج اور اردو کے فروغ کے بچے کھچے آثار ہیں جنھیں بری طرح ملیامیٹ کردیا گیا ہے۔ اگر علاقائی مسلم دانشوروں نے اس طرف اب بھی توجہ نہ کی تو ماضی کے ایک شاندار باب کا نام ونشاں بھی نہ رہے گا۔

عرصۂ دراز سے کوکن کے پہاڑوں اور دریاؤں کے دامن میں ہندو مسلمان مشترکہ تہذیب وتمدن کے چراغ روشن کیے چلے آرہے ہیں۔ بھگتی اور گیان کی یہ مقدس سرزمیں ولیوں اور صوفیوں کے وجود سے بھی خالی نہیں رہی۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں بھی ایسی ایسی محترم و مقدس ہستیوں کا ظہور ہوا جن کے دم سے آج کا کوکن گنگا جمنی تہذیب کے رنگ سے نکھرا ہوا نظر آتا ہے۔ ایسے کئی مقامات ہیں جہاں یہ خوبی اپنی خصوصیت کے ساتھ نظر آتی ہے۔ مثلاً ہاطس کی درگاہ (رتناگری)، مارلیشور مندر (دیو رکھ)، سوامی سروپانند مندر (پاوس، رتناگری)، مروڈ کی عیدگاہ، بھگوتی مندر، گنپتی پھلے وغیرہ وغیرہ۔ علاوہ ازیں کوکن کے چھوٹے بڑے شہروں اور دیہاتوں میں جو مسجدیں ہیں انھیں بھی دیکھ کو دل ودماغ کو سکون وشانتی ملتی ہے۔ مثال کے طور پر مروڈ کی جامع مسجد، شریوردھن کی جامع مسجد، روہا کی جامع مسجد، سنگمیشور کی جامع مسجد، گورے گاؤں کی مسجد جو جدید طرزِ تعمیر کا ایک خوبصورت نمونہ ہے۔ اس طرح اور بھی کئی مسجدوں کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ میرا خیال ہے یہ مندر ومسجد بھی کوکن میں سیر وسیاحت کے فروغ میں ایک اہم کردار ادا کرسکتے ہیں۔

خطۂ کوکن جسے تعلیمی اور اقتصادی لحاظ سے ایک پسماندہ علاقہ تصور کیا جاتا رہا ہے، درحقیقت ایک کارگاہِ عمل ہے اور اس سنگلاخ زمین سے ایسے ایسے سپوتوں نے جنم لیا ہے جن کی بے مثال قوتِ کارگردگی سے سماجی، تہذیبی، علمی اور ادبی زندگی کا دامن مالامال ہے۔ ہم نے اپنے استادوں اور بزرگوں سے سنا ہے کہ دنیا کی سرسبزی و شادابی یا تباہی وتاراجی کے فیصلہ مومن کے اعمال پر منحصر ہیں۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو خطۂ کوکن گویا نیک اور پاکیزہ روحوں کا مسکن ہے۔ وہ لوگ جو ذاتی سود وزیاں پر اجتماعی فلاح و بہبود کو ترجیح دیتے ہیں، ملک وملت کے درد سے سرشار رہتے ہیں اور انسانی اقدار کی بازیافت و بحالی پر جن کی قوتِ عمل صرف ہورہی ہو اور.... جو علمِ نافع کی نشر واشاعت میں دل و جان سے جٹے رہتے ہوں یقیناً انھیں نیک اور پاکیزہ روحوں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ ان میں مولانا عبدالشکور کوکاٹے، جرمن پرکار، محمد ابراہیم صوفی، عارف سیمابی، قیصر رتناگیروی، ایچ بی مقدم، الحاج عبدالغنی فجندار، آئی ٹی پرکار، شرف کمالی، بدیع الزماں خاور، بیرسٹر عبدالرحمٰن انتولے، آرزو بانکوٹی، ابراہیم احمد سندیلکر، اختر راہی، عبدالکریم نائیک، فقیر محمد مستری، عارف بانکوٹی کے علاوہ اور بھی بہت سے نام لیے جاسکتے ہیں۔ علی ایم شمسی، عبدالرحیم نشتر، پرویز باغی، انجم عباسی، تسنیم انصاری، رفیق وستا، صابر بدنیروی، نظام الدین سعد، اقبال عامل، وفا راجیواڑی، بدر الدین بدر، رفیق بزمی، اقبال سالک یہ وہ شخصیات ہیں جن سے مل کر دلی سکون حاصل کیا جاسکتا ہے۔

بادل اڈ رہے ہیں۔ ایک ملگجی سی روشنی چاروں طرف پھیل گئی ہے۔ بھیگی بھیگی شام بڑی خوش گوار لگ رہی ہے اور نرم وخنک ہواؤں کے لمس سے ذہن ودل فرخندہ ہورہے ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے سکینہ اتر رہی ہو۔ آہستہ آہستہ شام رات میں تبدیل ہورہی ہے اور میرے اطراف ایک اندھیرا چھا گیا ہے۔ میری کار تیزی سے گھنگھور اندھیری رات کا سینہ چیرتی ہوئی مروڈ کی طرف دوڑ رہی ہے۔ آگے آگے روشنی کی ایک لکیر ہے جو ہموار و ناہموار راستوں کو روشن کرکے مسلسل بڑھتے رہنے کی تحریک دے رہی ہے۔ چاروں طرف پھیلا ہوا اندھیرا، بارش کا زوردار شور، آسمان سے اترتے ہوئے سیاہ بادلوں کا سایہ! صاف کھلتا بھی نہیں کیونکہ تھپکیاں دیتی ہوئی ٹھنڈی ہوا آنکھوں میں اور حواس پر غنودگی کے جام انڈیل رہی ہے لیکن میں پھر بھی پورے ہوش وحواس میں ڈرائیو کررہا ہوں۔ اندھیروں میں ڈوبے ہوئے جنگل، دریا، پہاڑ اور میدان جب اچانک تیز روشنی میں نہا جاتے ہیں تو آنکھیں بے ساختہ بول اٹھتی ہے.... ''کوکن کتنا حسین ہے!''

کتابیات:

1. اردو زبان کا سوتیلا بچہ، ڈاکٹر عبدالرحیم نشتر، رحمانی پبلی کیشنز، مالیگاؤں، 2005
2. کوکن میں اردو تعلیم (حصہ اول)، ڈاکٹر عبدالرحیم نشتر، نرالی دنیا پبلی کیشنز، نئی دہلی، 1996
3. کوکن میں اردو تعلیم (حصہ دوم)، ڈاکٹر عبدالرحیم نشتر، نرالی دنیا پبلی کیشنز، نئی دہلی، 1999
4. ماہنامہ نقشِ کوکن ممبئی، نومبر 1989
5. ماہنامہ نقشِ کوکن ممبئی، جنوری 1992

Prof. Mohd. Danish Gani
Dept. of Urdu
Gogate Jogalekar College
Ratnagiri - 415 612
Mobile No. 9372760471, 7972555651

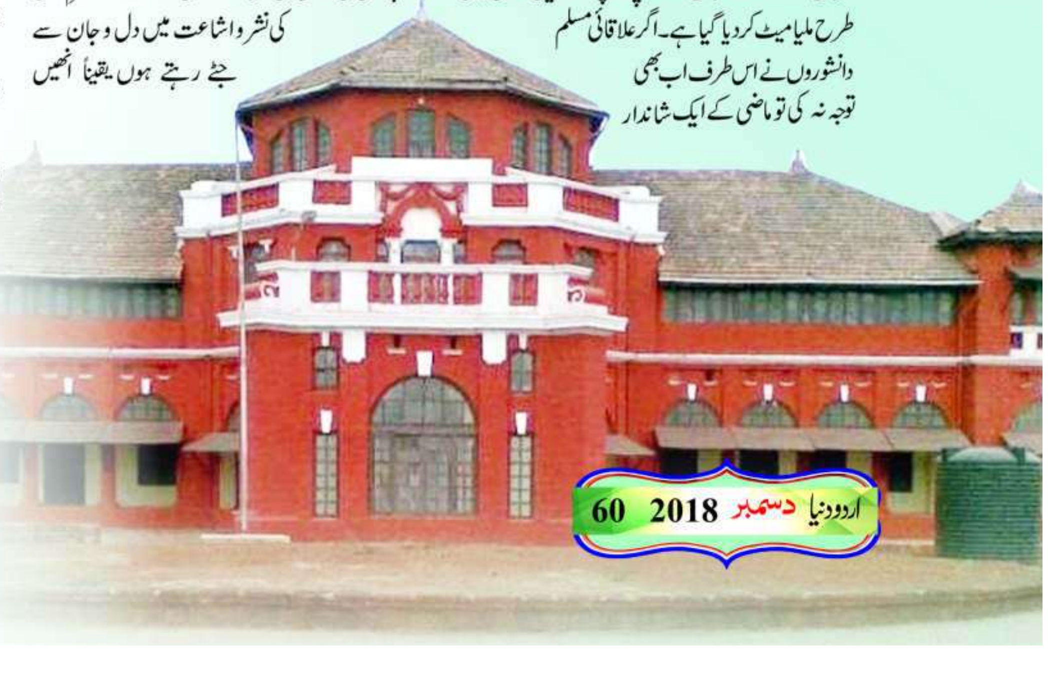

انٹرنیٹ کی تعریف تاریخ اور وائرس

عبدالمغنی صدیقی

انٹرنیٹ نہ ہی کوئی سافٹ ویئر ہے اور نہ ہی ہارڈویئر۔ انٹرنیٹ دو کمپیوٹروں کے درمیان پیدا شدہ ربط کو کہتے ہیں اور مواد کمپیوٹر تاروں کے ذریعے ایک کمپیوٹر سے دوسرے کمپیوٹر تک پہنچایا جاتا ہے جسے Packet Switching کہتے ہیں۔ دورِ حاضر میں Packet Switching کے علاوہ وائرلیس انٹرنیٹ سے صارفین استفادہ کرتے ہیں۔

امریکہ کے محکمہ دفاع پنٹگان نے پہلی بار 1969 میں (Arpanet- Advanced Research Projects Network کے نام سے پروگرام شروع کیا۔ محکمہ دفاع اس پروگرام کو اپنی دفاعی صلاحیت میں مزید اضافہ کے لیے استعمال کرتا تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب امریکہ اور اس کے ساتھی ملک روس سے سرحدی جنگ سے دوچار تھے۔ انھیں وجوہات کی بنا پر Ian Peter اپنے مضمون The Begnings of the Internet میں لکھتے ہیں کہ:

"Bob Taylor, the Pentagon official who was in charge of the Pentagon's Arpanet program, insists that the purpose was not military, but scientific."

http://www.nethistory.info/History %

بہت سے لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ پنٹگان نے نیوکلیر خطرات کے پیش نظر Arpanet پروگرام کو شروع کیا تھا مگر ''اِیان پیٹر'' اس کی نفی کرتے ہیں۔ الغرض انٹرنیٹ کی شروعات کا سہرا امریکہ کے محکمہ دفاع پنٹگان اور پروگرام Arpenet کے سَر ہی جاتا ہے۔

1969 تا 1972 تک تقریباً چالیس کمپیوٹر کو Packet Switching کے ذریعہ جوڑ دیا گیا جسے Donald Davies نے ایجاد کیا تھا۔ اس طریقہ کار میں ہر ایک کمپیوٹر کو انفرادی طور پر نام دے دیا جاتا تھا اور تاروں کے ذریعہ برقی لہروں کی مدد سے پیغامات ایک کمپیوٹر سے دوسرے کمپیوٹر تک پہنچائے جاتے تھے۔ ان تمام کمپیوٹرس میں ایک ہی سافٹ ویئر اور ایک ہی پروگرام ہوتا تھا جس کی مدد سے پیغامات کو بھیجنے میں زیادہ مشکلات درپیش نہیں آتیں۔

مختلف جائزوں کے تحت آج ہندوستان میں تین سو پچاس ملین انٹرنیٹ صارفین ہیں۔ اور ان میں ایک سو پچاس ملین افراد مقامی زبان میں انٹرنیٹ استعمال کرتے ہیں۔ جبکہ چین دنیا بھر میں انٹرنیٹ کے استعمال میں سر فہرست ہے۔ ہندوستان میں ہر منٹ انٹرنیٹ صارفین میں اضافہ ہو رہا ہے۔ جس رفتار سے اضافہ ہو رہا ہے اُسی رفتار سے انٹرنیٹ سے جڑے مسائل بھی سامنے آ رہے ہیں ان مسائل میں انٹرنیٹ کا استعمال، انٹرنیٹ پر کنٹرول کے علاوہ ''وائرس'' ایک اہم مسئلہ ہے۔

انٹر نیٹ اور بچوں کی حفاظت:

انٹرنیٹ ہر کس و ناکس کے لیے 'علاء الدین کے چراغ' سے کم نہیں۔ براؤزنگ کی دنیا میں جو آپ چاہتے ہیں انٹرنیٹ سکنڈوں میں آپ کے سامنے پیش کرتا ہے۔ بات کم سن اور معصوم بچوں کی آتی ہے تو یہاں والدین کو احتیاطی اقدامات کی اشد ضرورت ہے۔ کم عمر بچے اکثر و بیشتر انٹرنیٹ کا استعمال کرتے ہیں یہ ضروری ہے کہ آپ اپنے سسٹم پر بچوں کے لیے الگ 'یوزر' بنائیں۔ کنٹرول پیانل میں موجود 'Parental controls' کے ذریعہ آپ کمپیوٹر پر وقت کا تعین کر سکتے ہیں۔ اس کنٹرول کے ذریعہ آپ بچوں کو مقررہ وقت پر ہی کمپیوٹر کے عادی بنا سکتے ہیں۔ بچے عام طور پر گیمس کے شوقین ہوتے ہیں اور آپ Parental controls کے ذریعہ انھیں محدود گیمس کی اجازت دے سکتے ہیں۔ ان طریقوں سے آپ اپنے گھر میں ایک فائدہ بخش انٹرنیٹ کو فروغ دینے میں کامیاب رہیں گے۔

انٹرنیٹ کو مزید محفوظ اور فائدہ مند بنانے کے لیے آپ کو چاہیے کہ آپ اپنے کمپیوٹر میں Web filtering کے ذریعہ غیر اخلاقی ویب سائٹس کو بلاک کر دیں۔ اس کے علاوہ آپ اپنے سسٹم میں پورن بلاکنگ سافٹ ویر انسٹال کرتے ہوئے اس کام کو مزید آسان بنا سکتے ہیں۔ یہ وہ عوامل ہیں جس کے ذریعہ آپ اپنے گھر میں ایک صحت مند کمپیوٹر کا نظام پیدا کر سکتے ہیں۔ آپ کے معصوم بچے انٹرنیٹ کے عادی نہیں ہوں گے، ان کا وقت ضائع نہیں ہوگا۔ اور ان کی تعلیم بھی متاثر نہیں ہوگی۔ کھیل کود بچوں کے لیے بہت ضروری ہوتا ہے مگر آج کل انٹر نیٹ کی لت نے کم سن بچوں کو انٹرنیٹ سے باندھ کر رکھ دیا ہے جو ان کی ذہنی و جسمانی نشو و نما کے لیے سنگین خطرہ ہے۔ مگر والدین انٹرنیٹ پر کنٹرول کے ذریعہ ان خطرات

سے اپنے بچوں کو محفوظ رکھ سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ انٹر نیٹ سے پیدا ہونے والا ایک بڑا مسئلہ 'وائرس' ہے۔

انٹر نیٹ اور وائر س :

کمپیوٹر وائرس، کمپیوٹر کے ڈسک آپریٹنگ سسٹم پر عارضی کنٹرول حاصل کرتے ہیں جب یہ کمپیوٹر انٹرنیٹ کے ذریعہ یا CD,Pen Drive کے ذریعہ دوسرے کمپیوٹر سے تعلق جوڑتا ہے تب یہ وائرس اُس کمپیوٹر میں منتقل ہوتا ہے اور دیمک کی طرح فائلس کو تباہ و برباد کردیتا ہے۔

'وائرس' کی تعریف ملاحظہ ہو:

کمپیوٹر وائرس، کمپیوٹر پروگرام ہوتے ہیں جو بہت سے کوڈ شدہ ہدایتوں (Code Instructions) سے مل کر بنتے ہیں جو بنیادی فرق ایک پروگرام اور وائرس میں ہوتا ہے کہ وائرس اپنے آپ کو بڑھاتے ہیں اور ان کے اندر بغیر ہدایت پائے خود بخود چلنے اور عمل کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ کمپیوٹر وائرس بہت وسیع اصطلاح ہے جس میں صرف وائرس ہی نہیں بلکہ ورمس (Worms) اور ٹروجنس (Trojans) بھی شامل ہوتے ہیں۔

(کمپیوٹر سکیوریٹی اور وائرس ص 32)

وائرس کی تاریخ اور اس کی پیدائش بتانا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے مگر یہ بات طے ہے کہ فادر آف دی کمپیوٹر "Charlse Babbidge" کے کمپیوٹر، بانچ مشین میں کوئی وائرس نہیں تھا مگر Univac 1108 اور IBM 360/370 کمپیوٹرس میں Prevading Animal اور Christmas نامی وائرس موجود تھے یہ کمپیوٹر کئی ٹن وزنی اور کافی طویل ہوا کرتے تھے۔ 1960 یا 1970 کے درمیان کمپیوٹر وائرس کی پہچان ہوئی اور کمپیوٹر میں آنے والی اس بیماری کو 'وائرس' کا نام دیا گیا۔ کمپیوٹر وائرس کے پھیلنے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ:

"وائرس کا تصور 1949 میں پیش کیا گیا تھا جب جان وان نیومین John Von Newmann نے ایک مقالے میں 'سلف رپلیکٹنگ پروگرام' کا تصور پیش کیا جو ناممکن لگا اور رد کردیا گیا اس کے بعد وائرس جیسا پہلا پروگرام تفریحی کھیل کی شکل میں امریکی ٹیلی فون اور ٹیلی گراف کمپنی کے بل لیب (Bell Labs) میں سامنے آیا جس کا نام "کوڈ وارس (Code Wars) تھا۔ کوڈ وارس میں دو کھلاڑی پروگرامس کے سٹ کو کوڈ کرتے تھے جو دوسرے کھلاڑیوں کے پروگرام کو تباہ کردیتے تھے ایسے پروگراموں کے امکانی خطرات کو سمجھتے ہوئے ماہرین نے اس طرح کے پروگراموں کی موجودگی کو مخفی رکھا ساتھ ہی ساتھ میسا چوسٹس انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی (Massachusetts Institute of Technology) میں طلبا کمپیوٹر پر اس طرح کے تجربات کررہے تھے، جو اس سے پہلے کبھی کسی نے نہیں کیا تھا۔ دوسرے پروگراموں میں گڑبڑ پیدا کرنے کے ان کے اس مقابلے کے شوق نے کمپیوٹر وائرس جیسی چیز کا تصور پیش کیا۔"

(کمپیوٹر سکیوریٹی اور وائرس 31 تا 32)

مندرجہ بالا اقتباس سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ 'کمپیوٹر وائرس' کی پیدائش اپنی برتری حاصل کرنے کے علاوہ دوسروں پر کنٹرول کرنا بھی تھا اس طرح اس کو یعنی اسے کمپیوٹر کی دہشت گردی کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ یہ دہشت گردی اتنی خاموشی کے ساتھ آپ کے سسٹم کو تباہ کرتی ہے، کہ اس کا احساس آپ کو اُس وقت ہوتا ہے جب آپ کا کمپیوٹر پوری طرح سے ناکارہ ہو جاتا ہے۔

وائرس کی تاریخ پر ایک طائرانہ نظر:

1983 میں 414 نامی ایک گروپ نے امریکہ کی حکومت کے Computer Networks میں داخل ہونے میں کامیابی حاصل کی۔ اس کے لیے انھوں نے Apple11+ کمپیوٹر اور ایک Modem کا استعمال کیا تھا۔ اسی سال Fred cohen نے کمپیوٹر وائرس کی اصطلاح استعمال کی یعنی ایک ایسا پروگرام جو کسی کمپیوٹر کی کارکردگی کو متاثر کرسکتا ہے اور جس میں خود کار کاپی کرنے

کی صلاحیت ہو۔ 1986 میں پہلی بار MS-DOS کا وائرس Brain پاکستان کے دو لڑکوں باسط اور امجد فاروق نقوی نے تیار کیا۔ انھوں نے فلاپی ڈسک کے Bootsector کا تجزیہ کرکے اُس کو متاثر کرنے کا ایک طریقہ معلوم کیا۔ یہ لڑکے اصل میں سافٹ ویئر فروخت کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ ان کے فروخت کردہ سافٹ ویئر کو دوسرے لوگ نقل نہ کرسکیں۔ چنانچہ فروخت کیے جانے والے سافٹ ویئر کے ساتھ انھوں نے Brain وائرس شامل کیا۔ جب سافٹ ویئر کو دوسری فلاپی پر کاپی کیا جاتا تو یہ وائرس 360KB یا 50KB فلاپی ڈسک میں داخل ہو کر Bootsector پر قبضہ کرتا تھا اور یہ فلاپی جہاں بھی جاتی اس کمپیوٹر کی میموری میں اپنی جگہ بنا کر Data تباہ کرنا شروع کردیتا تھا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ یہ وائرس دوسری ڈسک میں منتقل ہونے کی صلاحیت کا حامل بھی تھا۔ اسی سال ایک اور وائرس بھی تیار ہوا جسے Videm کا نام دیا گیا۔ اس وائرس کو پہلا File Virus کہا جاتا ہے۔ جس کی خاصیت یہ تھی کہ وہ کمپیوٹر میں موجود فائلوں کے Data اور فائل الوکیشن ٹیبل (FAT) کو متاثر کرتا تھا۔

1987 میں lehigh اور Christmas warm منظر عام پر آئے جو DOS کی Command files کو متاثر کرتے تھے۔ اسی سال ایک ایسا وائرس بھی سامنے آیا جو EXE فائلوں کو متاثر کرتا تھا۔ Suriv-02 نامی یہ وائرس اصل میں virus کو الٹ کر لکھا گیا ہے۔ یہی وائرس بعد میں Jerusalem Virus میں تبدیل کیا گیا۔ جو ایک گھنٹہ میں پانچ لاکھ نقلیں تیار کرکے IBM کے Main Frame system کو تباہ کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا، اس وائرس نے امریکہ اور میڈل ایسٹ کے لاکھوں کمپیوٹرس کو متاثر کیا۔

1988 میں ایک 23 سالہ نوجوان 'رابرٹ موریس' نے ایک ایسا وائرس بنایا جو Arpanet Computers پر حملہ کرسکتا تھا۔ اس چھوٹے سے پروگرام نے تقریباً چھ ہزار کمپیوٹروں کو متاثر کیا۔ اس کا طریقہ کار یہ تھا کہ وہ کمپیوٹر کے Memory Bank کی سیکڑوں کاپیاں تیار کرکے میموری کو ختم کردیتا تھا۔ موریس نے اعتراف کیا کہ اس نے یہ شرارت بوریت کا شکار ہوکر کی تھی۔ اس کو تین سال

کی سزا اور دس ہزار ڈالر جرمانہ کیا گیا۔ 1990 میں بلغاریہ سے کئی وائرس پروگرام کمپیوٹر کی دنیا میں داخل کیے گئے۔ ان کو تیار کرنے والا شخص اپنے آپ کو Dank Avengy کہتا تھا۔ یہ سارے وائرس اسی نام سے پکارے جانے لگے۔ ان وائرس کا طریقہ کار یہ تھا کہ اگر یہ وائرس کسی طرح میموری میں پہنچ جاتے تو کسی فائل کو کھولتے ہی اپنا کام شروع کردیتے تھے۔

1991 میں Philip zimmerman نے Data کو Decode کرنے والا PGP نام کا ایک Tool تیار کیا۔ امریکی حکومت نے اس معاملے کی بڑی سختی سے تفتیش کی۔ اس واقعہ کے بعد امریکی حکومت کے Encryiption Law کا ساری دنیا میں استعمال ہونے لگا۔

1991 تک کمپیوٹر وائرس کے پھیلنے کا واحد ذریعہ CD اور فلاپی تھا مگر انٹرنیٹ کی ترقی نے اس وائرس کو پھلنے اور پھولنے کا بہترین ذریعہ دے دیا۔ 1991 میں ہی Symatic کمپنی نے پہلی بار Norton Antivirus سافٹ ویئر تجارتی سطح پر تیار کیا جس میں اس وقت تک کے ممکنہ Virus کی شناخت کرنے اور ان کے اثرات زائل کرنے والا پروگرام شامل تھا۔ 1994 میں کچھ شریر ذہنوں نے E-Mail کے ذریعہ وائرس منتقل کرنے شروع کیے۔ اس طرح کے E-mail پر Good Times لکھا ہوتا تھا۔ اور جب اسے کھولا جاتا تب وائرس کمپیوٹر کے Hard disc کو متاثر کردیتا تھا۔

1995 میں Microsoft کمپنی نے Windows95 جاری کیا جس سے Anti virues تیار کرنے والی کمپنیوں کو یہ خوش فہمی رہی کہ Operating system وائرس کی روک تھام کرنے کا اہل ہے۔ لیکن اسی سال Macro Virues تیار ہوا۔ جو اس نئے آپریٹنگ سسٹم میں خرابی پیدا کرنے کا اہل تھا۔

1998 میں کچھ لوگوں نے امریکہ کے پانچ سو سے زیادہ دفاعی اور سرکاری محکموں کے کمپیوٹروں پر کنٹرول حاصل کرلیا۔ اس کی وجہ سے ملک کی دفاعی نظام کو شدید خطرات لاحق ہوگئے۔ حکومت کو شبہ ہوا کہ یہ حرکت عراق کی شہہ پر کی گئی ہے۔ لیکن بعد میں پتہ چلا کہ اس حرکت کے پیچھے کیلی فورنیا کے دو کم عمر نوجوان تھے۔ اس واقعہ پر امریکہ کی فلم کمپنی نے 'ڈائی ہارٹ' نامی فلم بھی بنائی جس میں اس واقعہ کو بڑے ہی خوبصورت طریقہ سے فلمایا گیا۔

1999 میں Me Lissa نامی وائرس کی وجہ سے ہزاروں کمپیوٹر بڑی تیزی سے بیکار ہوگئے جس سے تقریباً 80 ملین ڈالر کا نقصان ہوا۔ یہ وائرس Out look کی Address Book سے پہلے پچاس ناموں کا انتخاب کرکے خود بخود انھیں E-mail روانہ کرتا تھا اور ان کو حاصل کرنے والی مشین میں موجود MS-word کا ڈاٹا متاثر کرتا تھا۔ اس وائرس پروگرام کو لکھنے والے 33 سالہ 'ڈیوڈ ایل اسمتھ' کو 2001 میں 20 مہینے کی سزا سنائی گئی تھی۔ ان واقعات کے بعد Anti Virus پیکج کی فروخت اپنے عروج پر جا پہنچی۔

2000 میں I Love you وائرس نے Me lissa کی طرح لاکھوں کمپیوٹروں تک رسائی حاصل کرکے ان کے ڈاٹا کو تباہ کردیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ اس وائرس کو تیار کرنے والا Phillipine کا ایک نوجوان کمپیوٹر کا طالب علم تھا۔ چوں کہ Phillippine میں کمپیوٹر وائرس کے لیے کوئی

قانون موجود نہیں تھا۔ اس لیے اس لڑکے کو کوئی سزا نہیں دی جاسکی لیکن اس کے بعد یورپی یونین نے Cyber Crime treaty کو عالمی سطح پر روشناس کرایا۔ صرف ایک سال بعد 2001 میں Anna kournicova وائرس نے کمپیوٹر سیکورٹی کے ماہرین کو چوکنا کردیا کیوں کہ یہ پروگرام Toolkit کو استعمال کرکے لکھا گیا تھا جسے ایک بہت ہی ناتجربہ کار پروگرامر بھی آسانی سے تیار کرسکتا تھا۔ 2001 ہی میں Code red نے ہزاروں مائیکرو سافٹ کے NT اور 2000 کے Servers کو برباد کردیا۔ اس سے تقریباً دو ملین ڈالر کا نقصان ہوا۔ یہ پروگرام امریکی صدر کی رہائش گاہ White House پر تمام مشینوں کو متاثر کرکے انھیں استعمال کرسکتا تھا۔ اس خطرہ سے نمٹنے کے لیے وائرس کی کھوج کرنے والوں اور تکنیکی ماہرین کی مدد سے اس کا توڑ دریافت کیا گیا اور وہائٹ ہاؤس کے کمپیوٹرس کے ڈاٹا کو محفوظ رکھا گیا۔ کچھ ہی ماہ بعد وائرس کی ایک اور آفت کمپیوٹر پر آنے والی تھی۔ 2001 میں 11 ستمبر کے واقعہ کے کچھ دن بعد Nimda virus دریافت ہوا جس نے دنیا بھر میں لاکھوں کمپیوٹروں کے مواد کو غارت کردیا۔ اس وائرس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ اپنی نوعیت کا بہت ہی باریکی سے تیار کردہ پروگرام تھا۔ اس میں سسٹم کو متاثر کرنے کے لیے پانچ طریقے اختیار کیے گئے تھے۔ اور اس میں اپنے آپ کو نقل کرکے منتقل کرنے کا بھی انتظام تھا۔

2003 میں Slammer نامی Warm نے تین گھنٹے سے بھی کم وقت کے اندر دنیا بھر کے ہزاروں کمپیوٹروں کو غارت کردیا۔ اس کی وجہ سے ATM مشین بھی متاثر ہوئیں اور Airline کمپنیوں کی ہوائی اڑانوں پر بھی اس کا اثر پڑا۔ اس وائرس کو اب تک کا سب سے زیادہ تیز پھیلنے والا وائرس مانا گیا ہے۔ اوائل 2004 میں Mydoom virus نے E-mail کے ذریعہ تباہی مچائی۔ یہ وائرس پروگرام دلچسپ نفسیاتی طریقے اختیار کرتا ہے۔ جس میں یہ بتایا جاتا ہے کہ آپ نے جو mail بھیجا تھا وہ Fail ہوگیا ہے اور یہ بھی ہدایت کرتا ہے کہ اس mail کے ساتھ منسلک attachment کھول کر دیکھا جائے اور جیسے ہی استعمال کرنے والا Attachment کھولتا ہے اس کے کمپیوٹر میں وائرس پروگرام داخل ہو جاتے ہیں۔

مندرجہ بالا سطور میں صرف چند اہم وائرس کا ذکر کیا گیا ہے لیکن کمپیوٹر کی دنیا میں وائرس ہزاروں کی تعداد میں ہیں۔ اور ان میں روز بروز اضافہ ہوتا رہتا ہے جن کی تفصیلات پیش کرنا مضمون کی طوالت کے پیش نظر ممکن نہیں۔

وائرس کی روک تھام کے طریقہ و تدارک :

انٹرنیٹ سے وائرس کی روک تھام کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے کمپیوٹر میں جدید ترین Anti Virus کو Update کرنے کے علاوہ Parental (PCB) Control Bar سافٹ ویئر کو بھی انسٹال کریں یہ بالکل مفت سافٹ ویئر انٹرنیٹ پر موجود ہے تاکہ انٹرنیٹ کے غلط استعمال اور خاص طور پر فحش ویب سائٹ سے بچا جا سکے۔ وائرس کی رسائی کی اہم وجہ ویب سائٹس اور پن ڈرائیو سے ہوتا ہے اس لیے ضروری ہے کہ آپ اپنے پن ڈرائیو میں بھی اینٹی وائرس انسٹال کریں۔

Dr. Abdul Moghni Siddiqui
20.3.373, Moosa Bowli
Hussaini Allam Road, Hyderabad
Bahadurpura-500064 (telangana)

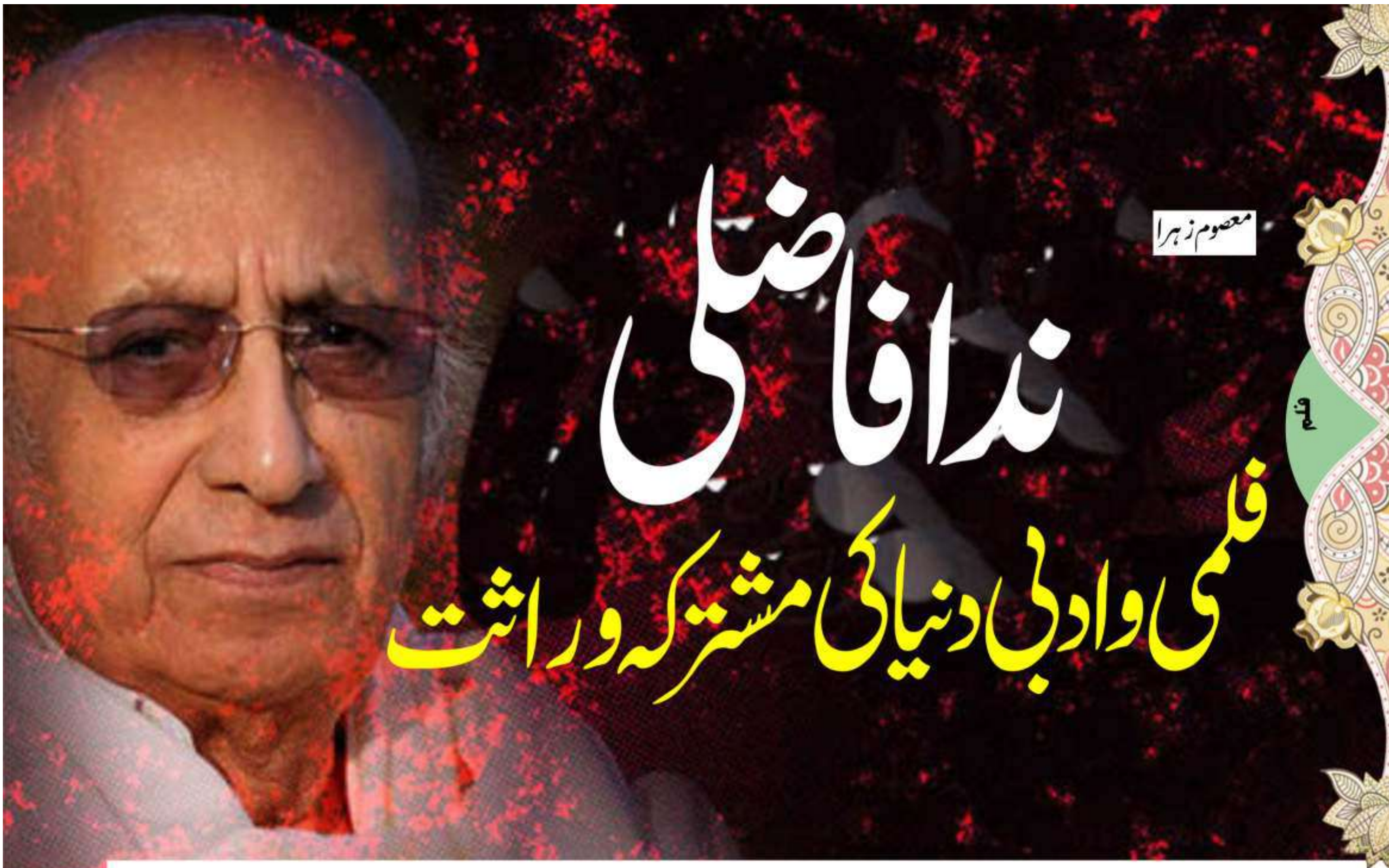

معصوم زہرا

ندا فاضلی

فلمی و ادبی دنیا کی مشترکہ وراثت

اردو کے بغیر ہندوستانی فلم کی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی۔

کیونکہ اردو واحد ایسی زبان ہے جو ہر ماحول و حالات میں خود کو ڈھالنے کی صلاحیت رکھتی ہے اگر اردو زبان میں یہ صلاحیت نہ ہوتی تو فلموں اور فلمی نغموں کے فروغ میں اردو زبان کبھی قابل قدر نہ سمجھی جاتی۔ یہ حقیقت ہے کہ اردو کے استعمال کے بغیر کامیاب فلموں کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کیونکہ جب بھی فلموں کے مکالمے، کہانیاں، نغمے، تحریر کیے گئے تو اردو زبان کو ہی فوقیت حاصل رہی۔ اردو شعرا و ادبا کی ایک طویل فہرست ہے جنھوں نے ہندوستانی فلموں کو اپنی نثری و شعری تخلیقات سے فروغ بخشا۔ اگر فلموں میں فکشن کی بات کی جائے تو پریم چند، بیدی، اور منٹو سے لے کر سلیم جاوید تک فکشن نگاروں کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ اسی طرح اگر فلموں میں نغمہ نگاروں کو پیش نظر رکھیں تو آرزو لکھنوی، مجروح سلطانپوری، راجہ مہدی علی خاں، ساحر لدھیانوی، قمر جلال آبادی، شکیل بدایونی، کیفی اعظمی، حسرت جے پوری، شہریار، گلزار، جاوید اختر وغیرہ نے پوری اردو شاعری اور فلمی نغمہ نگاری کے مابین بہت مستحکم رشتہ استوار کیا ہے۔ ان نغمہ نگاروں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے بہت ہی سادہ اور عام فہم زبان میں عوام کی دلچسپی کو پیش نظر رکھتے ہوئے نغمے تحریر کیے، ان شعرا کی کاوشوں کو اتنا فروغ ملا کہ ان کے نغمے زبان زد خاص و عام اور ضرب المثل بن گئے۔

ان شعرا میں ندا فاضلی کی آواز عصر حاضر کی مقبول اور معتبر آواز ہے ان کی شاعری ذاتی تجربات کے ساتھ عوام و خواص کے بھی جذبات و احساسات کی ترجمان ہے جو ان کے شعری مجموعے لفظوں کا پل، مور ناچ، آنکھ اور خواب کے درمیان، کھویا ہوا سا کچھ، شہر تو میرے ساتھ چل، زندگی کی طرف، میں بخوبی سنائی دیتی ہے۔ جن میں غزل، نظم، دوہے، گیت، وغیرہ جیسی اصناف میں ان کے تصورات و ذاتی تجربات کی دنیا آباد ہے۔

جدید لب و لہجہ کے ممتاز شاعر اور نامور فلمی نغمہ نگار ندا فاضلی 12 اکتوبر 1938 کو دہلی میں پیدا ہوئے ان کے والد میر مرتضٰی حسن دعا اپنے عہد کے نمائندہ شاعر تھے۔ چونکہ ندا فاضلی ایک ادبی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اور اسی ماحول میں ان کی پرورش ہوئی یہی وجہ ہے کہ کم عمری میں ہی شاعری کا آغاز کر دیا تھا۔ ان کے شعری میلان کی محرک سورداس کی نظم ہے جو انھوں نے ایک مندر کے پاس سے گزرتے ہوئے سنی جس میں رادھا اور کرشن کی علیحدگی کا بیان تھا۔ نظم سن کر ندا فاضلی بہت متاثر ہوئے اور اسی وقت بطور شاعر اپنی شناخت قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔

ندا فاضلی کا آبائی وطن جموں کشمیر تھا لیکن ان کا خاندان گوالیار آ کر بس گیا تھا تقسیم ہند کے بعد فرقہ وارانہ فسادات نے کئی شہروں کو تباہ کر دیا تھا اسی دوران گوالیار بھی ہندو مسلم فساد کی زد میں تھا۔ اسی سبب ندا فاضلی کے والدین نے پاکستان ہجرت کا فیصلہ کیا مگر ندا فاضلی نے ہندوستان میں ہی قیام کو ترجیح دی اس وقت ندا فاضلی وکرم یونیورسٹی اجین میں ایم۔ اے (اردو) سال آخر کے طالب علم تھے ایم۔ اے کرنے کے بعد مسلسل تلاش معاش میں سرگرداں رہے کبھی کلکتہ کبھی دہلی اور کبھی راجستھان کا سفر کیا بالآخر ممبئی پہنچے۔ قیام ممبئی کے ابتدائی ایام میں ندا فاضلی نے بہت عسرت، تنگدستی اور کسمپرسی کی زندگی گزاری ان دنوں وہ ہندی میگزین دھرم یگ اور ہندی، اردو ہفتہ وار اخبار 'بلٹز' میں کالم لکھتے تھے اور اخبار کے دفتر میں ہی چادر بچھا کر سو جاتے تھے۔ غالباً انھوں نے اسی پس منظر میں یہ شعر کہا تھا

تنہا تنہا بھٹک رہا ہے انجانی سی راہوں میں
شاید اپنے ساتھ وہ اپنے شہر کو لانا بھول گیا

رفتہ رفتہ جب ادبی رسائل و اخبارات میں کلام شائع ہونے لگے تو ندا فاضلی کی شہرت بڑھتی گئی اور مزید شہرت اس وقت حاصل ہوئی جب ان کی غزل مایہ ناز گلوکار جگجیت سنگھ اور ان کی بیگم چترا نے اپنی خوبصورت آواز میں عوام تک پہنچائی۔ غزل کا مطلع ہے

دنیا جسے کہتے ہیں جادو کا کھلونا ہے
مل جائے تو مٹی ہے کھو جائے تو سونا ہے

یہ غزل اتنی مقبول ہوئی کہ ندا فاضلی فلمی ہدایت کاروں کی توجہ کا مرکز بن گئے۔ اسی دوران فلم 'رضیہ سلطان' کے

اصل نغمہ نگار جاں نثاراختر کے انتقال کے بعد فلم کے ہدایت کار کمال امروہوی ایک اچھے شاعر کی تلاش میں تھے۔ ندا فاضلی کے گیت سے متاثر ہو کر انھوں نے ندافاضلی سے رابطہ کیا اور فلم کے باقی نغمے لکھنے کی ذمہ داری سونپ دی اور ہدایت دی کہ موسیقار خیام کے ساتھ مل کر ایسا نغمہ رقم کیجیے جو فلم کی شان کو دو بالا کر دے۔ اس فلم کے لیے ندا فاضلی نے دو نغمے 'آئی زنجیر کی جھنکار خدا خیر کرے' اور 'ترا ہجر ہی مرا نصیب ہے' لکھے۔ اور لکھنؤ سے تعلق رکھنے والے آل انڈیا ریڈیو کے ہوسٹ کبن مرزا کی آواز نے نغمے کے حسن کو دوبالا کر دیا۔ اس فلم میں ہیما مالنی اور دھرمیندر نے اہم کردار ادا کیا اور یہی فلم ندا فاضلی کے کیریئر کے آغاز میں معاون ثابت ہوئی۔ اس فلم کی کامیابی کے بعد ندا فاضلی نے بہت سی فلموں میں نغمے لکھے جن میں فلم آہستہ آہستہ، سرفروش، اس رات کی صبح نہیں، ناخدا، آپ تو ایسے نہ تھے، یاترا، سُر وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

فلم 'آہستہ آہستہ' کا نغمہ 'کبھی کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا' نے نہ صرف لاکھوں دلوں کو جیت لیا بلکہ یہ نغمہ شہرت کی اس منزل تک پہنچا کہ فلم کی مقبولیت کا سبب بن گیا۔ اس نغمہ کی موسیقی خیام نے مرتب کی اور مشہور گلوکارہ آشا بھوسلے اور بھوپیندر سنگھ نے اپنی مترنم آواز سے نغمہ کو دلکشی بخشی جو فلمی ہدایات کے ساتھ ساتھ ادبی تقاضوں کو پورا کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

کبھی کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا
کہیں زمیں تو کہیں آسماں نہیں ملتا
کہاں چراغ جلائیں کہاں گلاب رکھیں
چھتیں تو ملتی ہیں لیکن مکاں نہیں ملتا
جسے بھی دیکھیے وہ اپنے آپ میں گم ہے
زباں ملی ہے مگر ہم زباں نہیں ملتا

اس طرح فلم 'سرفروش' کا نغمہ 'ہوش والوں کو خبر کیا بے خودی کیا چیز ہے' کو جگجیت سنگھ نے اپنی آواز دی اور اس غزل نے بھی لازوال شہرت حاصل کی اور عامر خان، نصیر الدین شاہ اور سونالی بیندرے پر فلمایا گیا ہے۔ دو شعر ملاحظہ ہوں جو پورے نغمے کی جان ہیں۔

ان سے نظریں کیا ملیں روشن فضائیں ہو گئیں
آج جانا پیار کی جادو گری کیا چیز ہے
ہم لبوں سے کہہ نہ پائے ان سے حال دل کبھی
اور وہ سمجھے نہیں یہ خامشی کیا چیز ہے

اور فلم 'آپ تو ایسے نہ تھے' کا نغمہ بہت دلکش و پسندیدگی کی سند بنا ہوا تھا اور محمد رفیع کی آواز نے اس نغمہ کے حسن میں چار چاند لگا دیا، اس کا تغزلانہ اور رومانوی آہنگ اپنی مثال آپ ہے جو عام روش سے ہٹ کر ہے اور سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ادبی پیرائے میں اور عام فہم زبان میں لکھا گیا ہے۔

ندا فاضلی نے ادبی اور معیاری فلمی نغمے لکھے، ان لازوال شہرت یافتہ فلمی نغموں سے قطع نظر ندا فاضلی نے چند فلمیں بھی لکھیں جن میں وجے، ہرجائی اور 'فلک' کے نام قابل ذکر ہیں۔ انھیں بڑے کمال کے موسیقار بھی ملے جن میں خیام، آر۔ڈی۔ برمن وغیرہ موسیقی کے بڑے نام ہیں۔ ندا فاضلی کے فلمی نغموں کے علاوہ کچھ غزلیں بھی مشہور زمانہ گلوکاروں نے گائی ہیں مثلاً۔ لتا منگیشکر اور جگجیت سنگھ کی آواز میں اس غزل نے بہت شہرت پائی۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

ہر طرف ہر جگہ بے شمار آدمی
پھر بھی تنہائیوں کا شکار آدمی
صبح سے شام تک بوجھ ڈھوتا ہوا
اپنی ہی لاش کا خود مزار آدمی
زندگی کا مقدر سفر در سفر
آخری سانس تک بے قرار آدمی

شاعر شہری زندگی سے نالاں ہے۔ انسان اتنا خودغرض اور مفاد پرست ہو گیا ہے کہ آج کا انسان ہزاروں لاکھوں آدمیوں کے بیچ میں تنہائی محسوس کرتا ہے۔ کیونکہ شہروں میں خلوص اور انسانی رشتوں کا پاس ہی نہیں رہا۔ ریاکاری، مکاری، جھوٹ، فریب، بے حسی اتنی بڑھ چکی ہے کہ ندا فاضلی آدمی کو اپنی لاش کا مزار کہنے پر مجبور ہو گئے جو صبح سے شام تک بدن کا بوجھ لیے پھرتا ہے۔ چھوٹی بحر اور سیدھے سادے اور آسان الفاظ میں بڑی ہی سادگی اور خوبصورتی سے لفظ 'آدمی' کو بطور ردیف پیش کر کے بے حس آدمی کی آدمیت پر گہرا طنز کیا ہے۔

تنہائی پر ندا فاضلی کی دوسری غزل جسے غلام علی نے اپنی آواز دے کر لافانی بنا دیا ہے وہ یہ ہے۔

تنہا تنہا دکھ جھیلیں گے محفل محفل گائیں گے
جب تک آنسو پاس رہیں گے تب تک گیت سنائیں گے

یہ پوری غزل ندا فاضلی کے ذاتی تجربات کا مظہر ہے جو ممبئی جیسے شہر میں عالم تنہائی میں زندگی گزار رہے تھے۔ عالم تنہائی میں انسان کن کن حالات سے دو چار ہوتا ہے، کتنی صعوبتیں برداشت کرتا ہے ساری کیفیات کا اظہار ہمیں ندا فاضلی کی شاعری میں ملتا ہے۔ ان نغموں کے علاوہ ان کے کچھ نغمے اور اس کے گلوکاروں کے نام درج ذیل ہیں جنھوں نے فلمی دنیا کے ساتھ ساتھ ادبی دنیا میں بھی ندا فاضلی کی ایک الگ شناخت قائم کی۔

بہت خوبصورت ہیں آنکھیں تمھاری
(جگجیت سنگھ)

بے نام سا یہ درد ٹھہر کیوں نہیں جاتا
(جگجیت سنگھ)

ہر ایک گھر میں دیا بھی جلے اناج بھی ہو
(جگجیت سنگھ)

چاند سا چہرہ رات سی زلفیں ہرنی جیسی چال
(محمد رفیع)

چاہت ندیا چاہت ساگر
(الکا یاگنک، فلم چاہت)

ایسا ہو تو کیسا ہو
(کشور کمار، سوپنا، فلم گہرا زخم)

گھر سے مسجد ہے بہت دور چلو یوں کر لیں
(سونو نگم، فلم تمنا)

ہر ایک راستہ سجا کے چل
(آشا بھوسلے، فلم امیر آدمی غریب آدمی)

زندگی یہ زندگی دو گھڑی کی زندگی
(لتا منگیشکر۔ فلم دولت)

کس کی صدائیں مجھ کو بلائیں
(آشا بھوسلے، کشور کمار۔ فلم ریڈ روز)

تم سے مل کر زندگی کو یوں لگا
(لتا منگیشکر، فلم چور پولیس)

ندا فاضلی کی فلمی شاعری کی زبان سہل ممتنع کی بہترین مثال ہے، کہیں بھی پیچیدگی یا الجھاؤ کا احساس نہیں ہوتا۔ انھوں نے جن مسائل و موضوعات کو اپنی شاعری کا محور بنایا وہ دوسرے معاصرین شعراء میں خال خال ہی نظر آتا ہے۔ انھوں نے دور حاضر کے حقائق کو اپنی شاعری کا ترجمان بنایا جسے ہر شخص اپنی زندگی میں محسوس کر سکتا ہے۔

ندا فاضلی کی انھیں خدمات کے سلسلے میں 1998 میں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ اور 2004 میں مدھیہ پردیش حکومت نے اپنے سب سے بڑے اعزاز شکھر سمان سے بھی سرفراز کیا اور 2003 میں فلم 'سُر' کی بہترین نغمہ نگاری کے لیے اسٹار اسکرین ایوارڈ، بالی ووڈ مووی ایوارڈ اور مہاراشٹر حکومت کی جانب سے میر تقی میر ایوارڈ اور 2013 میں ہندوستان حکومت نے پدم شری جیسے اعزاز سے مفتخر کیا۔

8/فروری 2016 کو فلمی و ادبی شاعری کا درخشندہ آفتاب غروب تو ہو گیا مگر اس کی روشنی شعری افق پر آج بھی جلوہ گر ہے۔

■

Masoom Zohra
Research Scholar, Dept of Urdu
Aligarh Muslim University
Aligarh - 202001

کیریئر

مسابقتی امتحانات حکومتی ملازمتیں

فہیم احمد عبدالباری مومن

اس بات سے یکسر انکار ممکن نہیں ہے کہ موجودہ دور میں جب ملازمتوں کا حصول مشکل اور سخت مقابلہ آرائی کا متقاضی ہے، ایک حکومتی ملازم عمدہ اور پُرکشش تنخواہ کے ساتھ ساتھ مختلف سہولتوں سے آراستہ زندگی گذارتا ہے۔ یہ بات کہنے میں ہمیں بالکل بھی تعرض نہیں ہے کہ ایک حکومتی ملازم (گورنمنٹ سرونٹ) ایک خوشحال اور ایک محفوظ ترین ملازمت کرتا ہے۔ حکومتی ملازمتوں کا حصول اگر مشکل نہیں تو بہت آسان بھی نہیں ہے۔ مختلف حکومتی شعبوں میں ملازمت کے لیے امیدوار کو سخت محنت کے ساتھ ساتھ ملازمت کے لیے منعقدہ امتحانات میں شریک دیگر امیدواروں کے مقابلے میں خود کو اہل ثابت کرنا پڑتا ہے اور ایک مرتبہ کامیاب ہوجانے کے بعد اس کی ترقی کے راستے کھل جاتے ہیں۔ بھارت میں حکومتی ملازمتوں میں اقلیتوں بالخصوص مسلمانوں کی نمائندگی ان کی آبادی کی شرح کے لحاظ سے بہت کم ہے۔ نیشنل سیمپل سروے آرگنائزیشن کے مطابق مذہبی گروپس کے لحاظ سے بھارت میں روزگار میں شمولیت کی شرح مسلمانوں میں سب سے کم یعنی 32.6% ہے جو دیگر اقلیتوں کے مقابلے بھی سب سے کم ہے جبکہ مسلمان اس ملک کی سب سے بڑی اقلیت ہیں۔ سچر کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق حکومتی ملازمتوں میں مسلمانوں کی نمائندگی کی شرح آئی اے ایس میں 3%، آئی ایف ایس میں 1.8%، آئی پی ایس میں 4% اور انڈین ریلوے میں 4.5% جس کا 98% نچلی سطح کی ملازمتوں میں ہے۔ گذشتہ برسوں میں اس صورتِ حال میں کچھ بہتر تبدیلی ضرور آئی ہے جب ہمارے سماج میں تعلیمی بیداری اور حکومتی ملازمتوں میں شمولیت کی کوششیں تیز ہوئی ہیں۔ لیکن اب بھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہماری بڑی آبادی حکومتی ملازمتوں کے تئیں لا تعلق اور غلط فہمی کا شکار ہے۔ جس کو دور کرنا اور ہماری نمائندگی میں اضافہ کرنے کے لیے زمینی سطح پر کوشش کرنی ہوگی۔ آیئے ہم حکومتی ملازمتوں کے حصول کے لیے مقابلہ جاتی امتحانات کا ایک اجمالی جائزہ لیتے ہیں۔

حکومتی ملازمت یا گورنمنٹ سروس سے کیا مراد ھے؟ ایسی خدمات جو حکومت کے ذریعے راست یا بالراست طور پر عوام کی فلاح و بہبود کے لیے فراہم کی جاتی ہے انھیں انجام دینے والے ادارے 'حکومتی ادارے' اور ان میں خدمت انجام دینے والے ملازمین 'حکومتی ملازمین' کہلاتے ہیں۔ ان خدمات کو پبلک سروسیس یا عوامی خدمات بھی کہا جاتا ہے۔ مثلاً حکومتی شعبے، ریلوے، حکومتی بینک، حکومتی یا حکومتی امداد یافتہ کالج، اسکول، اسپتال وغیرہ۔ ان اداروں میں اعلیٰ سے ادنیٰ سطح تک ملازمت کے بے شمار مواقع ہیں جنھیں مقابلہ جاتی امتحانات میں کامیابی کے ذریعے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ حکومتی ملازمین کو پُرکشش تنخواہوں کے علاوہ میڈیکل، سفر، بچوں کی تعلیم و دیگر سہولیات حاصل ہونے کے علاوہ ملازمت میں تحفظ حاصل ہوتا ہے اور سبکدوشی کے بعد پینشن کی مراعات بھی حاصل ہوتی ہیں۔

گزیٹیڈ اور نان گزیٹیڈ آفیسر؟ حکومتی ملازمین کو ان کے رینک کے مطابق کلاس ون، ٹو، تھری اور فور کی کیٹیگری میں تقسیم کیا گیا ہے جنھیں گزیٹیڈ و نان گزیٹیڈ آفیسر کہا جاتا ہے۔ کلاس وَن اور کلاس ٹو آفیسرس کو گزیٹیڈ آفیسرس کہا جاتا ہے جنھیں صدر جمہوریہ و ریاستی گورنر کی ایما پر دفتری دستاویزات (Official Documents) کو جاری کرنے یا ان کی تصدیق کرنے کی اجازت ہوتی ہے جبکہ کلاس تھری و کلاس فور کے آفیسرس نان گزیٹیڈ آفیسرس کہلاتے ہیں۔

یوپی ایس سی اور ریاستی پبلک سروسیس کمیشن: مرکزی سطح پر اعلیٰ ترین آفیسرس جنھیں ہم گریڈ 'اے' آفیسرس کہتے ہیں ان کا تقرر یونین پبلک سروسیس کمیشن کے تحت کیا جاتا ہے۔ ان میں آئی اے ایس، آئی پی ایس، آئی ایف ایس، آئی آر ایس وغیرہ اس طرح کی تقریباً چوبیس سروسیس کی اسامیوں کے لیے امتحانات منعقد کیے جاتے ہیں۔ یو پی ایس سی کا امتحان تین مرحلوں پر مشتمل ہے جس میں پریلمنری امتحان میں دو پرچے، مین امتحان میں نو پرچے ہوتے ہیں جبکہ پرسنل انٹرویو اس کا آخری مرحلہ ہے۔ اسی طرز پر ریاستی سطح پر ہر ریاست میں مختلف محکموں میں اعلیٰ افسران کی تقرری کے لیے ریاستی پبلک سروسیس کمیشن کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ ان امتحانات میں شرکت کے لیے تعلیمی اہلیت، کسی بھی فیکلٹی سے گریجویشن کامیاب ہونا لازمی ہے۔ دیگر تفصیلات کے لیے www.upsc.gov.in اور ریاستی پبلک سروسیس کمیشن کی ویب سائٹ مثلاً ریاستِ مہاراشٹر کے لیے www.mpsc.gov.in سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

اسٹاف سلیکشن کمیشن (SSC)؟ اسٹاف سلیکشن کمیشن حکومت ہند کے ڈپارٹمنٹ آف پرسونل اینڈ ٹریننگ سے وابستہ ادارہ ہے جو حکومت کے مختلف محکموں

میں نان گزیٹیڈ آفیسر کی تقرری کے لیے امتحانات منعقد کرتا ہے۔ یہ امتحانات دو سطح پر منعقد کیے جاتے ہیں۔ بارہویں کامیاب طلبہ کے لیے لوور ڈویژن کلرک، جونیر سورٹنگ آفیسر، پوسٹل اسسٹنٹ، سارٹنگ اسسٹنٹ، کورٹ کلرک اور ڈاٹا انٹری آپریٹر وغیرہ کے لیے امتحان اسٹاف سلیکشن کمیشن کمبائنڈ ہائر سیکنڈری لیول (SSC CHL) کہلاتے ہیں۔ بارہویں کامیاب کوئی بھی امیدوار ان امتحانات میں شرکت کرسکتا ہے۔ یہ امتحانات تین لیول (III Tier) پر منعقد کیے جاتے ہیں۔ Tier I کمپیوٹر بیسڈ امتحان، Tier II بیانیہ پرچہ اور Tier III مہارت اور ٹائپنگ ٹیسٹ پر مشتمل ہوتا ہے۔ جبکہ گریجویشن کامیاب امیدواروں کو حکومت کے مختلف محکموں میں گروپ بی اور گروپ سی کی پوسٹ پر تقرری کے لیے اسٹاف سلیکشن کمیشن، کمبائنڈ گریجویٹ لیول (SSC CGL) امتحان منعقد کرتا ہے۔ یہ امتحان چار مرحلوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ Tier I پریلمنری امتحان، Tier II مینس، Tier III بیانیہ پرچہ اور Tier IV کمپیوٹر ٹیسٹ، ٹائپنگ مہارت پر مشتمل ہوتا ہے۔ کسی بھی فیکلٹی سے گریجویٹ امیدوار اس امتحان میں شرکت کے اہل ہیں۔ مزید معلومات کے لیے کمیشن کی ویب سائٹ www.ssconline.nic.in سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

انسٹی ٹیوٹ آف بینکنگ پرسونل سلیکشن (IBPS)؟ اسٹیٹ بینک آف انڈیا کے علاوہ دیگر حکومتی بینکوں میں گریجویٹ امیدواروں کی تقرری کے لیے اس ادارہ کا قیام کیا گیا ہے۔ قومی بینکوں میں پروبیشنری آفیسرس اور کلرک کے لیے یہ امتحانات اس ادارہ کے ذریعے منعقد کیے جاتے ہیں۔ ادارہ کے ذریعہ منعقد کیے جانے والے امتحانات مشترکہ تحریری امتحان (Common Written Exam) کہلاتے ہیں۔ یہ امتحان دو مرحلوں پریلمنری اور مینس پر مشتمل ہوتے ہیں۔ یہ امتحانات آن لائن منعقد کیے جاتے ہیں جس کے بعد پرسنل انٹرویو بھی لیا جاتا ہے۔ امتحان کا نصاب، اہم تاریخیں و دیگر تفصیلات کے لیے انسٹی ٹیوٹ کی ویب سائٹ www.ibps.in سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

اسٹیٹ بینک آف انڈیا (پروبیشنری آفیسر): یہ قومی سطح کا امتحان اسٹیٹ بینک آف انڈیا منعقد کرتا ہے۔ طلبہ کو یاد رکھنا ہوگا کہ آئی بی پی ایس امتحان میں اسٹیٹ بینک کی شرکت نہیں ہوتی۔ آئی بی پی ایس دیگر پبلک سیکٹر بینکوں کے لیے امتحان منعقد کرتا ہے جبکہ اسٹیٹ بینک آف انڈیا اپنی برانچوں میں پروبیشنری آفیسر کے لیے خود امتحان منعقد کرتا ہے۔ طریقہ کار، نصاب، اہلیت تقریباً وہی ہیں جو آئی بی پی ایس کے امتحان میں درج ہیں جبکہ مزید معلومات www.sbi.co.in/careers سے حاصل کی جاسکتی ہے۔

ریلوے ریکروٹمنٹ بورڈ (RRB)؟ ہندوستانی ریلوے حکومتی شعبوں میں سب سے زیادہ روزگار فراہم کرنے والا ایک ادارہ ہے۔ ہندوستان میں وزارتِ ریلوے کے تحت مختلف ریلوے ریکروٹمنٹ بورڈ (RRBs) کے ذریعے ملازمت نوٹیفکیشن جاری کیا جاتا ہے۔ فی الوقت ہندوستان میں (اکیس) ریلوے ریکروٹمنٹ بورڈ ملک کے مختلف علاقوں میں کام کررہے ہیں اور ضرورت کے مطابق ملازمت کا نوٹیفکیشن جاری کرتے ہیں۔ یہ ریکروٹمنٹ بورڈ ملک میں ریلوے کے سترہ زون جو حاجی پور، بھنیشور، کولکتہ، الہ آباد، گورکھپور، جے پور، گوہاٹی، دہلی، سکندرآباد، بلاس پور، ہبلی، چینئی، جبل پور، ممبئی کے علاوہ میٹرو ریلوے کولکتہ وغیرہ میں واقع ہیں۔ (ممبئی سینٹرل اور ویسٹرن ریلوے جبکہ کولکتہ ایسٹرن، ساؤتھ ایسٹرن کے علاوہ کولکتہ میٹرو ریلوے کا مرکز ہے۔)۔ ریلوے کی ملازمتیں چار گروپ پر مشتمل ہوتی ہیں جن میں سے 'گروپ اے' اور 'گروپ بی' کی ملازمتیں ''گزیٹیڈ'' جبکہ 'گروپ سی' اور 'گروپ ڈی' کی ملازمتیں نان گزیٹیڈ ہوتی ہیں۔ 'گروپ اے' پوسٹ : 'گروپ اے' کے تحت اسامیوں کی تقرری یونین پبلک سروس کمیشن، سول سروس امتحان، انجینئرنگ سروس امتحان اور کمبائنڈ میڈیکل سروس امتحان کے ذریعے کی جاتی ہے۔ 'گروپ بی' پوسٹ : 'گروپ بی' اسامیوں میں براہ راست تقرری نہیں ہوتی بلکہ اس کیٹگری کی پوسٹ جیسے سیکشن آفیسر وغیرہ گروپ سی سے ترقی دے کر پُر کی جاتی ہے۔ 'گروپ سی' پوسٹ : 'گروپ سی' کے تحت ٹیکنیکل اور نان ٹیکنیکل پوسٹ مثلاً کلرک، اسٹیشن ماسٹر، ٹکٹ کلیکٹر، کمرشیل اپرینٹس، ٹرافک اپرینٹس، انجینئرنگ پوسٹ (سول، میکانیکل، الیکٹریکل، سگنل اور ٹیلی کمیونکیشن وغیرہ) کی ہوتی ہیں۔ 'گروپ ڈی' پوسٹ : 'گروپ ڈی' کی پوسٹ ٹریک مین، اسسٹنٹ، ہیلپر، اسسٹنٹ پوائنٹس مین، صفائی والا، صفائی والی، گن مین، پیون وغیرہ پر مشتمل ہوتی ہے۔ ریلوے میں مختلف ملازمتوں کے لیے تعلیمی قابلیت دسویں، آئی ٹی آئی سے لے کر گریجویٹ اور مخصوص اسامیوں کے لیے میڈیکل وانجینئرنگ و دیگر شعبوں میں تعلیمی قابلیت ضروری ہے۔ لیکن ان تمام ملازمتوں کے لیے امیدواروں کو مقابلہ جاتی امتحانات سے گزرنا پڑتا ہے۔ حکومت نے دسویں کے ساتھ جن شعبوں میں آئی ٹی آئی کی شرط لازمی تھی اس میں سے آئی ٹی آئی کی شرط کو ختم کردیا ہے۔ اب دسویں، بارہویں اور گریجویٹ کامیاب طلبہ اپنی لیاقت کے مطابق درخواست دے سکتے ہیں۔ نصاب و دیگر معلومات کے لیے ریلوے کی ویب سائٹ http://www.rrcb.gov.in/rrbs.html سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

جیوڈیشیل مجسٹریٹ فرسٹ کلاس امتحان (JMFC)؟ وکالت کامیاب (ایل ایل بی) امیدوار سیشن کورٹ میں بحیثیت جج کی تقرری کے لیے مہاراشٹر پبلک سرویس کمیشن کے ذریعے منعقدہ اس امتحان میں شرکت کرسکتے ہیں۔ اس امتحان کو ایم پی ایس سی سول جج (جونیر ڈویژن) امتحان بھی کہا جاتا ہے۔ اس امتحان کا طریقہ کار بھی پریلمنری، مینس اور انٹرویو پر مشتمل ہوتا ہے۔ پریلمنری امتحان میں 200 مارکس کا ایک پرچہ جبکہ مینس امتحان میں سو، سو مارکس کے دو پرچے ہوتے ہیں اور انٹرویو کے لیے پچاس مارکس مختص ہوتے ہیں۔ امتحانات کے نوٹیفکیشن و دیگر تفصیل کے لیے امیدوار www.mpsc.gov.in سے استفادہ کرسکتے ہیں۔

کمبائنڈ ڈیفینس سروسیس (CDS)؟ بھارتی

فوج کے مختلف شعبوں آرمی، نیوی اور ائیر فورس میں شامل ہوکر کریئر بنانے کے خواہشمند امیدواروں کے لیے یونین پبلک سروسیس کمیشن سال میں دو مرتبہ کمبائنڈ ڈیفینس سروسیس کے امتحانات منعقد کرتی ہے۔ ان امتحانات کے ذریعے انڈین ملیٹری اکیڈمی، آفیسرس ٹریننگ اکیڈمی، انڈین نیول اکیڈمی اور انڈین ائیر فورس اکیڈمی میں تقرری کی جاتی ہے۔ ان امتحانات میں شرکت کے لیے غیر شادی شدہ گریجویٹ جن کی عمر 19 تا 24 سال کے درمیان ہونا لازمی ہے۔ امیدواروں کو آبجیکٹیو ٹائپ تحریری امتحانات میں شرکت کرنی ہوتی ہے۔ تحریری امتحانات میں کامیاب ہونے والے امیدواروں کو سروس سلیکشن بورڈ انٹرویو کے لیے منتخب کرتا ہے یہ انٹرویو عموماً ایک ہفتے پر مشتمل ہوتے ہیں جس کے دوران امیدوار کو جسمانی اور نفسیاتی ٹیسٹ سے گذرنا پڑتا ہے۔ ٹیسٹ میں کامیابی کے بعد میڈیکل جانچ کے مرحلے سے گذرنا ہوتا ہے۔ انڈین ملیٹری اکیڈمی، انڈین نیول اکیڈمی اور انڈین ائیر فورس اکیڈمی کے امتحانات انگریزی، جنرل نالج، بنیادی ریاضی کے سو، سو مارکس کے تین پرچے تین سو مارکس پر مشتمل ہوتے ہیں جبکہ آفیسرس ٹریننگ اکیڈمی کے لیے انگریزی اور جنرل نالج پر مشتمل سو، سو مارکس کے دو پرچے ہوتے ہیں۔ ان امتحانات کے نوٹیفکیشن، نصاب، پرچوں کی تفصیل اور تیاری کے طریقہ کار کے لیے ویب سائٹ www.upsc.gov.in سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

نیشنل ڈیفینس اکیڈمی (NDA)؟ بارہویں جماعت کامیاب طلبہ کے لیے آرمی، نیوی اور ائیر فورس میں شامل ہونے کا دوسرا ذریعہ نیشنل ڈیفینس اکیڈمی ہے۔ یہ ادارہ کھڑک واسلہ، پونے، مہاراشٹر میں واقع ہے جہاں انڈین آرمڈ فورسیس کے تینوں شعبوں آرمی، نیوی اور ائیر فورس کی ٹریننگ دی جاتی ہے۔ اس کے امتحانات یو پی ایس سی کے تحت منعقد کیے جاتے ہیں۔ اس اکیڈمی کی خاص بات یہ ہے کہ یہ دنیا کی پہلی ایسی اکیڈمی ہے جو ایک ہی مقام پر تینوں خدمات کی تربیت کا مرکز ہے۔ اکیڈمی میں داخلے سال میں دو مرتبہ (جنوری اور جولائی) ہوتے ہیں۔ صرف غیر شادی شدہ مرد امیدوار ہی امتحان میں شرکت کرسکتے ہیں۔ امیدوار کی عمر کم از کم ساڑھے سولہ برس اور زیادہ سے زیادہ ساڑھے انیس برس ہونی چاہیے۔ منتخب امیدواروں کو تین برس پر مشتمل انڈر گریجویٹ کورس اور ٹریننگ مکمل کرنی ہوتی ہے۔ امیدوار سائنس اور ہیومنیٹیز کے مضامین منتخب کرسکتا ہے۔ سائنس فیکلٹی کے طلبہ کو فزکس، کیمسٹری، میتھس یا کمپیوٹر سائنس جبکہ ہیومنیٹیز کے طلبہ تاریخ، معاشیات، سیاسیات اور جغرافیہ کا مطالعہ کرنا ہوتا ہے جبکہ انگریزی اور ایک بین الاقوامی زبان (عربک، چائنیز، فرینچ، یا رشین) کا مطالعہ لازمی ہے۔ کورس مکمل ہونے پر جواہر لال نہرو یونیورسٹی کی جانب سے بی اے/ بی ایس سی یا بیچلر ان کمپیوٹر سائنس کی ڈگری تفویض کی جاتی ہے۔ دلچسپی رکھنے والے طلبہ یاد رکھیں کہ اکیڈمی میں آرمی میں داخلے کے لیے بارہویں (کسی بھی فیکلٹی سے) جبکہ ائیر فورس اور نیوی میں داخلے کے لیے بارہویں فزکس اور میتھس سے کامیاب ہونے کے علاوہ اکیڈمی کی مجوزہ جسمانی اور میڈیکل شرائط پورا کرنا لازمی ہے۔ تین سال کا گریجویشن مکمل کرنے کے بعد امیدواروں کو آرمی امیدواروں کو انڈین ملیٹری اکیڈمی، بحریہ کے امیدواروں کو انڈین نیول اکیڈمی میں ایک سال تربیت جبکہ ائیر فورس کے امیدواروں کو ائیر فورس اکیڈمی حیدرآباد میں ڈیڑھ سال کی تربیت حاصل کرنا لازمی ہے۔

نیشنل اھلیتی ٹیسٹ و اسٹیٹ اھلیتی ٹیسٹ (NET / SET) ایسے پوسٹ گریجویٹس جو ڈگری کالج اور یونیورسٹی سطح پر درس و تدریس سے دلچسپی رکھتے ہوں ان کے لیے یو.جی.سی (یونیورسٹی گرانٹس کمیشن)، نیشنل ٹیسٹنگ ایجنسی (این ٹی اے) کے توسط سے سال میں دو مرتبہ نیشنل ایلیجبلیٹی ٹیسٹ کا انعقاد کرتا ہے۔ یہ امتحان دو ملٹی پل چوائس سوالیہ پرچوں پر مشتمل ہوتا ہے جس میں پہلا پرچہ تدریسی اہلیت کی جانچ جبکہ دوسرا پرچہ امیدوار کے ذریعے منتخبہ مضمون سے متعلق ہوتا ہے۔ دسمبر 2018 سے یہ امتحان مکمل طور پر آن لائن ہوگا۔ ریاستی سطح پر منعقدہ اس امتحان کو اسٹیٹ **ایلیجبلیٹی ٹیسٹ** کہا جاتا ہے جسے ریاستی یونیورسٹی منعقد کرتی ہے۔ ریاست مہاراشٹر میں سیٹ کے امتحان کا انعقاد ساوتری بائی پھلے، پونے یونیورسٹی کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ نیٹ کا امتحان عموماً جون اور دسمبر کے مہینے میں جبکہ سیٹ کا امتحان اگست اور فروری کے مہینے میں ہوتا ہے۔ امیدوار کے لیے اس امتحان میں شرکت کے لیے کسی بھی مضمون سے پوسٹ گریجویشن 55 فیصد مارکس سے کامیاب ہونا لازمی ہے دیگر پسماندہ طبقات کے لیے 5 فیصد مارکس کی رعایت ہے۔ مضامین، طریقہ کار، فارم بھرنے کا نوٹیفکیشن اور دیگر تمام تفصیلات کے لیے خواہشمند امیدوار www.ntanet.nic.in یا www.ugc.ac.in سے استفادہ کرسکتے ہیں۔

تمام مقابله جاتی امتحانات سے متعلق چند مشترکه یاد رکھنے کی باتیں: وہ طلبہ جو مقابلہ جاتی امتحانات میں شرکت کے تئیں سنجیدہ ہیں انھیں ان امتحانات کے تعلق سے چند باتیں ہمیشہ ذہن نشین رکھنا ہوں گی:

* ان امتحانات کے فارم آن لائن بھرے جاتے ہیں اور فیس کی ادائیگی بھی آن لائن ہی کی جاتی ہے۔
* ان امتحانات کا نصاب کم و بیش ایک جیسا ہوتا ہے۔ جیسے انگریزی زباندانی کی جانچ، منطقی جانچ (Aptitude Test)، فطرت اہلیت (Reasoning)، جنرل نالج اور حالات حاضرہ (Current Affairs) کی جانکاری، کمپیوٹر کی جانکاری وغیرہ۔
* ان میں سے کچھ امتحانات میں منفی مارکنگ بھی ہوتی ہے جس کا دھیان رکھنا ضروری ہے۔
* امتحانات کے نوٹیفکیشن کے لیے اخبارات پر نظر رکھیں اور متعلقہ ویب سائٹ پر باقاعدہ وزٹ کرتے رہیں۔
* اپنے مضامین کے علاوہ طلبہ جنرل نالج کی کتابوں اور روزانہ اخبار، میگزین کا مطالعہ کریں تو یہ مرحلہ آسانی سے طے کیا جاسکتا ہے۔ انٹرویو کے لیے حالات حاضرہ کی جانکاری بہت ضروری ہے اس کے لیے روزانہ باقاعدگی سے اخبارات کا مطالعہ کیجیے اور ملک میں وقوع پذیر ہونے والے حالات و واقعات کا تجزیاتی مطالعہ کیجیے۔
* گذشتہ برسوں کے پرچے ویب سائٹ پر دستیاب ہیں ان سے استفادہ کیا جاسکتا ہے اور بازار میں ان تمام امتحانات سے متعلق کتابیں بھی دستیاب ہیں۔
* کمپیوٹر کی اچھی جانکاری حاصل کریں کیونکہ اب ہر شعبہ میں کمپیوٹر کا استعمال ناگزیر ہوگیا ہے اور کچھ امتحانات بھی اب آن لائن ہوتے ہیں۔ آنے والے وقت میں اس بات کا قوی امکان ہے کہ تمام مسابقتی امتحانات کو مکمل آن لائن کردیا جائے۔

حکومتی شعبوں میں ہماری نمائندگی کی کمی کی ایک اہم وجہ مقابلہ جاتی امتحانات میں ہمارے طلبہ کی شرکت کی کمی ہے۔ ہمارے طلبہ میں صلاحیت یا اہلیت کا فقدان نہیں ہے بلکہ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ تعلیمی اداروں میں ابتدائی درجات سے ہی طلبہ کی ذہن سازی کی جائے اور انھیں درجاتی طور پر ان امتحانات میں شرکت کی ترغیب دی جائے۔ اسکولی سطح پر منعقد ہونے والے نیشنل ٹیلنٹ سرچ امتحان، نیشنل میرٹ کم مینس امتحان، آئی ٹی اولمپیاڈ، میتھمیٹکس اولمپیاڈ اور بین الجماعتی و بین المدارس مقابلوں میں شرکت اور انعقاد کے ذریعے انھیں مسابقتی امتحانات کے لیے تیار کیا جاسکتا ہے۔ خلوص نیت اور جہد مسلسل ہو تو یہ کام ناممکن تو بالکل نہیں!

■

Fahim Ahmed Momin
441 New Gauri Pada
Near Sahil Hotel, Bhiwandi - 421302
Distt: Thane (Maharashtra)

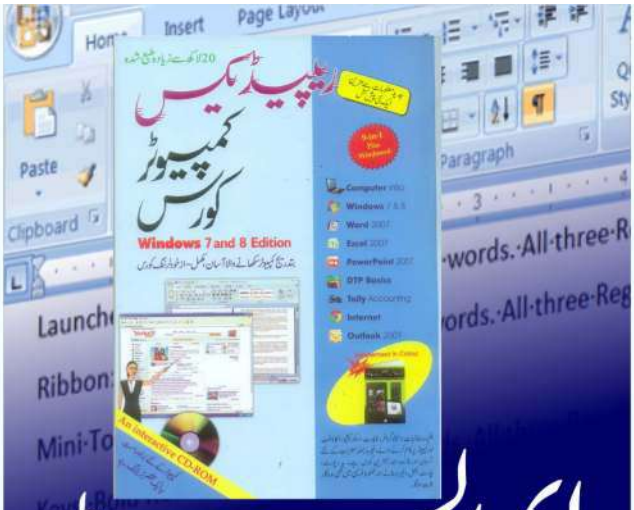

ایم ایس-ورڈ پر کام کرنا

پچھلے باب میں بتایا جاچکا ہے کہ ایم ایس۔ورڈ، ایم ایس-آفس کا ورڈ پروسیسنگ پروگرام یا پیکج ہے۔ یہ ونڈوز پر کام کرنے کے لیے تیار کیا گیا ہے۔اس کے کام کرنے کا طریقہ ونڈوز میں شامل ورڈ پروسیسر، ورڈ پیڈ (WordPad) سے بہت ملتا جلتا ہے، جس کے بارے میں آپ پچھلے حصہ (حصہ-2) میں پڑھ چکے ہیں۔لیکن ورڈ پیڈ میں دستیاب سہولیات بہت محدود ہیں، جبکہ اس میں بے شمار سہولیات دستیاب ہیں۔اگر آپ پہلے ورڈ پیڈ کا استعمال کر چکے ہیں، تو ایم ایس-ورڈ پر کام کرنا آپ کے لیے بہت آسان ہے۔ اگر آپ ونڈوز کے لیے بالکل ہی نئے ہیں، تو بھی اس کو سیکھنا اور اس پر کام کرنا مشکل نہیں ہے۔

ورڈ پروسیسر کا جدید ترین سب سے زیادہ مستعمل ورژن ایم ایس-ورڈ 2007 کے نام سے پایا جاتا ہے۔ ہم اس باب میں ایم ایس-ورڈ 2007 کو ہی بنیاد مان کر بات کریں گے اور اسے ایم ایس-ورڈ کہیں گے۔

ایم ایس- ورڈ شروع کرنا (Starting MS-Word)

ایم ایس- ورڈ کو آپ اسٹارٹ مینو کے 'All Programs' سے شروع کر سکتے ہیں، جس کا طریقہ پچھلے باب میں بتایا جاچکا ہے۔اگر آپ کے ڈیسک ٹاپ، کسی مینو یا فولڈر میں ایم ایس-ورڈ کا شارٹ کٹ ہے، تو اس کو ڈبل کلک کر کے بھی ایم ایس-ورڈ کو شروع کیا جاسکتا ہے۔ ورڈ شروع کرتے ہی آپ کی اسکرین پر تصویر WD-2.1 کی طرح ایم ایس-ورڈ کی بنیادی ونڈو نظر آئے گی، جس میں ایک خالی دستاویز دکھائی جاتی ہے۔اگر آپ کسی ورڈ ڈاکیومنٹ فائل کے آئیکان کو ڈبل کلک کر کے ورڈ کو شروع کرتے ہیں، تو پروگرام شروع ہو جانے کے بعد وہی دستاویز ورڈ کی ونڈو میں کھولی جاتی ہے۔

تصویر WD-2.1 میں ایم ایس-ورڈ کی بنیادی ونڈو کے تقریباً سبھی حصے اور ربن و ٹیب دکھائے گئے ہیں۔ان حصوں کا تعارف درج ذیل ہے:

ٹائٹل بار (Title Bar): کسی بھی عام ونڈو کی طرح اس میں بھی پروگرام کا نام اور اگر کوئی ڈاکیومنٹ کھلا ہو، تو اس کا نام دکھایا جاتا ہے۔اگر اس دستاویز کا کوئی نام نہیں رکھا گیا ہے، تو اس کا نام Document1، Document2......وغیرہ رکھ لیا جاتا ہے۔

آفس بٹن (Office Button): ایم ایس-ورڈ کے نئے ورژن میں پرانے ورژن کے فائل مینو (File Menu) کی جگہ پر آفس بٹن دیا گیا ہے۔اس پر کلک کرنے پر ایک مینو

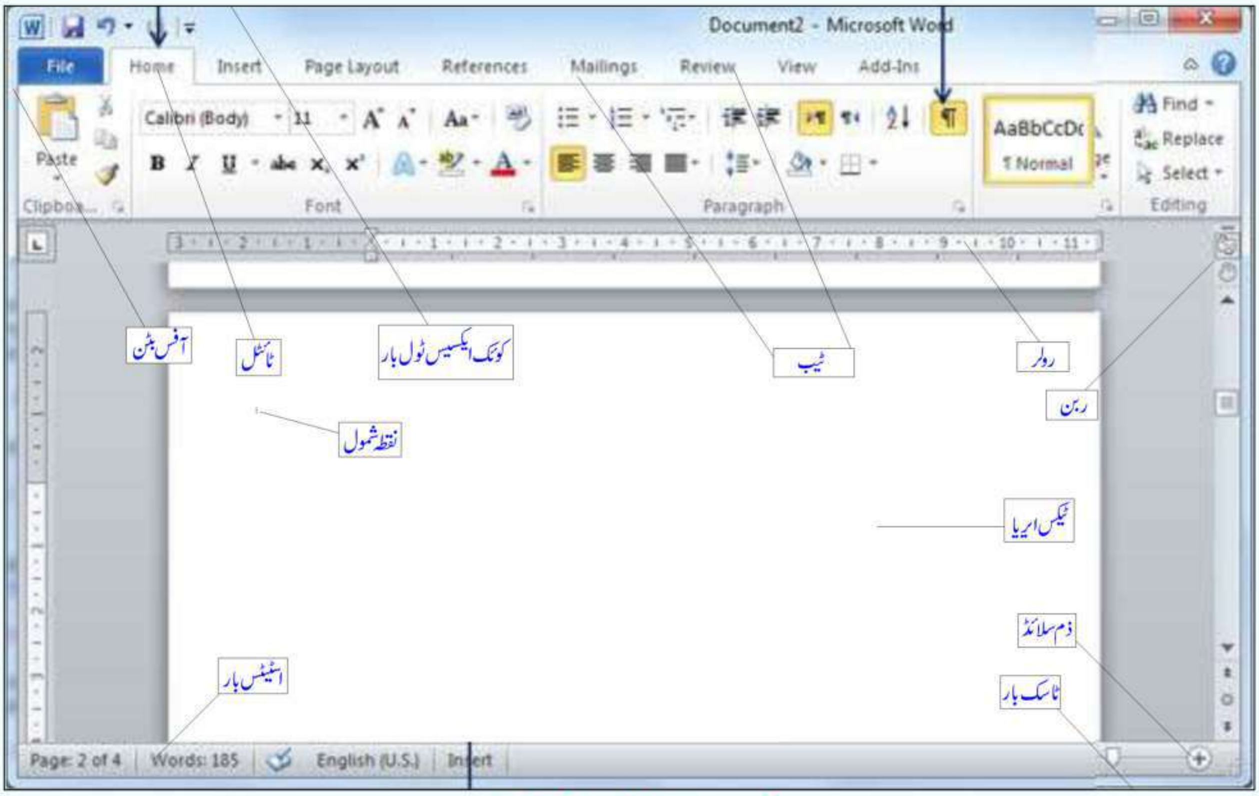

تصویر WD-2.1: ایم ایس-ورڈ کی بنیادی ونڈو

کھلتا ہے، جو دو عمومی حصوں میں تقسیم ہوتا ہے۔ مینو کے بائیں حصہ میں اہم کمانڈ، جیسے Open, New, Close, Publish, Send, Prepare, Print, Save As, Save دیے گئے ہیں۔ دائیں حصہ میں ان دستاویزوں کی فہرست دی جاتی ہے، جن پر آپ نے حال ہی میں کام کیا ہے۔ انھیں Recent Documents کہا جاتا ہے۔

آپ دیکھیں گے کہ بائیں حصہ میں کچھ کمانڈوں کے دائیں جانب نیلا مثلث ہے، جس کا مطلب ہے کہ آپشنز سے ایک دیگر مینو (Sub-Menu) جڑا ہوا ہے۔ جب بھی ماؤس پوائنٹر ایسے آپشن پر آتا ہے، تو اس کا Sub-Menu ایکٹو ہو جاتا ہے اور دائیں جانب Recent Documents کی فہرست کی جگہ پر نظر آتا ہے۔

کوئك ایکسیس ٹول بار (Quick Access Toolbar): اسکرین کے اوپری بائیں کونے میں کوئک ایکسیس ٹول بار ہوتا ہے، جس میں وہ کمانڈ ہوتی ہے، جنھیں ہم بار بار استعمال میں لاتے ہیں، جیسے Redo, Undo, Save وغیرہ۔ جیسا کہ اس ٹول بار کا نام ہے، یہ کمانڈ صرف ایک بار کلک کرنے سے ہی ایکٹو ہو جاتی ہیں۔ آپ اس ٹول بار میں Customize Quick Access Toolbar بٹن کے ذریعے اپنی خواہش کے مطابق کمانڈ جوڑ سکتے ہیں۔

ربن (Ribbon): ایم ایس-ورڈ 2007 میں ورڈ کے پرانے ورژنوں کے مینو اور ٹول بار کی جگہ پر ربن دیا گیا ہے، جس کا بنیادی مقصد کسی بھی کمانڈ کو آسانی سے اور کم ماؤس کلک کے ذریعے ایکٹو کرنا ہے۔ ربن کو کل سات ٹیب میں بانٹا گیا ہے، جس میں ہر ایک ٹیب ایک خاص آپشن کو ظاہر کرتا ہے۔ سبھی اہم کمانڈ ایک ہی ٹیب کے تحت مل جانے کے سبب، ورڈ کے پرانے ورژنوں کی طرح مینو اور سب-مینو تلاش کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔

ربن کے اہم حصوں (ٹیب) کے بارے میں ذیل میں بتایا جا رہا ہے:

- **ہوم ٹیب** (Home Tab): ہوم ٹیب میں پانچ آپشنز ہیں: Style, Paragraph, Font, Clipboard اور Editing۔ ان کے تحت دی گئی کمانڈوں کی مدد سے آپ ٹیکسٹ اپنی خواہش کے مطابق ایڈٹ اور فارمیٹ کر سکتے ہیں۔
- **انسرٹ ٹیب** (Insert Tab): انسرٹ ٹیب ٹیکسٹ میں ٹیبل، تصویر، لنک، خاص نشان وغیرہ جوڑنے کے لیے بنایا گیا ہے۔ اس کے سات حصے ہیں: Text, Header & Footer, Links, Illustrations, Tables, Pages اور Symbols۔
- **پیج لے آؤٹ** (Page Layout Tab): پیج لے آؤٹ ٹیب میں پانچ اہم آپشنز ہیں: Page, Page Setup, Themes, Paragraph, Background اور Arrange۔ اس ٹیب کی مدد سے آپ اپنی دستاویز کا نقشہ سیٹ کر سکتے ہیں۔ آپ اپنی خواہش کے مطابق حاشیے (Margins)، دستاویز کا سائز (Size)، کالم (Column)، بارڈر، انڈینٹ، پیراگرافوں کے درمیان کی دوری وغیرہ چن سکتے ہیں۔
- **ریفرینس ٹیب** (References Tab): کبھی کبھی آپ کی دستاویز میں مختلف قسم کے خاص تبصرے جوڑنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ جیسے موضوعات کی فہرست، فٹ نوٹ، اینڈ نوٹ، ذیلی سرخی، حوالہ وغیرہ۔ اس ٹیب کی مدد سے آپ یہ کام آسانی سے کر سکتے ہیں۔ Table, Index, Captions, Citations & Bibliography, Footnotes, of Contents اور Table of Authorities اس ٹیب میں اہم حصے ہیں۔
- **میلنگس ٹیب** (Mailings Tab): اس ٹیب میں وہ کمانڈز ہیں، جو ای-میل، لیٹر، یا ویب پیغام کے ذریعے تقسیم کی جانے والی دستاویز بنانے میں استعمال کی جاتی ہیں۔ اس کے بنیادی حصے ہیں: Write and Insert, Start Mail Merge, Create, Preview Result, Fields اور Finish۔
- **ریویوبٹن** (Review Button): دستاویز میں اسپیلنگ چیک کرنے اور دیگر اصلاح سے متعلق سبھی کمانڈ اس ٹیب میں دیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ ریویو ٹیب میں دی گئی کمانڈوں کی مدد سے آپ دیگر صارفین کے ذریعے اپنی دستاویز میں اصلاح کرنے کے عمل پر روک لگا سکتے ہیں۔
- **ویو ٹیب** (View Tab): اس ٹیب میں وہ سبھی کمانڈ ہیں، جن کے ذریعے آپ اپنی ونڈو یا دستاویز کی شکل وصورت بدل سکتے ہیں۔ اس کے اہم حصے ہیں: Window, Zoom, Show/Hide, Document Views اور Macros۔
- **دیگر ٹیب**: ان سبھی اہم ٹیبوں کے علاوہ کچھ دیگر ٹیب بھی ہوتے ہیں، جو صرف ضرورت پڑنے پر نظر آتے ہیں۔

1. **ڈیولپر ٹیب** (Developer Tab): ڈیولپر ٹیب زیادہ استعمال میں نہ آنے کے سبب ربن میں دکھائی نہیں دیتا ہے۔ یہ ٹیب ان صارفین کے لیے ہے، جو ورڈ کے لیے فارم اور ایپلی کیشن بناتے ہیں۔ اسے ایکٹو کرنے کے لیے آفس مینو میں Word Options کلک کریں اور Popular کے تحت Show Developer tab in the Ribbon کے باکس میں کلک کریں۔ OK کلک کریں اور آپ دیکھیں گے کہ ڈیولپر ٹیب آپ کے ربن میں آ گیا ہے۔

2. **کار آمد ٹیب**: ان کے علاوہ ربن خود ہی آپ کے کام کے مطابق ٹیب اور سب ٹیب جوڑتا رہتا ہے۔ مثال کے طور پر، جب آپ ورڈ میں تصویر جوڑتے ہیں، تو ایک نیا فارمیٹ ٹیب (Format Tab) پکچر ٹولس (Picture Tools) کے عنوان کے ساتھ آپ کے ربن میں نمودار ہو جاتا ہے۔ اس کی مدد سے آپ تصویر میں کاٹ چھانٹ (ایڈٹ) کر سکتے ہیں۔

رولر (Rulers): یہ دو ہوتے ہیں۔ افقی (Horizontal) اور عمودی (Vertical)۔ ان کا استعمال حاشیے دیکھنے اور مختلف حاشیوں کو تیزی سے سیٹ کرنے میں کیا جاتا ہے۔ ان کی مدد سے آپ ایک یا زیادہ پیراگرافوں کی ہیئت بدل سکتے ہیں۔ 'View' ٹیب میں 'Ruler' کمانڈ سے انھیں دکھایا اور چھپایا جا سکتا ہے۔

ٹیکسٹ ایریا (Text Area): رولر کے ٹھیک نیچے ایم ایس-ورڈ ونڈو کا بنیادی علاقہ ہوتا ہے، جسے ٹیکسٹ ایریا اور مواد کا علاقہ بھی کہتے ہیں۔ آپ کے ذریعے ٹائپ کیا گیا ٹیکسٹ اور دیگر مواد اس علاقہ میں دکھایا جاتا ہے۔ کسی بھی وقت اس میں مواد کا ایک حصہ ہی نظر آتا ہے، لیکن اسکرول بار کی مدد سے آپ اوپر نیچے یا دائیں بائیں کے حصوں کو بھی دیکھ سکتے ہیں۔

ماؤس پوائنٹر (Mouse Pointer): ٹیکسٹ ایریا میں ماؤس پوائنٹر پتلی اور بڑی آئی (I) کے سائز کا ہوتا ہے۔ آپ اسے اسکرین پر کہیں بھی لے جا سکتے ہیں۔ ٹیکسٹ ایریا کے علاوہ ونڈو کے دوسرے حصوں میں جانے پر ماؤس پوائنٹر اپنی شکل بدلتا رہتا ہے۔

نقطۂ شمول (Insertion Point): یہ ٹیکسٹ ایریا کا کرسر (Cursor) ہوتا ہے، جو ایک کھڑی لکیر (|) کی شکل میں ہوتا ہے۔ کی بورڈ پر آپ جو کچھ بھی ٹائپ کرتے ہیں یا کوئی مواد ڈالتے ہیں، تو وہ ٹیکسٹ یا مواد نقطۂ شمول سے شروع کر کے ہی ٹیکسٹ ایریا میں لگایا جاتا ہے۔ یہ کرسر ماؤس پوائنٹر سے الگ ہوتا ہے۔ آپ ماؤس پوائنٹر کو ٹیکسٹ ایریا میں کسی جگہ پر کلک کر کے نقطۂ شمول کو وہاں پہنچا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ تیر کے نشانات والے بٹنوں کا استعمال کر کے بھی آپ نقطۂ شمول کو اوپر نیچے یا دائیں بائیں کہیں بھی لے جا سکتے ہیں۔

اسٹیٹس ایریا (Status Area): یہ ٹیکسٹ ایریا کے ٹھیک نیچے ہوتا ہے۔ اس میں ہماری دستاویز کے بارے میں کئی اضافی اطلاعات دی جاتی ہیں، جیسے صفحہ نمبر، کل الفاظ، زبان، زوم سلائڈر وغیرہ۔ یہ حصہ عام طور پر ہر وقت اسکرین پر رہتا ہے، اگر آپ نے 'Full Screen' کا آپشن چنا نہ ہو۔

نئی دستاویز کھولنا (Opening a New Document)

کوئی دستاویز تیار کرنے کے لیے سب سے پہلے اسے کھولنا پڑتا ہے۔ عام طور پر ورڈ شروع کرنے پر ایک نئی خالی دستاویز کھولی جاتی ہے۔ اگر آپ کسی دوسری دستاویز پر کام کر رہے ہیں اور ایک بالکل نئی دستاویز بنانا چاہتے ہیں، تو آفس بٹن کلک کریں۔ آفس مینو میں New بٹن کلک کریں۔ ایسا کرتے ہی آپ کی اسکرین پر تصویر WD-2.2 کی طرح 'New' کا ڈائیلاگ باکس دکھائی دے گا۔ عام دستاویز بنانے کے لیے آپ کو 'Blank Document' آپشن کو چن کر 'Create' بٹن کلک کرنا چاہیے۔ ایسا کرتے ہی

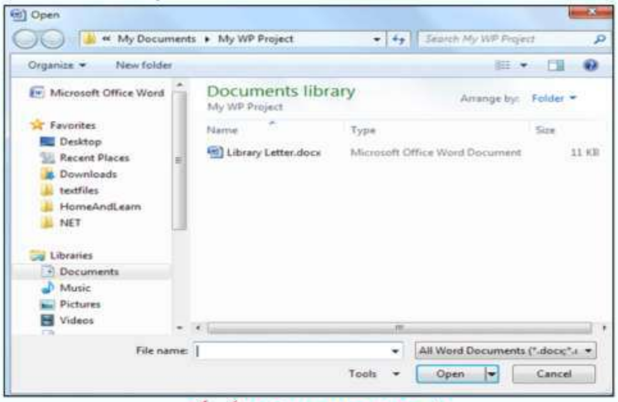

تصویر WD-2.2 New کا ڈائیلاگ باکس

آپ کو اپنی ونڈو کے ٹیکسٹ ایریا (یا مواد کے علاقہ) میں ایک خالی دستاویز تصویر WD-2.1 کی طرح ملے گی، جس میں آپ خواہش کے مطابق ٹیکسٹ اور مواد تیار کر سکتے ہیں یا لگا سکتے ہیں۔

پرانی دستاویز کھولنا (Opening an Existing Document)

اگر آپ پہلے سے بنی ہوئی کسی دستاویز کو کھولنا اور اس میں اصلاح کرنا چاہتے ہیں، تو آفس مینو کو ایکٹو کیجیے۔ اس میں دائیں جانب ان دستاویز فائلوں کے نام دیے گئے ہوں گے، جو آپ نے آخری بار تیار کی تھیں یا کھولی تھیں۔ اگر آپ ان میں سے ہی کسی کو

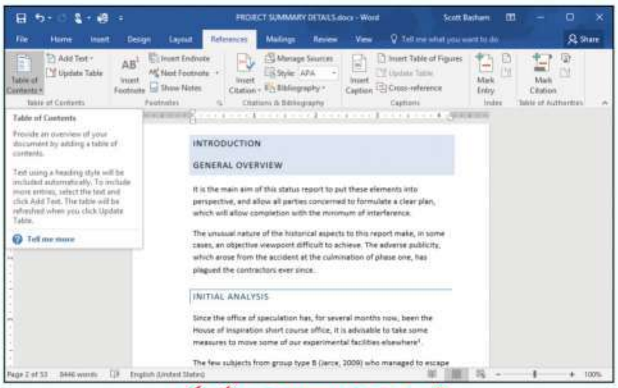

تصویر WD-2.3 Open کا ڈائیلاگ باکس

کھولنا چاہتے ہیں، تو ماؤس پوائنٹر کے ذریعے اسے کلک کیجیے۔ اس سے اس دستاویز (یا فائل) کو ایم ایس-ورڈ کے ذریعے کھول کر لوڈ کر دیا جائے گا۔

اگر آپ زیادہ پرانی دستاویز فائل میں اصلاح کرنا چاہتے ہیں، تو آفس مینو کا 'Open' کمانڈ دیجیے۔ اس سے آپ کو تصویر WD-2.3 کی طرح Open کا ڈائیلاگ باکس دیں۔

اس ڈائیلاگ باکس میں سب سے اوپر دیے گئے لسٹ باکس میں اس فولڈر کا نام دیا جاتا ہے، جس میں دستاویز ہونے کا امکان ہے۔ عام طور پر ایم ایس-آفس کے ذریعے سبھی دستاویزوں کے لیے 'Documents' فولڈر کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اگر آپ کا فولڈر کوئی دوسرا ہے، تو اس کا نام اس لسٹ باکس میں بھر سکتے ہیں یا اس ڈراپ ڈاؤن لسٹ باکس کو کھول کر اس میں سے چن سکتے ہیں۔ اگر آپ بھول گئے ہیں کہ آپ نے دستاویز کہاں محفوظ کی ہے، تو آپ Search باکس میں فائل کا نام ٹائپ کر کے Enter کنجی دبا سکتے ہیں۔ درمیان کی خالی جگہ میں اس فولڈر میں شامل سبھی ورڈ دستاویزوں کے نام دکھائے جاتے ہیں۔ آپ ان میں سے کسی کو بھی کلک کر کے چن سکتے ہیں اور 'Open' بٹن کو کلک کر کے اسے کھول سکتے ہیں۔

ٹیکسٹ ٹائپ کرنا (Typing Text)

دستاویز کھل جانے کے بعد آپ مواد ٹائپ کرنا شروع کر سکتے ہیں۔ آپ جو بھی ٹائپ کرتے ہیں، وہ نقطہ شمول (کرسر) کی جگہ پر جڑ جاتا ہے۔ ورڈ میں ایک لائن بھر جانے پر اپنے آپ ہی دوسری لائن شروع ہو جاتی ہے۔ انٹر (Enter) کنجی کو صرف پیراگراف پورا ہو جانے پر یا کوئی لائن خالی چھوڑنے کے لیے دبانا چاہیے۔

ٹائپنگ میں ہونے والی غلطیوں کو یا تو اسی وقت بیک اسپیس (Backspace) کنجی کے ذریعے یا تیر کے بٹنوں کے ذریعے صحیح جگہ پر کرسر لے جا کر Delete کنجی کے ذریعے ٹھیک کیا جا سکتا ہے۔ یاد رکھیں Backspace کنجی کے ذریعے نقطہ شمول کے بائیں جانب سے پہلا حرف مٹ جاتا ہے جبکہ Delete کنجی کے ذریعے نقطہ شمول کے دائیں جانب سے پہلا حرف مٹ جاتا ہے۔

مشق کے لیے، ایم ایس-ورڈ شروع کر کے اس میں خالی دستاویز میں درج ذیل ٹیکسٹ ٹائپ کیجیے۔

Health is Wealth

There is nothing so important for a man as health. There is no joy and no job for an unhealthy man. Nobody likes a sick or a weak person. If we take proper care of our health, we shall always be cheerful.

A healthy man can work hard and enjoy life. So health is our real wealth.

Cleanliness is the first, rule of health. We should always get up early in the morning. We should brush our teeth and take bath. We should use soap to clear our body. Cold bath is a tonic. After bath a clean towel should be used to rub and dry up the body. We should wear clean clothes after bath.

Eyes are very important organs in the human body. We cannot see without eyes. We should wash them with fresh water daily.

It is rightly said, "A sound mind resides in a sound body." If we wish to live a happy life, we must be strong and healthy.

اس ٹیکسٹ کو ٹائپ کرتے وقت کئی غلطیاں ہوں گی۔ انھیں آپ فوراً ٹھیک کر لیں یا بعد میں وہاں کرسر لے جا کر ٹھیک کر دیں۔ اس وقت آپ کی دستاویز تصویر WD-2.4 کی طرح دکھائی دے گی۔

■

بہ شکریہ: ریپڈیکس کمپیوٹر کورس (ونڈوز 7 اور 8 / آفس 2007)، سنہ اشاعت: 2015، ناشر: یونی کورن بکس F-2/16، انصاری روڈ، دریا گنج، نئی دہلی 2
فون نمبر: 011-23275434,23262683

تبصرہ و تعارف

پیکر فکروعمل :سید حامد

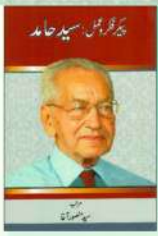

مرتب: سید منصور آغا

صفحات: 454، قیمت: 210 روپے، سنہ اشاعت: 2018

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: پروفیسر صغیرافراہیم، گل افراہیم، گلی نمبر 4-A، نزد سنی پی سی ہو بائی پاس روڈ، دُھرّا، علی گڑھ (یوپی)

سید منصور آغا کا شمار ملک کے ممتاز صحافیوں میں ہوتا ہے۔ آپ تقریباً نصف صدی سے ادب اور صحافت کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ امسال (2018) آپ نے کثیر الجہت شخصیت کے مالک سید حامد پر ایک ضخیم کتاب 'پیکر فکروعمل: سید حامد' کے عنوان سے مرتب کی ہے جسے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی نے نہایت اہتمام سے شائع کیا ہے۔ اہم مضامین اور نادر تصاویر سے مزین 454 صفحات کی اس کتاب کے لیے کونسل کے تمام اراکین خصوصاً ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم قابل مبارک باد ہیں۔

سید منصور آغا نے تمہیدی کلمات میں اعتراف کیا ہے کہ اُن کی موصوف سے ملاقات 1982 میں ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب بقول سید حامد

ایک دو زخم نہیں جسم ہے سارا چھلنی
درد بے چارہ پریشاں ہے کہاں سے اُٹھے

افراتفری کے ماحول میں کیمپس کی نگہبانی اور ملک وملت کے تئیں جوابدہی کا معاملہ اہم تھا لیکن عاشقِ سید والا گُہر نے اِسے خوبی سے نبھایا۔ آغا صاحب نے مذکورہ کتاب میں شامل مضامین کو چھ حصوں میں منقسم کیا ہے۔ پہلا باب سید حامد کے نظریۂ تعلیم سے متعلق ہے۔ اس حصہ میں اٹھارہ مضامین ہیں جن میں سے گیارہ مضامین خود سید حامد کے ہیں۔

دوسرے باب کا عنوان ہے 'سید حامد اپنی تحریروں کے آئینے میں'۔ تیسرا باب 'خطبۂ بھوپال' پر مبنی ہے۔ چوتھے اہم باب میں ملک کے نامور ادیبوں کے 39 گراں قدر مضامین شامل ہیں جن میں موصوف کی فکری اور فنی صلاحیتوں کے حوالوں سے بحث کی گئی ہے۔ پانچویں باب میں سید حامد صاحب کی جدت اور نُدرت کو اُجاگر کرنے کے لیے چھ مضامین کتاب کی اہمیت کے ضامن ہیں۔ ساتواں مضمون خود سید حامد کا ہے جو تعلیمی کارواں کی تاریخی خدمات جاننے کے لیے سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ آخری حصے میں مختلف تصاویر کا انتخاب اس طرح کیا گیا ہے کہ سید حامد تصویروں کے نگارخانے میں اپنے عہد سے ہم کلام محسوس ہوتے ہیں۔

سید منصور آغا کی مرتب کی ہوئی اس کتاب سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف ایک عملی انسان ہیں۔ دورانِ ملازمت وہ ایک مثالی افسر نظر آتے ہیں۔ تعلیمی اور تعمیری سرگرمیوں میں برابر حصہ لیتے رہتے ہیں خصوصاً نئی نسل کے روشن مستقبل کے لیے ہر ممکن جتن کرتے ہوئے نیز اُنھیں دین ودنیا کے آداب سکھاتے ہوئے۔ سرکاری ملازمت سے سبک دوشی کے بعد انھوں نے اپنی بقیہ زندگی ملت کی خدمت اور نگہبانی کے لیے وقف کردی۔ اُن کے فلاحی کاموں اور گراں قدر کارناموں کی فہرست طویل ہے جسے اِس کتاب کے توسط سے بآسانی پڑھا، اور سمجھا جاسکتا ہے۔ سید حامد نے بنیادی پرائمری تعلیم سے لے کر اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے طلبہ کو سہولتیں مہیا کرائیں۔ مقابلہ جاتی امتحانات میں شرکت کے فوائد بتاتے ہوئے طلبہ اور طالبات کو ترغیب دلائی۔ گھر گھر دستک دے کر حصولِ علم کی یاد دہانی کرائی۔ خوبیِ قسمت کہ اُنھیں رفقا بھی ایسے ملے جنھوں نے اُن کے علمی اور عملی کاموں کی تشہیر کرتے ہوئے ہر ممکن مدد کی۔ یہ کتاب اِس طرح 'پیکر علم وعمل' سید حامد کا مکمل تعارف پیش کرتی ہے۔

ایک بار پھر میں کتاب کے مرتب سید منصور آغا کو مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ 'پیکر فکروعمل' کی گوناگوں صفات اور بے مثل کمالات کو بخوبی یکجا کردیا ہے۔ سید حامد کی فعال زندگی اور قابلِ قدر کارنامے ہم سب کے لیے روشن مثال ہیں جن کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے نئی نسل اپنے مستقبل کو روشن کرسکتی ہے اور معاشرہ میں باعزت مقام بھی حاصل کرسکتی ہے۔

یہ مہینے اور موسم /یہ جسم و جاں/ یہ بدن کے حصے

شاعر: انصار احمد معروفی

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

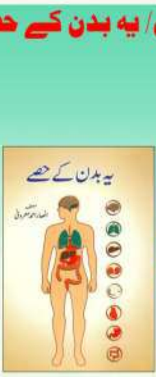

انصار احمد معروفی تعمیری اور اصلاحی فکر کے شاعر ہیں۔ آپ کے فکر وخیال میں تازگی و شگفتگی پائی جاتی ہے، اور طرز بیان صاف ستھرا اور واضح ہے۔ انھوں نے منظوم شکل میں جو کچھ بھی لکھا ہے اس میں خود اعتمادی پائی جاتی ہے اور ان کی شاعری میں گہرائی کے ساتھ ساتھ گیرائی بھی موجود ہے۔ ان میں محنت، لگن، تڑپ اور دیانت داری کے ساتھ بچوں میں سائنسی شعور پیدا کرنے کی چاہ موجود ہے۔ انصار احمد معروفی نے بچوں کی معلومات

میں اضافہ کے لیے کرۂ عرض کے اسرار و رموز اور صحت عامہ سے متعلق کئی مجموعے شائع کیے ہیں۔ ان مجموعے میں انہوں نے بچوں اور عوام کے لیے معلومات اور حکمت و دانائی کی باتوں کو یکجا کر دیا ہے۔ 'یہ مہینے اور موسم' بھی انہی مجموعوں میں سے ایک ہے، جو سائنسی نظموں پر مشتمل ہے۔ اس مجموعے میں ایک سال میں آنے والے مہینے، موسم، رات دن اور سائنسی کرامات پر مشتمل نظمیں ملتی ہیں۔ مجموعے کی ابتدا نعت رسول سے کی ہے۔ اس کے بعد مہینوں کا ذکر کرتے ہیں، اور ہر مہینے کی جامع خصوصیات بیان کرتے ہیں۔ شاعر دسمبر کے مہینے کا ذکر اس طرح کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو

جب دسمبر جناب آتا ہے — گرم کپڑے بھی ساتھ لاتا ہے
ایک درجن مہینے ہوتے ہیں — لیکن آخر میں ہی یہ آتا ہے
دن میں چادر میں ڈھانپ لیتا ہے — رات کو یہ لحاف اڑھاتا ہے

اسی طرح جب موسموں پر نظمیں کہتے ہیں تو ہر طرح کی موسموں کی خوبیوں کو بیان کرتے ہیں۔ ان نظموں کو پڑھنے سے معلومات کے ساتھ دلچسپی بھی پیدا ہوتی ہے۔ موسم پر ایک نظم کا حصہ ملاحظہ ہو

جاڑے میں جلدی کپڑے نہیں سوکھتے ہیں کیوں — کپڑے کے انتظار میں ہم جھوجھتے ہیں کیوں
گرمی میں جب کہ جلد بہت سوکھتا ہے وہ — جاڑے میں سوکھنے کو مگر سوچتا ہے وہ

مذکورہ مجموعہ کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انصار احمد معروفی نے خاص طور سے بچوں کو ذہن میں رکھ کر نظمیں کہیں ہیں۔ نظمیں بہت سہل زبان میں ہیں اور معلوماتی بھی ہیں۔ امید کہ یہ مجموعہ بچوں کے علم میں اضافہ کا باعث ہوگا۔

84 صفحات پر مشتمل اس کتاب کی 25 روپے کی ہے۔

○

'یہ جسم و جاں' میں شاعر نے اپنے تجربات اور تحقیقات کی روشنی میں جسم کے ہر عضو کو باریک بینی سے جانچ پرکھ کر وسیع مشاہدے کی بنیاد پر اعضا کی صفات، اس کے افعال اور اہمیت و افادیت کو واضح کیا ہے۔ شاعر نے جسم کے اندرونی اعضا، پھیپھڑے، دل، غذا کی نالی، معدہ، آنت و لبلبہ اور دماغ وغیرہ کی فعالیت پر آسان منظوم انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ مجموعہ کی ابتدا نعت پاک سے کی ہے۔ اس کے بعد جسم کے اہم اعضا پر نظمیں تحریر کی ہیں۔ زبان کے سلسلے میں لکھتے ہیں

نہ منھ میں گر زباں ہوتی تو کیسے گفتگو کرتے؟
دلوں کی بات کیا کرتے؟ فقط ہم آرزو کرتے
سنا پاتے نہ سن پاتے خوشی اور غم کی کچھ باتیں
زباں دے کر خدا نے نعمتوں کی بخشی سوغاتیں

آنکھوں کی اہمیت بتاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ آنکھیں قدرت کا انمول تحفہ ہیں۔ آنکھوں کے بغیر دنیا بے رونق ہے۔ شاعر نے اس نعمت کی ترجمانی کچھ اس انداز میں کی ہے

نظر جو اٹھی تو دعا بن گئی — نظر جو جھکی تو حیا بن گئی
نظر کج ہوئی تو ادا بن گئی — نظر جب پھیلی تو قضا بن گئی

انصار احمد معروفی بچوں کو مکمل جسمانی اعضا سے واقف کرانا چاہتے ہیں۔ اسی لیے انھوں نے جسم کے باریک سے باریک اعضا کی اہمیت اور افادیت کو اجاگر کر کے بچوں کے اندر شعور جگانے کی کوشش کی ہے تاکہ بچے جسم کے ہر ایک اعضا کی اہمیت کو سمجھیں اور اس کی حفاظت کریں۔ شاعر نے بچوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے نظموں کو سلیس زبان میں لکھا ہے۔ مجموعی طور پر یہ مجموعہ بچوں کے لیے پند و نصیحت، زبان کی اصلاح اور فروغ کا ذریعہ ثابت ہوگی۔

52 صفحات پر مشمل اس کتاب کی قیمت 20 روپے ہے۔

○

'یہ بدن کے حصے' میں انھوں نے انسان کے ظاہری اعضائے بدن کے صفات و کمالات کو اردو محاوروں کے ساتھ ذکر کیا ہے، جن کا عام بول چال میں استعمال ہوتا ہے۔ شاعر نے اپنے اس مجموعے میں انسانی اعضا کو موضوع بنا کر نظمیں کہیں ہیں۔ مجموعے کا آغاز حمد اور نعت سے کیا ہے۔ اس کے بعد جسم کے اعضا کی تذکرہ کیا ہے۔ جو بہت ہی دلچسپ انداز میں اور معلوماتی ہے۔ درحقیقت ہم اپنی بے خبری کی وجہ سے جسمانی اعضا کی سرگرمیوں سے واقف نہیں ہو پاتے ہیں مگر جب ان نظموں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہماری آنکھ، ناک، کان، بال اور گردن غرض کہ جسم کے تمام اعضا کے صفات و کارکردگی سے ہمیں واقفیت ہوتی ہے۔ شاعر نے ہر نظم میں ایک پیغام دیا ہے اور غور و فکر کے کئی پہلو ظاہر کیے ہیں۔ ملاحظہ ہو

ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کے چلنے میں ہے مزہ — لیکن مصیبتوں میں چھڑانا نہ اپنا ہاتھ
ہاتھوں کی اب لکیر نہ دیکھو دکھاؤ تم — بس سامنے خدا کے کرو التجا کا ہاتھ

مذکورہ شعر میں ہاتھ کی خوبی کے ساتھ یہ نصیحت بھی ملتی ہے کہ بھائی چارگی اور اتفاق کے ساتھ رہنے ہی میں بھلائی ہے اور اس بات کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے کہ جب بھی مصیبت میں رہو اپنے مالک حقیقی سے ہی مانگو۔ اسی طرح قناعت اور صبر کی تلقین کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے، اس میں شاعر نے اردو محاوروں کا بھی استعمال کیا ہے۔ ملاحظہ ہو

منھ میں پانی لاؤ مت غیروں کی چیزیں دیکھ کر
مان لو انصار کی باتیں تو منھ میں گھی شکر

اس مجموعے میں سبق آموز باتوں کے ساتھ زبان کا لطف اور ندرت کا خیال بھی رکھا گیا ہے

تنخواہ روکنے کا یہ الٹا ہوا اثر — اک روز مارا مال پہ نوکر نے اپنا ہاتھ

انصار احمد معروفی کا انداز بیان واضح، سلیس، صاف اور دل کو چھو لینے والا ہے۔ وہ بہت ہی سہل انداز میں بدن کے حصے کی معلومات دے دیتے ہیں۔ انصار احمد کا اسلوب بیان نرالا ہے اور زبان بامحاورہ اور آسان و عام فہم ہے۔ مذکورہ مجموعے کو پڑھنے سے بچوں کے اندر جسم کے اعضا کے سلسلے میں معلومات ہوگی، وہیں منظوم انداز میں ان باتوں کو کہنے کا سلیقہ بھی آئے گا۔ مجموعی طور پر یہ مجموعہ بچوں کے لیے مفید ہے۔

56 صفحات پر مشمل اس کتاب کی قیمت 20 روپے ہے۔

مبصر: ڈاکٹر واثق الخیر
جوگا بائی ایکسٹینشن، جامعہ نگر، نئی دہلی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ادبیات، انسائیکلوپیڈیا لغات، تاریخ، تعلیم و تدریس، زبان و لسانیات، سائنس، تکنیک اور جغرافیہ، سیاست، صحافت، طب و معالجات، فلسفہ، فنون لطیفہ، قانون، کتب خانہ داری، معاشیات، تجارت، نفسیات، بچوں کا ادب اور دیگر موضوعات پر بڑی اہم کتابیں شائع کی ہیں۔ کونسل کی تمام مطبوعات درج ذیل پتہ پر حاصل کی جاسکتی ہیں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی – 110066
NCPUL, West Block -8, Wing No. 7, R.K. Puram, New Delhi 110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

تحقیق و تنقید

عوامی مرثیے کی روایت

نام مصنف: لئیق رضوی

صفحات: 183، قیمت: 250 روپے، سنہ اشاعت: 2018

ناشر: قلمکار، B-1448، کریلی، الہ آباد 16 (یوپی)

مبصر: شارب ردولوی، C-95، سیکٹر-ای، علی گنج، لکھنؤ (یوپی)

مرثیے کی تاریخ کو ادبی مورخین اشرف بیابانی کی 'نوسر ہار' سے شروع کرتے ہیں نوسر ہار 1501 کی تصنیف ہے لیکن یہ مرثیے کی ادبی روایت کی تاریخ سے وابستہ ہے۔ اس عظیم ملک میں ایک اور اہم روایت عوامی یا صوتی روایت (Vocal Tradition) رہی ہے جو بعض علاقوں میں آج بھی زندہ ہے۔ اگر توجہ دیں تو محسوس ہوگا کہ دراصل آج ہم جس شعری سرمائے پر فخر کرتے ہیں اس کی جڑیں کہیں نہ کہیں، عوامی شعری روایت میں پوشیدہ ہیں لیکن ارتقا اور تیز رفتار سماجی اور ادبی تبدیلیوں کے دور میں یہ روایتیں نظر انداز ہوتی گئیں اور کمزور پڑتی گئیں۔ اردو مرثیہ بھی انھیں اصناف شعر میں ہے جس میں عوامی روایت کو قطعی طور پر نظر انداز کر دیا گیا۔ مرثیے میں دکنی روایت کو بھی بہت اہمیت نہیں دی گئی جو ایک طرح نیم ادبی روایت تھی فارسی کے زیر اثر ڈھلی ہوئی صاف ستھری اردو معلی کی ذہنوں پر حکومت ہوگئی حالانکہ اگر اثر انگریزی کو دیکھا جائے تو عوامی روایت زیادہ اثر انگریز ملے گی۔ 'عوامی مرثیے کی روایت' اسی لیے بہت اہم ہے کہ یہ اردو مرثیے کی گم شدہ کڑی کی حیثیت رکھتی ہے جو اردو مرثیے کو اس کے سیاق وسباق سے جوڑتی ہے۔

اشرف بیابانی ہوں یا قلی قطب شاہ یہ کتنے ہی قدیم کیوں نہ ہوں لیکن یہ عوامی نہیں ادبی روایت کا حصہ ہیں یہ الگ بات ہے کہ زبان وادب اس وقت اپنے تشکیلی مراحل میں تھے لیکن ہمارے پاس ایک عوامی روایت جو دراصل مرثیے کی بنیادی روایت ہے، موجود تھی جسے اہمیت نہیں دی گئی۔ اس سلسلے میں کوئی تحقیقی کام کیا بھی نہیں گیا ڈاکٹر اظہر علی فاروقی نے کچھ مثالیں دیں ہیں لیکن ان کی حیثیت صرف حوالوں کی ہے۔ اردو نے کبھی بھی اپنا رشتہ ان بنیادی ماخذ سے جوڑا ہی نہیں اور اس کو صرف شہری اور مدنی زبان کی شکل میں لیا۔ یہی سبب ہے ہم مرثیے کی اس روایت سے جو کہ بہت توانا روایت تھی، غافل رہے یا توجہ نہیں دی۔ یہ ایک ایسی کڑی ہے جس کے بغیر واقعتاً مرثیے کے سفر کو سمجھنا مشکل کام ہے۔ لئیق رضوی نے 'عوامی مرثیے کی روایت' پر تحقیق کر کے ایک بڑا علمی کام انجام دیا ہے اس کتاب سے اندازہ ہوتا ہے کہ تہذیب تاریخ سے زیادہ توانا چیز ہے دہا، لاؤنی، زاری، آلہا، جو کچھ بھی ہے چاہے وہ مرثیے سے متعلق ہو اور چاہے ہماری دوسری شعری اور ادبی روایات سے تعلق رکھتا ہو۔ اس کی سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ ایک سیکولر روایت ہے جس کے درمیان مذہب نہیں آتا۔ دہے، یا زاری یا اسی طرح کی دوسری روایت ہمارے گاؤں سے تعلق رکھتی ہیں جنھیں عورتیں مل کر گاتی ہیں لیکن 'گاتی ہیں'' نہیں روتی ہیں کہنا چاہیے' اس لیے کہ ایک آلہا، کو چھوڑ کر دہے اور زاری کے لیے 'رونے' کا لفظ ہی استعمال ہوتا ہے چونکہ یہ ایک خاص انداز میں 'بین' کی شکل میں محرم میں پڑھے جاتے ہیں اور ان عورتوں میں زیادہ تعداد غیر مسلم عورتوں کی ہوتی ہے۔

میں صرف ایک واقعہ اپنا بتا دوں۔ ردولی ایک بہت بڑا قصبہ ہے جہاں محرم بہت بڑے پیمانے پر منایا جاتا ہے اور قصبے میں محرم میں گاؤں دیہات کی عورتیں، جس دن کوئی مخصوص علم اٹھتا تھا یا تعزیہ نکلتا تھا اس دن سر شام آکر اپنے بچوں کو گود میں لیے ان راستوں پر جدھر سے علم کو گزرنا ہوتا تھا دیوار کے کنارے کنارے بیٹھ جاتی تھیں۔ وہ ساری رات ان راستوں پر دیوار کے ساتھ لگی بیٹھی رہتی تھیں اور جہاں ان کو باجے کی آواز سنائی دیتی یا جیسے ہی رات کی تاریکی بڑھتی تو وہ دہے رونا شروع کر دیتیں۔ میں نے بے انتہا کوشش کی کہ ان کے پاس بیٹھ کر یا ان کے قریب جا کر میں سمجھ سکوں کہ ان کی زبان کیا ہے۔ یہ کس زبان میں دہے روتی ہیں اور کیا کہتی ہیں۔ لیکن بہت کوشش کرنے پر کبھی اصغر سمجھ میں آجاتا، کبھی قاسم کبھی حسینؑ اور حسنؑ۔ اس کے علاوہ کبھی کچھ نہیں سمجھ میں آیا کہ ان کی زبان کیا ہے، اور اس بات کی ہمیشہ خواہش رہی کہ کسی طرح ہمارا صوتی ادب Vocal Litirature ہے، جمع ہو سکے۔ میرے ایک دوست اور ہندی کے ترقی پسند افسانہ نگار دیوندر ستیارتھی نے مختلف صوبوں اور علاقوں میں پھر پھر کر ہندی کے عوامی گیت جمع کرنے کے کام میں اپنی ساری زندگی تج دی۔ جو کبھی کبھی دلّی آجاتے تھے اور کچھ قصے اور کہانی سنا کو کچھ دنوں میں پھر غائب ہو جاتے تھے انھیں سب دیوانہ کہتے تھے۔ اور ایسے کام کوئی دیوانہ ہی کر سکتا ہے۔

لئیق رضوی نے دیوندر ستیارتھی سے بہت بعد میں سہی لیکن اسی دیوانگی سے اردو میں مرثیے کی عوامی روایت سے متعلق چیزیں جمع کیں اور ان کی کتاب 'عوامی مرثیے کی روایت' کو پڑھ کر بڑی خوشی ہوئی اور ایسا لگا جیسے کوئی چیز جس کی بہت دنوں سے تلاش تھی وہ مل گئی۔ 'عوامی مرثیوں کی روایت' گیارہ ابواب پر مشتمل ہے۔ اس کی خوبی یہ ہے کہ اس میں عوامی روایتوں کا مرثیہ کے ساتھ صرف ضمنی تذکرہ نہیں ہے۔ بلکہ مختلف روایات کا تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے۔ لسانی اعتبار سے بھی مرثیے کی عوامی روایت بہت اہمیت رکھتی ہے اس لیے کہ یہ روایت ایک ایسی ملی جلی زبان کی روایت ہے جس میں پراکرت بھی ہے کھڑی بولی، پنجابی اودھی سبھی زبانوں کے الفاظ ہیں اور جو لسانی تحقیق کا ایک بڑا موضوع ہے لئیق رضوی نے پہلی بار تمام حوالوں کے ساتھ اس کا جائزہ لیا ہے انھوں نے عوامی روایت اور عوامی مرثیے کے رنگ وروپ کے ساتھ مختلف صوبوں، خاص طور پر دکن مہاراشٹرا، جنوب کے دوسرے علاقوں اور پنجاب اور یوپی میں دہوں، زاری، اور دوسرے رثائی انداز اظہار سے بحث کی ہے اور ان کی مثالیں دی ہیں۔ ان مثالوں کو جمع کرنا معمولی کام نہیں تھا انھوں نے مختلف زبانوں کے گیتوں کے ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ وہ محرم کی کس تاریخ کے لیے مخصوص تھے۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ مختلف تاریخوں پر مختلف، شہدا کا ذکر نئی ترتیب مرثیہ نہیں ہے بلکہ عوامی روایت کے گیتوں میں یہ رائج تھا لئیق رضوی کی کتاب اس طرح کی معلومات کا ایسا ذخیرہ ہے جو اردو میں پہلی بار تحریر میں آیا ہے انھوں نے مرثیہ کو ایک طرح سے اس کی تاریخ کی گمشدہ کڑی سے جوڑ دیا ہے۔ جو ایک بہت بڑا علمی کارنامہ اور اردو مرثیے کی تاریخ میں ایک اضافہ ہے۔

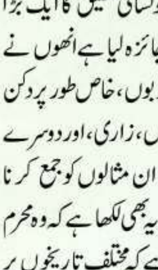

شاد شناسی

مرتبہ: انجینئر فیروز مظفر

صفحات: 520، قیمت: 600 روپے، سنہ اشاعت: 2018

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی

مبصر: اسلم چشتی، فلیٹ نمبر 404، شان رِویرا اپارٹمنٹ 45/2 رِویرا سوسائٹی، نزد جمبھولکر گارڈن، ونوری، پونے۔ 411040 مہاراشٹر

انجینئر فیروز مظفر اپنے والد محترم پروفیسر مظفر حنفی کے حوالے سے جانے جاتے ہیں لیکن انھوں نے اپنی ادبی پہچان بھی بنالی ہے۔ مختلف موضوعات پر ان کی گیارہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان کتابوں کے ذریعے ان کا جو کام ہے وہ قابلِ احترام ہے۔ ادبی دنیا میں پذیرائی پانے والی یہ کتابیں اسکالرس کے بھی کام کی ہیں اور اساتذہ بھی ان سے فیضیاب ہو سکتے ہیں۔ مستقبل میں تو ان کی اہمیت اور بھی بڑھ جائے گی؟ 'شاد شناسی' ان کی نئی کتاب ہے جو انھوں نے شاد عارفی پر لکھے ہوئے اہم مضامین کو مرتب کر کے شائع

کی ہے۔ 2018 میں شائع ہوئی اس کتاب کی قدر و قیمت کا اندازہ کتاب پڑھنے کے بعد ہوا۔ ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''شاد عارفی کا قلم کم و بیش پچاس برسوں تک گہرافشانیوں میں مصروف رہا۔ انھوں نے اردو نثر و شاعری کی تقریباً تمام اصناف میں جولانیِ طبع کے جوہر دکھائے ہیں، افسانے لکھے، اداریے قلمبند کیے، احباب اور شاگردوں کے نام خطوط میں ادبی امور پر اظہارِ خیال کیا لیکن ان پر مفصل گفتگو کا یہ محل نہیں ہے۔ شاعری میں ان کی دلچسپی نثر کے مقابلے میں زیادہ رہی۔ انھوں نے تقریباً چار سو غزلیں، دو سو نظمیں، ڈھائی سو رباعیات وقطعات، کئی چہار بیت، بیس سے زیادہ گیت اور درجنوں سہرے اور مبارک بادیاں تخلیق کیں۔ ان کے ادبی سرمائے میں درجنوں ہندی کویتائیں اور اپدیش بھی شامل ہیں۔''

(مقدمہ، کتاب ہذا، ص 17، 18)

مصنّف کے مقدمہ کا یہ اقتباس شاد عارفی کا مختصر تعارف ہے۔ مصنف نے مقدمہ بہت ہی پراثر لکھا ہے۔ خاص طور پر شاد کی زندگی کے حالات اور جد و جہد کو جو انھوں نے بیان کیا ہے وہ دستاویزی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ ان کے والدِ محترم کے پی ایچ ڈی کے مقالے کا موضوع یہی تھا وہ مقالہ شاد عارفی کی از سرِ نو دریافت کا درجہ رکھتا ہے۔ مصنف نے اپنے بیان میں شاد عارفی کی حیات اور ادبی خدمات کی سچائیوں کو تلاش کر کے اپنے طور پر لکھا ہے۔ مقدمہ کے حواشی کی فہرست میں 24 کتابوں کے نام ہیں۔ ان کتابوں کو پڑھ کر ان میں سے مقدمہ کے لیے مواد تلاش کرنا اپنے خیالات کی آمیزش سے مقدمہ کو کارآمد بنانا کوئی آسان کام نہیں۔ کوئی اگر صرف یہ مقدمہ ہی پڑھ لے تو شاد عارفی کی شخصیت اور فن سے بڑی حد تک واقف ہو جائے۔ 36 مضامین اور کچھ مشاہیرِ ادب کے تاثرات ہیں۔ سبھی لکھنے والے مستند اور مشہور ہیں۔ سب کا ایک ایک مضمون ہے لیکن ڈاکٹر محبوب راہی کے چار مضامین اس میں شائع کیے گئے ہیں پتہ نہیں کیوں؟ قلمکاروں میں پروفیسر ضیا احمد بدایونی، پروفیسر سیدہ جعفر، پروفیسر مظفر حنفی، پروفیسر محمد زماں آزردہ، ماجد الباقری، پروفیسر سلیم اختر، پروفیسر محمد نعمان خان، عروج زیدی اور پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کے نام بہت ہی اہم ہیں۔ انھوں نے شاد عارفی کی شخصیت اور ان کے فن پر خوب لکھا ہے۔ ان کی تحریروں سے کئی گوشے سامنے آتے ہیں اور قاری کو سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔

آخر میں 'طنازِ وقت' کے نام سے شاد کی حیات پر مبنی ڈاکٹر ساجد امجد کا لکھا ناولٹ شائع کیا گیا ہے جو شاد کا ایک غیر معمولی کردار ثابت کرتا ہے۔ اس کے مصنف نے اپنی فنکاری سے اس مرکزی کردار کو اردو فکشن کا ایک حصّہ بنا دیا ہے۔ دونوں کے چھپ چھپ کر ملنے کے مناظر اور مختصر مکالمے حقیقت کو فکشن اور فکشن کو حقیقت بنا دیتے ہیں۔ مصنف ڈاکٹر ساجد امجد اپنی اس تصوّراتی تخلیق میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ اس ناولٹ کو کتابی صورت میں اردو کے علاوہ ہندی زبان میں بھی شائع کیا جائے تو یقیناً یہ ناولٹ فکشن پسندوں کو پسند آئے گا کیونکہ شاد کا مرکزی کردار افسانوی انوکھا کردار ہے خودداری اور انا پرستی کی وجہ سے اس کی زندگی میں مصیبتیں اور پریشانیاں آتی رہتی ہیں اور وہ ان سے مقابلہ کرتے کرتے زندگی کی بازی ہار جاتا ہے لیکن اپنے مشاہدات اور تجربات کو شاعری کے حوالے کر جاتا ہے۔ ایسا کرنا اس کی جیت ہے۔

'کتاب شاد شناسی' انجینئر فیروز مظفر کی بہترین سوجھ بوجھ سے مرتّب کردہ ایسی کتاب ہے جس سے شاد کا ادبی اور شخصی پیکر کھل کر قاری کے سامنے آتا اور ذہن میں محفوظ ہو جاتا ہے۔ اس کتاب پر مصنف کو مبارکباد دیتے ہوئے مجھے خوشی ہو رہی ہے۔ میں ان سے امید کرتا ہوں کہ یہ اور بھی ادبی شہ پارے ادب پسندوں کو دیں گے۔

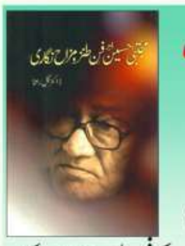

مجتبیٰ حسین اور فنِ طنز و مزاح نگاری

مصنف: ڈاکٹر گل رعنا

صفحات: 244، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2017

ناشر: انداز پبلی کیشنز ایریزونا، (یو ایس اے)

مبصر: ڈاکٹر مصباح احمد صدیقی، محلّہ گھیر مناف، امروہہ (یوپی)

زیرِ تبصرہ کتاب محترم مجتبیٰ حسین کے فن خاکہ نگاری اور ان کے فن طنز و مزاح پر ایک تحقیقی کام ہے، اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ مجتبیٰ حسین اردو ادب بالخصوص فن خاکہ نویسی، مزاح نگاری اور کالم نگاری کا ایک معتبر اور بڑا نام ہے، انھوں نے بہت لکھا ہے اور تقریباً سبھی معیاری لکھا ہے۔ ناقدینِ فن اور دانشورانِ علم نے نہ صرف ان میدانوں میں ان کی توصیف و ستائش کی ہے بلکہ ان کا تشخص تسلیم کیا ہے، میرے محترم استاد سرفراز عثمانی صاحب نے امروہہ کے ایک خاکہ نگار سید غیور حسن نقوی کی خاکہ نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''موجودہ دور میں مجتبیٰ حسین اور ظ۔ انصاری یا ایک دو اور حضرات ہیں جن کے دم سے خاکہ نگاری کا بھرم قائم ہے۔''

یہاں بھرم کی جگہ 'وقار' ہونا چاہیے تھا۔ مجتبیٰ حسین صاحب ایک کہنہ مشق، منجھے ہوئے، مشاق اور صاحب طرز منفرد خاکہ نگار، کالم نویس اور طنز و مزاح نگار ہیں، دیکھیے ان کے طنز کی نشتریت کتنی کاری ہے اور اس میں کس قدر سچائی ہے۔ 'چار مینار اور چار سو برس' میں وہ لکھتے ہیں:

''میں نے چار مینار سگریٹ کی ڈبیا پر نظر ڈالی، وہاں چار مینار کے چاروں مینار صحیح و سالم کھڑے تھے، یوں بھی ان دِنوں صرف کاغذ پر ہی ہر چیز محفوظ نظر آتی ہے۔ چاہے وہ عمارت ہو یا ہمارا کردار، فلسفہ ہو یا ہماری تہذیب۔''

بہرحال! ڈاکٹر گلِ رعنا صاحبہ نے اپنے پی ایچ۔ ڈی۔ مقالہ کے لیے بہت ہی بلند و بالا اور قدآور شخصیت کا انتخاب کیا مجتبیٰ حسین جیسی عظیم شخصیات کے تو ہر پہلو پر الگ الگ تحقیقی و تنقیدی کام ہونا چاہیے یا پھر ایسا وسیع منصوبہ تیار کرنا چاہیے کہ ان کے ہر گوشے پر بھرپور تحقیق و تلاش کے بعد اس کا کماحقہ حق ادا کیا جائے، ڈاکٹر گل رعنا صاحبہ نے اپنے موضوع کا بڑی محنت اور تلاشِ بسیار سے حق ادا کیا ہے مگر مجتبیٰ حسین کے کارناموں کو دیکھتے ہوئے خیال آتا ہے کہ کہیں کچھ کم ہے۔ زیرِ نظر کتاب میں چھ باب ہیں جن کا پوری طرح ذمہ داری کے ساتھ حق ادا کیا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ پروفیسر حبیب ضیاء (جو گل رعنا کی استاد ہیں) کا پیش لفظ ''مجتبیٰ حسین صاحب کے برادر زادے شہریار جلیس صاحب کا تبصرہ اور خود ڈاکٹر گل رعنا صاحبہ کا مقدمہ 'ابتدائیہ' کے عنوان کے ساتھ کتاب میں شامل ہیں۔ ان چھ ابواب کی تفصیل اس طرح ہے:

باب اوّل: طنز و مزاح کی تعریف۔ 1/طنز، 2/مزاح، 3/طنز و مزاح میں فرق، 4/طنز و مزاح کا رشتہ۔ باب دوم: طنز و مزاح کے ابتدائی نقوش۔ باب سوم: مجتبیٰ حسین کے حالاتِ زندگی، خاندان، تعلیم، ادبی سرگرمیاں، ملازمت۔ باب چہارم: مجتبیٰ حسین کی طنز و مزاح نگاری، مضمون نگاری میں طنز و مزاح کی چاشنی، خاکہ نگاری میں طنز و مزاح کے نقوش، کالم نگاری میں طنز و مزاح کی جھلکیاں، سفرناموں میں طنز و مزاح کے نشتر۔ باب پنجم: مجتبیٰ حسین اور ان کے ہم عصر مزاح نگاروں میں مماثلت۔ 1/مرزا فرحت اللہ بیگ، 2/ابن انشاء، 3/کنہیا لال کپور، 4/مشتاق احمد یوسفی، 5/فکرِ تونسوی، 6/یوسف ناظم۔ باب ششم: اختتامیہ، کتابیات۔

ڈاکٹر گل رعنا صاحبہ نے باب اول میں طنز و مزاح کے چار الگ الگ طنز اور مزاح، طنز و مزاح میں فرق اور طنز و مزاح کا رشتہ کے عنوانات قائم کر کے ان پر سیر حاصل بحث کرتے ہوئے اچھی معلومات فراہم کی ہیں۔ باب دوم بھی خاصی اہمیت کا حامل ہے، اس میں انھوں نے اردو ادب میں اپنی تحقیقی کاوش سے طنز و مزاح کے ابتدائی نقوش خوب

تلاش کیے ہیں۔ میدانِ تحقیق میں باب سوم کے مشمولات بھی ادیب اور فنکار کو سمجھنے کے لیے بہت کارآمد باتیں ہیں، اگر چہ وہ ہر عام قاری کے کام کی نہیں کیونکہ عام قاری کو صرف مجتبیٰ حسین کا ادبی سرمایہ چاہیے، بھیا بھتیجے نہیں۔ باب چہارم تو مکمل مجتبیٰ حسین صاحب کے فن پر ہی ہے، جس میں بڑی ہوشیاری اور دیدہ ریزی سے ان کے فکر وفن کا جائزہ لیا گیا ہے اور بڑی حد تک اس کا حق بھی ادا کیا ہے۔ باب پنجم میں ڈاکٹر گل رعنا صاحبہ نے مجتبیٰ حسین کے پیش رو اور معاصرین صاحبان طنز ومزاح سے مجتبیٰ حسین کے فکر وفن کا موازانہ کیا ہے جو خاصے کی چیز ہے۔ میں مجتبیٰ حسین صاحب کے برادر زادے جناب شہریار جلیس کی رائے سے پوری طرح متفق ہوں جو انھوں نے ڈاکٹر گل رعنا کی محنت و کاوش پر دی ہے وہ لکھتے ہیں ''میں مانتا ہوں کہ کتاب ایک دستاویز کی حیثیت سے قبول کی جائے گی کیونکہ مجتبیٰ حسین کے فن کے متعلق تمام مثالیں اس میں شامل کی گئی ہیں۔ مصنفہ نے جس ہنرمندی سے مجتبیٰ حسین کی طنز ومزاح نگاری پر قلم چلایا ہے، وہ قابلِ تحسین ہے۔''

بلاشبہ ڈاکٹر گل رعنا صاحبہ کے ذریعہ پدم شری مجتبیٰ حسین کے فکر وفن پر ایک معیاری کام منظر عام پر آیا ہے، جو آئندہ ریسرچ اسکالر اور مجتبیٰ حسین پر تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے بہترین ماخذ ہے۔ ڈاکٹر گل رعنا صاحبہ کو چاہیے تھا کہ وہ کتاب کے آخری باب ششم میں ایک عنوان کے تحت مجتبیٰ حسین صاحب پر اب تک جتنی کتابیں، مقالات اور مضامین شائع ہوئے ہیں، ان کی ایک تفصیلی فہرست ضرور دیتیں جن میں کتاب ومقالہ نگار کا نام، کب اور کہاں شائع ہوئی، اور مجتبیٰ صاحب کے کس ادبی پہلو کو زیادہ اجاگر کرتی ہے، یہ ایک خاصے کی چیز آپ کی طرف سے مجتبیٰ صاحب پر آئندہ کام کرنے والوں کو ملتی جو بہت ہی کارآمد ہوتی۔ میں ڈاکٹر گل رعنا صاحبہ کے لیے دعا گو ہوں کہ وہ پوری ایمانداری اور ثابت قدمی کے ساتھ اسی طرح اُردو کی خدمت کرتی رہیں۔

علامہ سیماب اکبر آبادی حیات و فن

مصنف: ڈاکٹر شمیمہ اختر

صفحات: 288، قیمت: 350 روپے، سنہ اشاعت: 2017

ناشر: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی

مبصر: اقرا اسجان، A-10، بٹلہ ہاؤس چوک، نزد جامعہ کوآپریٹو بینک

علامہ سیماب اکبر آبادی کے تعلق سے ابر احسنی گنوری اپنے ایک ہیں ''بیشک ان کی موت دنیائے ادب میں وہ خلا ہے کہ اس کے پر ہونے کا بظاہر امکان نہیں۔ اس حقیقت پر پردہ ڈالنا کفر ہے کہ جتنی شعر وادب کی خدمت موصوف نے کی ہر کسی کے بس کا کام نہیں۔'' علامہ سیماب اکبر آبادی کی حیات اور فن پر کام کرنا کوئی آسان بات نہیں۔

ڈاکٹر شمیمہ اختر قابل مبارکباد ہیں جو انھوں نے علامہ سیماب اکبر آبادی کی حیات وفن پر مشتمل ایک مبسوط ومربوط اور جامع کتاب پیش کی ہے۔ کتاب کی ابتدا میں افتخار امام صدیقی نے علامہ سیماب اکبر آبادی پر تحقیقی کام کا ایک مختصر جائزہ رقم کیا ہے۔ جس سے یہ اندازہ ہوا کہ علامہ پر کام کم ضرور ہوا ہے لیکن جتنا بھی ہوا ہے وہ بنیادی نوعیت کا ہے اور شمیمہ اختر کی کتاب مطالعۂ سیماب کے باب میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ ڈاکٹر شمیمہ اختر کا اس کام سے ذہنی اور جذباتی رشتہ بھی قائم ہوتا ہے وہ اس طرح کہ ان کے دادا نشاط کشتواڑی، سیماب اکبر آبادی کے شاگرد رشید تھے اور استاد وشاگرد میں نہایت محبت وانس کا رشتہ تھا۔

زیر نظر کتاب میں کل نو ابواب ہیں لیکن ابتدائی سات ابواب کا تعلق علامہ سیماب سے براہ راست ہے۔ ان ابواب میں سیماب اکبر آبادی کی حیات وشخصیت، غزلیہ شاعری اور نظمیہ شاعری کا فن زبان اور بیان کے حوالے سے تنقیدی جائزہ، قصیدہ ومرثیہ نگاری کا محاکمہ، رباعی، گیت، قطعات، منظوم تراجم وغیرہ کا جائزہ اور سیماب کے عروضی تجربوں پر بھی خاطر خواہ گفتگو کی گئی ہے۔

ڈاکٹر شمیمہ اختر نے سیماب اکبر آبادی کے مشہور تلامذہ کے نام بھی گنوائے ہیں، اتنا ہی نہیں بلکہ ان میں سے جو آج بھی حیات ہیں اس کی بھی نشاندہی کی ہے۔ یہ بھی بتایا ہے کہ علامہ کے شاگردوں میں کس شاگرد کے شاگرد زیادہ ہوئے اور ان میں کون آج کا محترم اور قابل قدر نام ہے۔ انھوں نے علامہ کی زندگی کا احوال بڑی تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ یہاں تک کہ ان کی مرغوب غذاؤں اور چہیتی اولادوں اور اولادوں کی اولادوں میں کسے محبوب رکھتے تھے اس بات کا بھی ذکر کیا ہے۔ حلیہ اور لباس، قد کاٹھی نیز سفر وحضر کے انداز و واقعات کو بھی تحریر کیا ہے۔ علامہ سیماب کے انتقال پر مشاہیر کے تعزیتی خطوط کو بھی درج کر دیا ہے۔ مثلاً علامہ کی رثائی اور عزائی شاعری کے دو مجموعوں 'نفیر غم' اور 'سرود غم' کے تعلق سے شمیمہ اختر لکھتی ہیں کہ نفیر غم اپنے خطبۂ صدارت کی شمولیت اور سرود غم اپنے شعری مواد کی وجہ سے غیر معمولی مجموعے ہیں۔ حالانکہ اس خطبۂ صدارت اور شعری مواد کی اس زمانے میں سخت مخالفت ہوئی اور جواب بھی دیے گئے۔ یہاں اس بات کا ذکر بے موقع ہوگا کہ علامہ کے خطبۂ صدارت اور شعری مواد میں مخالفت کے کون سے اسباب پوشیدہ تھے۔ اصل بات یہ ہے کہ شمیمہ اختر نے ان مخالفتوں کا تجزیہ کرنے کے بعد بے باکی کے ساتھ اپنی رائے ظاہر کی۔ شمیمہ اختر ہی کیا نئی نسل میں شاید ہی کوئی عروض کی کماحقہ واقفیت رکھتا ہو۔ شمیمہ اختر نے اس فن سے اپنی ناواقفیت کا برملا اظہار کیا ہے۔ لہٰذا اس ضمن میں انھوں نے عنوان چشتی کی آرا کو خاص اہمیت دی ہے۔ ظاہر ہے عنوان چشتی کی رائے عروض میں صائب تسلیم کی جاتی ہے اس لیے سیماب کے عروضی تجربوں کے بارے میں عنوان چشتی کی رائے کو اہمیت دینا اپنی بات کو سند فراہم کرنے کے مترادف ہے۔ عنوان چشتی کے علاوہ عبدالقادر سروری اور علامہ شارق جمال کے حوالے سے بھی گفتگو کی ہے۔ ان مشاہیر کی تحریروں کو پڑھنے اور اہمیت دینے کا کم از کم اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ مصنفہ کو ان نظموں کا ادراک ہونے لگا جن میں سیماب نے عروضی تجربے کیے ہیں۔ شمیمہ اختر نے ایسی نظموں کو درج بھی کیا ہے۔ اسی طرح سے سیماب نے غزل میں جو عروضی تجربے کیے ان کی بھی نشان دہی کی ہے۔

آخر میں مصنفہ نے علامہ کے ادبی اختصاص اور امتیازات کو نشان زد کیا ہے جن میں مشاعروں میں خطبہ خوانی کی ایجاد، بعض خطبات کو منظوم پیش کرنا، ایسے مشاعروں میں شرکت نہ کرنا جس کا صدر کوئی سیاسی اور سماجی اعتبار سے ذی حیثیت ہو، رسالہ شاعر کا ایک منظوم شمارہ پیش کرنا، فارسی عروض کو اردو شکل دینے کی سعی، جمعیت الشعرا کے نام سے ہندوستانی شعرا کی ایک جماعت کے قیام پر زور، شراب کی مخالفت کے سبب جوش اور سیماب کے درمیان ادبی معرکے وغیرہ اہم ہیں۔ شمیمہ اختر نے کتاب کے آخر میں علامہ سیماب کی دستیاب کتابوں کے سرورق بھی شامل کیے ہیں۔

بلاشبہ یہ کتاب علامہ سیماب اکبر آبادی کی حیات وفن کے تعلق سے عمدہ دستاویز ہے۔ مصنفہ نے بڑی عرق ریزی اور محنت وجانفشانی کے ساتھ اس کام کو انجام تک پہنچایا ہے۔ امید ہے ان کی یہ کوشش ادب کی زمین پر نمو پائے گی اور ثمر بار ہوگی۔

یاران نکتہ داں کے لیے

مصنف: ڈاکٹر اشفاق انجم

صفحات: 148، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2018

مبصر: اسماء، ریسرچ اسکالر۔ شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

زیرہ تبصرہ کتاب 'یاران نکتہ داں کے لیے' ڈاکٹر اشفاق انجم کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جس میں شعرا کا تنقیدی جائزہ بڑی فنکاری سے پیش کیا گیا ہے۔ اس سے قبل مصنف کی کتاب 'پس نوشت' جس میں 12 شعری مجموعوں کا فن شاعری اور زبان وبیان کے اعتبار سے تنقیدی

جائزہ لیا گیا تھا، نہ صرف مقبول ومعروف ہوئی بلکہ ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھی گئی۔

زیرنظر کتاب 'یاران نکتہ داں کے لیے' بھی شعری ادب کی دنیا میں نئی وسعتوں اور امکانات کے دروا کرتی ہے۔ جس میں تنقید بھی ہے اور تفہیم شعر بھی۔

کتاب میں شامل پہلا مضمون 'دیوان غالب : مرزا اسد اللہ خاں غالب' ہے۔ جس میں مصنف نے بڑی جرأت کے ساتھ کلام غالب کے محاسن کے ساتھ معائب بھی سپرد قلم کیے ہیں اور اشعار میں تقابلی ردیفوں کے عیب کو بھی نمایاں کیا ہے۔ اس سے مصنف کی مفکرانہ جرأت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کا یہ قدم غالب شناشی یا غالب فہمی کے باب میں ایک اضافہ کا حکم رکھتا ہے۔ بطور مثال ایک شعر دیکھیے:

بسکہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیر پا　　موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

مضمون نگار کے نزدیک 'حلقہ' کو زنجیر نہیں کہا جا سکتا۔ 'زنجیر' کئی حلقوں کے سلسلے کا نام ہے۔ لہٰذا مصرع ثانی یوں ہونا چاہیے تھا۔ ''موئے آتش دیدہ ہیں حلقے مری زنجیر کے یا پھر موئے آتش دیدہ ہے ہر حلقہ مری زنجیر کا''

مزید اپنے اعتراض کی تقویت کے لیے مولانا غلام رسول مہر کی تشریح پیش کرتے ہیں۔ مضمون 'کلیات ناصر : ناصر کاظمی' میں مختصراً ناصر کاظمی کے کلام کی خوبیاں بیان کی گئی ہیں وہیں ان کے کلام پر مصنف کی تنقیدی گرفت کا بھی احساس ہوتا ہے۔

ماہ تمام کی پروین شاکر کا شمار ان شاعرات میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنے عہد یا بعد کے زمانے میں وہ مقام پایا جس کی مثال بہت کم ملتی ہے۔ صاحب کتاب نے پروین شاکر کے نمائندہ اشعار کے ذریعہ ان کے ہاں کچھ نقائص کی بھی نشاندہی کی ہے، تاکہ قارئین محاسن شعر کے ساتھ ان اغلاط سے بھی محفوظ ہو سکیں۔ اور ادب پارے کی صحیح تفہیم کر سکیں۔ بقول مضمون نگار: ''کسی مبتدی اور کم علم شاعر کے یہاں ایسی خامیاں ہوں تو نظر انداز کی جا سکتی ہیں لیکن پروین شاکر جیسی اہل علم اور کئی زبانوں کی ماہر شاعرہ کے یہاں معمولی خامی بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔ کیوں کہ اس نے نئی نسل کے شعرا کو اس درجہ متاثر کیا ہے کہ وہ اس کے اسلوب اور زمینوں میں شعر کہنا باعث فخر سمجھتے ہیں۔ بطور نمونہ ایک مثال دیکھیے:

بس یہ ہوا کہ اس نے تکلف سے بات کی　　اور ہم نے روتے روتے دوپٹے بھگو دیے

اس شعر میں 'دوپٹہ بھگولیا' کا محل مضمون نگار کے مطابق درست نہیں۔ 'دوپٹے' کی جگہ 'رومال' کا ذکر ہونا چاہیے۔ کیونکہ اس میں دوپٹے کے بجائے کئی ایک کے بھیگنے کے امکانات ہیں جو رومال کے ذریعہ ممکن ہے۔ ایسی ہی کئی مثالیں پیش کی گئی ہیں۔

جدید شاعر 'افتخار عارف' اپنی امتیازی حیثیت کے سبب ہندو پاک میں یکساں اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کے ہاں زندگی اپنی تلخی اور بے وقعتی کے ساتھ نمایاں ہے۔ 'مہر دو نیم' سے 'حرف باریاب' کے دوران وہ مختلف نت نئے تجربات سے ہمکنار ہوئے۔ جس طرح انھوں نے نعت خوانی اور مراثی کے تجربات کیے وہ اس بات کے مظہر ہیں کہ ان کا باطن دین وملت کی شمع سے لبریز ہے اور وہ اس روشنی سے دوسروں کو بھی منور کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ ڈاکٹر اشفاق انجم نے افتخار عارف کے شعری محاسن کے ذکر کے ساتھ ان کے کئی ایسے اشعار بھی پیش کیے ہیں جو ان کی نظر میں عارف کے بہترین شعر کہے جانے کے مستحق ہیں۔ 'حرف باریاب' میں زبان و بیان کی کچھ کوتاہیاں بھی ہیں جن کی جانب توجہ دلائی گئی ہے۔

کلام ڈاکٹر راحت اندوری' 12 صفحات کو محیط طویل مضمون ہے۔ صاحب کتاب نے بڑی صراحت سے کلام راحت کا تنقیدی محاسبہ کیا ہے۔ اور یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ان کی شاعری افسوس ناک حد تک ژولیدگی کا شکار ہو گئی ہے۔ ان کے کلام میں لطف بیان کا ذائقہ تو ہے لیکن لطف سخن سے یکسر محروم۔ بہ ظاہر دلکش و دلفریب بہ باطن بنجر، جہاں معنویت کم رندیت اور اداکاری زیادہ ہے۔ 'مسافر خواب لکھتا ہے: شبیر آصف' میں شامل غزلوں کے توسط سے یہ بتایا گیا ہے کہ اپنے پسندیدہ شاعر سے متاثر ہونا، ان کا رنگ و آہنگ قبول کرنا یا ان کی روش اختیار کرنا غلط نہیں البتہ دوسرے کے تجربات کو خام ہیئت عطاء کرنا درست نہیں۔ شبیر آصف کے کلام کا مطالعہ یہ واضح کرتا ہے کہ وہ اکثر دوسروں کے اسلوب، لفظیات اور مضامین کو اپنے لفظوں میں بیان کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کے یہاں افتخار عارف، ناصر کاظمی، سلیم کوثر اور پروین شاکر کا اثر اس حد تک ثرایت کر چکا ہے کہ ان کی شعری کائنات انہیں شعراء کی لفظیات اور طرز اسلوب کے دام میں گرفتار ذخیرہ الفاظ کی کمیابی کا شکار ہو گئی ہے۔

مذکورہ بالا مضامین کے علاوہ کتاب میں شامل مضامین میں کلیات ساغر : ساغر صدیقی، سخن سرائے : منور رانا، کھنڈر خرابے کا شاعر : پی پی رند، پرواز فکر : فکر پادری اور شاخ دل : ماجد دیوبندی اس اعتبار سے اہم ہیں کہ اشفاق صاحب نے ان شعرا کو متعارف کراتے ہوئے بغیر کسی رعاریت کے یہ بھی بتایا ہے کہ ان کے اشعار میں چمکدار موتیوں کے درمیان کچھ سنگریزے اور کانچ کے باریک ٹکڑے بھی ہیں جنھیں الگ کرنا ناگزیر ہے۔

ڈاکٹر اشفاق انجم کی یہ کاوش شعری تنقید میں ایک مشعل راہ ہے۔ جو نو آموز شعراء اور باذوق قارئین میں اشعار کی پرکھ کا صحیح مذاق ومعیار قائم کرتی ہے۔ یہ کتاب بلاشبہ تنقید کے باب میں نئے اضافے کا حکم رکھتی ہے۔

سوانح

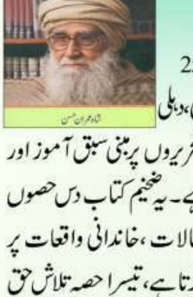

اوراق حیات

مرتب: شاہ عمران حسن

صفحات: 983، قیمت: 699 روپے

ناشر: رہبر بک سروس، پوسٹ بکس نمبر: 9736، جامعہ نگر دہلی 25

مبصر: ڈاکٹر جسیم الدین، پوسٹ ڈاکٹورل فیلو، شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی، دہلی

'اوراق حیات' مولانا وحید الدین خاں کی خودنوشت تحریروں پر مبنی سبق آموز اور جامع سوانحی کتاب ہے، جسے شاہ عمران حسن نے مرتب کیا ہے۔ یہ ضخیم کتاب دس حصوں پر مشتمل ہے، پہلا حصہ مولانا وحید الدین خاں کے ابتدائی حالات، خاندانی واقعات پر مشتمل ہے، دوسرا حصہ تعلیمی مراحل، تعلیمی تجربات کا احاطہ کرتا ہے، تیسرا حصہ تلاش حق کے مراحل، اسلامی مرکز، الرسالہ: ایک تحریک، سینٹر فار پیس اینڈ اسپریچولٹی انٹرنیشنل (سی پی ایس) اور القرآن مشن کی تفصیلات سے آگاہ کراتا ہے، چوتھا حصہ مولانا وحید الدین خان کے قلمی تجربات، ابتدائی تحریروں، 'الجمعیۃ' کی ادارت، ماہ نامہ 'الرسالہ' کا اجرا، دس منتخب کتابوں، تذکیر القرآن، انعام یافتہ کتب، نصاب کا مضمون، فہرست کتب اور نشر شدہ تقریروں کو محیط ہے۔ پانچواں حصہ دعوتی مشن، دعوتی آئیڈیالوجی، دعوتی فکر واضطراب، دعوت الی اللہ کا اسلوب، دعوتی جدوجہد، نئے دعوتی امکانات، صلح حدیبیہ اور دعوت الی اللہ اور دعوتی غفلت کے نتائج سے واقف کراتا ہے۔ چھٹا حصہ، تجربات سفر، مشاہدات سفر، حج بیت اللہ کا تجربہ، سفرنامہ اسپین وفلسطین اور دیگر اسفار سے روشناس کراتا ہے۔ ساتواں حصہ عہد حاضر کی شخصیات بشمول مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندوی اور تنظیمی تعلقات کو بیان کرتا ہے۔ آٹھواں حصہ مولانا وحید الدین خاں کی حب الوطنی، مسئلۂ کشمیر، بابری مسجد اور مسلم سیاست، فرقہ وارانہ فسادات، شاہ بانو کیس۔ شتم رسول کا معاملہ اور عالمی سیاست پر بالتفصیل روشنی ڈالتا ہے۔ نواں حصہ اوراق حیات، ربانی تحریکات اور اسباق حیات کو محیط ہے۔ دسواں حصہ مولانا

وحیدالدین خاں کی مخالفت، اعلانِ قتل، تصویر کا فتنہ، اعتراف، نتیجہ خیز تحریک، رفقا مشن اور حرف آخر پر مشتمل ہے۔

صاحب سوانح 'مولانا وحیدالدین خاں یکم جنوری 1925 کو پیدا ہوئے، آپ نے ابتدائی تعلیم مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظیم گڑھ میں حاصل کی۔ شروع شروع میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمہ اللہ سے متاثر ہوکر 1949 میں 'جماعت اسلامی ہند' میں شمولیت اختیار کرلی، لیکن پندرہ سال بعد جماعت اسلامی کو خیر آباد کہہ دیا اور تبلیغی جماعت میں شامل ہوگئے۔ 1975 میں اسے بھی مکمل طور پر چھوڑ دیا'۔

(مولانا وحیدالدین خان افکار ونظریات، ص:2، ناشر: مکتبہ رحمۃ للعالمین، لاہور 2013)

مولانا وحیدالدین خاں صاحب تقریباً دو سو کتابوں کے مصنف ہیں، ان کی تحریروں میں مکالمہ بین المذاہب، امن وآشتی کا ذکر بکثرت نظر آتا ہے اور اس میں وعظ وتذکیر کا پہلو بھی نمایاں طور پر موجود ہوتا ہے، لیکن مولانا کے افکار ونظریات میں تجدد پسندی کی طرف میلانات اور رجحانات واضح طور پر پائے جاتے ہیں، انھوں نے دین کے بنیادی تصورات کی ازسرنو ایسی تعبیر وتشریح کی ہے، جو ان سے پہلے کسی نے نہیں کی۔ وہ نہ صرف اس بات کو تسلیم کرتے ہیں بلکہ اس میں اپنے لیے فخر بھی محسوس کرتے ہیں۔ وہ خود رقمطراز ہیں: 'میری پوری زندگی پڑھنے، سوچنے اور مشاہدہ کرنے میں گذری ہے، فطرت کا بھی اور انسانی تاریخ کا بھی، کوئی شخص مجھے تفکیری حیوان بھی کہہ سکتا ہے، میری اس تفکیری زندگی کا ایک حصہ وہ ہے، جو 'الرسالہ' یا کتابوں میں شائع ہوتا رہا ہے، اس کا دوسرا حصہ نسبتاً غیر منظّم حصہ ڈائریوں کے صفحات ہیں، مَیں نے تقریباً ہر موضوع کا مطالعہ کرنے کی کوشش کی ہے، اس مطالعہ کے دوران، میں اس موضوع تک پہنچا جس کو آرٹ آف تھنکنگ (Art of Thinking) کہا جاتا ہے، اس پر مَیں نے بہت سی کتابیں پڑھیں، اس سے مجھے معلوم ہوا کہ عمل تفکیر (Thinking Process) کو درست طور پر چلانے کے لیے سب سے پہلی بات یہ ہے کہ آدمی یہ جانے کہ سوچنے کا درست طریقہ کیا ہے، ورنہ برسوں کی ذہنی کاوش کے باوجود وہ صرف کنفیوژن میں مبتلا رہے گا، اگرچہ اپنے خیال کے مطابق وہ یہی سمجھے گا کہ مَیں سوچنے کا عمل کر رہا ہوں، کسی معاملہ میں صحیح نقطۂ نظر تک پہنچنے کی یہ سب سے زیادہ ضروری شرط ہے'۔ (اوراق حیات، ص:55)

مولانا وحیدالدین خاں کے افکار ونظریات سے قطع نظر ان کی خدمات قابل ستائش ہیں۔ تاریخ یا سوانح کا بالکل مسلم اور متفق علیہ ہونا دنیا کے ناممکنات میں سے ہے۔ مؤرخ یا سوانح نویس کے لیے بس اتنا لحاظ ضروری ہے کہ وہ جو کچھ لکھے حتی الامکان دیانت سے، احتیاط سے اور تعصب وعقیدت سے اوپر اٹھ کر لکھے۔ اس سوانحی کتاب کو مرتب کرنے میں نوجوان قلمکار شاہ عمران حسن نے غیر معمولی محنت کی ہے۔ شاہ عمران حسن کو سوانحی کتاب لکھنے کا کامیاب تجربہ بھی ہے، وہ اس سے قبل مولانا منت اللہ رحمانی سابق امیر شریعت بہار اڑیسہ، نیپال وجھارکھنڈ کی حیات وخدمات پر مشتمل ایک مفصل سوانحی کتاب 'حیات رحمانی' کے نام سے لکھ چکے ہیں، جس کو اہل علم ودانش نے پسند کیا، حتیٰ کہ بہار اردو اکادمی نے 2014 میں اس کتاب پر شاہ عمران حسن کو 'قاضی عبدالودود ایوارڈ' سے بھی نوازا۔ زیر تبصرہ کتاب میں کہیں کہیں ٹائپنگ ایرر بھی ہے، مثلاً اسی کتاب کے صفحہ نمبر 145 پر پانچویں سطر میں مولانا وحیدالدین خاں کے صاحبزادے ڈاکٹر ظفرالاسلام خاں کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ اس وقت مدرسۃ الاصلاح میں 'وزیر تعلیم' تھے۔ ظاہر ہے کہ یہاں 'ؤ' زائد ہے۔

بہر حال ہزاروں صفحات پر پھیلے مولانا وحیدالدین خاں کے افکار واحساسات، تجربات ومشاہدات اور واقعات وحوادث کو بہت ہی خوبصورت انداز میں شاہ عمران نے مرتب کیا ہے، یہ کتاب مولانا وحیدالدین خاں کی ہمہ جہت شخصیت کو سمجھنے اور ان کی خدمات سے آگاہ ہونے کے لیے مرجع کی حیثیت حاصل کرے گی۔ ہرچندکہ کتاب سوانحی ہے، لیکن اس پر آپ بیتی کا انداز نمایاں ہے، وجہ ظاہر ہے کہ یہ کتاب مولانا کی تحریروں کو ہی یکجا کرکے مرتب کی گئی ہے۔ امید ہے کہ اس کی علمی حلقوں میں پذیرائی ہوگی۔

فکشن

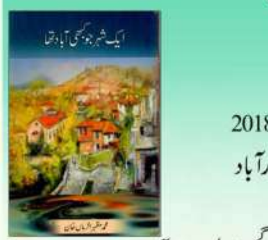

ایک شہر جو کبھی آباد تھا

مصنف: محمد مظہر الزماں خاں

صفحات: 112، قیمت 300 روپے، سنہ اشاعت: 2018

ناشر: لؤلؤ آفسیٹ پرنٹرس، مادنا پیٹ، سعید آباد، حیدرآباد

مبصر: مسرور احمد حیدری

ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو، یونیورسٹی آف حیدرآباد، گچی باؤلی، حیدرآباد 500046

مظہر الزماں خاں تمثیلی، اشارتی اور علامتی فکشن کے بے مثال فنکار ہیں ان کے افسانوں میں زمین سے آسمان تک علامتیں پھیلی ہوئی ہیں۔ اب تک ان کی گیارہ کتابیں چھپ کر عوام وخواص میں مقبول ہوچکی ہیں۔ کئی یونیورسٹیوں سے ان کے فن پر ایم۔فل اور پی ایچ ڈی بھی ہوچکی ہیں۔ مختلف ناقدین نے ان کے فن پر کتابیں بھی شائع کی ہیں جن میں خاص طور پر ڈاکٹر ہاجرہ پروین، ڈاکٹر مشتاق صدف، فرحت جہاں (پاکستان) اور ایم۔ اے سلام وغیرہ کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ 'ایک شہر جو کبھی آباد تھا' ان کی تازہ ترین کتاب ہے جو ایک سو بارہ صفحات پر مشتمل ہے۔ مظہر الزماں خاں کی کہانیوں میں جو گہرائی وگیرائی اور امکانات موجود ہیں وہ صرف انہی کے فن سے مخصوص ہیں کہ کوئی بھی لکھنے والا بے حد کوشش کے باوجود ان کے اسلوب کی نقل نہیں کرسکتا۔ یہ بات نہ صرف میں کہہ رہا ہوں بلکہ بیشتر ناقدین کی رائے بھی یہی ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی کا بیان ہے ''مظہر الزماں خاں آسان نہیں بے حد پیچیدہ افسانہ نگار ہیں، ان کو بہت ٹھہر ٹھہر کر ذہنی یکسوئی کے ساتھ پڑھنا ضروری ہے۔''

زیر تبصرہ کتاب 'ایک شہر جو کبھی آباد تھا' میں 14 کہانیاں اور ایک سوانحی خاکہ ہے۔ ان کہانیوں کے ساتھ مصنف نے دو منی کہانیاں یا پھر اپنی بات کے اظہار کے طور پر جو کچھ لکھا گیا ہے۔ اس سے مجموعہ کی کہانیوں کو سمجھنے میں قارئین کو کچھ آسانیاں ہوئی ہیں۔ کہانیاں شروع ہونے سے پہلے مصنف نے ایک مختصر سی تحریر رقم کی ہیں جس کا عنوان 'آخری غافل قوم کے لیے' ہے۔ میں سمجھتا ہوں اس مجموعہ کا جو عنوان ''ایک شہر جو کبھی آباد تھا'' رکھا گیا ہے۔ مذکورہ تحریر کے عنوان سے یقینی تعلق رکھتا ہے۔ یہ مختصر کہانی یا تحریر اس قوم پر لکھی گئی ہے جو غفلت کاری، بزدلی اور جھوٹ پر مبنی ہے۔ یہاں میں 'ایک شہر جو کبھی آباد تھا' سے ایک اقتباس نقل کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

مجموعے میں ایک اور مختصر تحریر موجود ہے جس کا عنوان 'کہانی کی پیدائش' ہے جس میں مصنف نے زمین کی پیدائش کو کہانی کی پیدائش کے طور پر پیش کیا ہے۔ 'ایک شہر جو کبھی آباد تھا' کی پہلی کہانی کا عنوان 'آخری پوسٹ مین' ہے کہانی 'آخری پوسٹ مین' انسان کے نام لکھا ہوا ایک خط ہے جو دنیا کے تمام ممالک اور تمام شہروں میں گھومتا ہوا آخری شہر، آخری بستی اور آخری پوسٹ مین کے ہاتھوں میں آیا ہے۔ خط پر تمام شہروں اور ملکوں کی مہریں لگی ہوئی ہیں۔ خط پوری زمین پر گھوم گھوم کر آخری پوسٹ مین تک پہنچا ہے اور جب آخری پوسٹ مین کو بھی وہ نہیں ملتا جس کے نام یہ لکھا ہوا ہے تو پوسٹ مین اس خط کو ایک

پرندے کے پنجے میں باندھ کرآسمان کی طرف اچھال دیتا ہے۔اس کہانی میں کئی بلیغ اشارے ہیں۔مثلاً درختوں کے پاؤں میں لکڑہاروں کا کلہاڑی رکھ کر چلا جانا، درختوں کا دم بخود ہو جانا، چکراتے بگولوں کا آنا اور آخری مکان کو آسیبی صورت میں پیش کرنا یعنی اب زمین پر انسان نہیں بلکہ شیطان بسے ہوئے ہیں۔اس مجموعہ کی دوسری کہانی کا عنوان 'کہانی ایک بوند پانی کی' ہے۔ یہ کہانی واحد متکلم میں لکھی ہوئی ہے۔مصنف نے اس کہانی میں خود کو ایک سائنس داں کے طور پر پیش کیا ہے اور اس میں مذہب اور سائنس کی ترقی کا تقابلی اور فکرانگیز مطالعہ پیش کیا ہے۔مجموعہ کی تیسری کہانی ایک 'بستی' ہے جو ایک لاجواب کہانی ہے۔اس کہانی کے اندر بہت سی بستیاں موجود ہیں اور ہر بستی کی اپنی ہی ایک کہانی ہے۔ چوتھی کہانی 'حلف نامہ' ہے یہ ایک مذہبی کہانی ہے۔ عہد الست میں تمام انسان 'قالُوا بلیٰ' کے قافلے میں تھے اور ان تمام بنی آدم سے عہد لیا گیا تھا۔اس کہانی کو بیانیہ میں پیش کیا گیا ہے۔ اس کہانی کا ماجرا اس ندی کے سبک اور تیز رفتار پانی کی چادر کی طرح ہے جو ندی کے نیچے تیزی سے بہتی ہے۔

مظہر الزماں خاں کی کہانیوں کے کردار اپنے رنگوں کے اسیر نہیں رہتے اور نہ کسی فریموں میں قید نظر آتے ہیں۔مصنف کسی بھی کردار سے کھیلتا نہیں بلکہ وہ اس کے ذہنی محرکات کے ساتھ چلتا رہتا ہے اور سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ مظہر الزماں خاں کی کہانیوں کا ہر کردار اپنا مختار نامہ آپ لکھتا ہے۔

کہانی 'ہمزاد' عدم رواداری کی اچھی مثال ہے۔اس مجموعہ کے سرنامے پر 'ہر کہانی میں ایک جہاں آباد ہے' عنوان کے تحت عقل اور علم پر مختصر اظہار ہے اور 'باغ' کے عنوان سے آزاد نظم کے طور پر دیباچہ پیش کیا گیا ہے۔کہانی 'موسمی مورخ' صرف دو صفحات پر مشتمل ہے۔لیکن مصنف نے اس مختصر ترین کہانی میں ہمارے عہد کی تاریخ بیان کر دی ہے۔ مصنف کا کہنا ہے کہ اب ہمارے عہد میں کہیں بھی آئینے کی ایک بھی دکان موجود نہیں ہے۔ یہاں آئینہ کو سچائی کی علامت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ چنانچہ کہانی کا عنوان خود اس کہانی کی تعریف بیان کرتا ہے۔ بہرحال کتاب 'ایک شہر جو کبھی آباد تھا' مظہر الزماں خاں کے اسلوب کا ایک منفرد اور شاہکار نمونہ ہے۔ جسے توجہ سے پڑھا جائے گا۔

ایک کمرے والا مکان

مصنف احمد عارف

صفحات: 129، قیمت: 250 روپے، سنہ اشاعت: 2018

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی

مبصر: نورالصباح، پیارے پورہ مؤ ناتھ بھنجن، یوپی

زیر تبصرہ کتاب میں 17 افسانے ہیں جن کے نام یہ ہیں، حمل سرائے، بالغ نظر، بددعا، اب بولو، تریاچرتر، ناجو کا ادھار، دیر نہ کرنا، گھر واپسی، ایک بار اور، دو بہنیں، ایک کمرے والا مکان، اٹوٹ رشتہ، نیا فقیر، مرغی، تتلی، ریپ، سکینہ زوجہ سید علی، پیش لفظ پروفیسر بیگ احساس نے تحریر کیا ہے جو ان کے افسانوں کی فکری جہت کو ظہور میں لاتا ہے۔ڈاکٹر غضنفر اقبال کا ایک مضمون 'احمد عارف کی ذہنی ترنگ' اور حقانی القاسمی نے 'جنسی تلازمات کا کہانی کار' کے ذریعہ ان کی کہانیوں کے در وا کرنے کے ساتھ ان کی شعوری ترنگوں کو بھی نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے اور عورتوں کے تئیں ان کی فکر کو کچھ اس انداز نظر کے ساتھ پیش کیا ہے:

''آج کی آزاد اور ماڈرن عورتیں اپنی جنسی خواہشات کی تسکین اور افزائش نسل کے لیے متبادل راہوں کی جستجو کر رہی ہیں، خاص طور پر وہ عورتیں جو جنسی محرومی یا تشنگی کا شکار ہیں۔ان عورتوں کی اپنی جنسی ترجیحات ہیں۔ان کی اپنی منشا اور مرضی ہے۔وہ صرف مردوں کی جنسی خواہشات کی غلام بن کر یا بستر کی حرارت بن کر نہیں رہنا چاہتیں بلکہ اپنے مساوی حقوق کے لیے نبرد آزما ہیں۔''

احمد عارف کے افسانوں میں خواتین کے حقوق و مساوات، جنسی محرومی و تشنگی کے پس پردہ یہ سوالات بھی پوشیدہ ہیں کہ اگر جنس ضرورت کے درجے سے نکل کر خواہشات کی حدود کو چھونے لگتی ہے تو انسانی جبلت تلاطم بلاخیز سے دوچار ہوتی ہے پھر انسانیت حیوانیت کے درجے میں داخل ہوجاتی ہے۔ ان کے افسانے حمل سرائے، بالغ نظر، بددعا، اب بولو، ایک بار اور، اور ریپ انھیں تشویشناک حالات کی صورت گری کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔عہد حاضر میں جنسی خواہشات کو وہ اپنی سبھی خواہشات سے نکال کر درجہ منتہا تک لے جانے کی کوشش میں ان ساری چیزوں کو طاق نسیاں بنا کر انسانیت سے مبرا ہوگیا ہے ایسی انسانیت جس میں اخوت و بھائی چارگی، اخلاق، محبت والفت کے ساتھ ساتھ احساسات و جذبات کی بھی کارفرمائی ہے۔ اسی طرح انھوں نے تادیبی نقطہ نظر کو اپنا محور بناتے ہوئے اس کے پس پردہ ان وجوہات کو بھی تلاش کرنے کی کوشش کی ہے جو عورتوں کو معاشرتی تحفظ دینے سے قاصر ہوتے ہیں بطور خاص ایسی عورتیں جو مطلقہ یا بیوہ ہوتی ہیں۔اسی طرح انھوں نے نئی تہذیبی و ثقافتی اقدار کو پیش کرنے کی بھی کوشش کی ہے جس میں خودشناسی، بیداری، سنجیدگی، رواداری اور سخاوت وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔

حقانی القاسمی کے بقول ''اگر احمد عارف کے افسانوں کی تانیثی قرات کی جائے تو عورتوں کی بدلتی باغیانہ سوچ کا بھی اندازہ ہوسکتا ہے کہ جدید دور کی عورت مساوی حقوق اختیار اور آزادی چاہتی ہے۔'' آزادی اور مساوی حقوق کا تعلق جہاں تک ہے درست ہے مگر ان کے افسانوں کی قرات استفہامیہ طرز ادا سے کی جائے تو یہ بھی سوال اٹھتا ہے کہ آزادی کیسی ہونی چاہیے؟ کیا حاوی جنسیت ہی آزادی ہے؟ کیا عورت کا انتخاب معطی ہی آزادی ہے؟ کیا جنسی آوارگی ہی آزادی ہے؟ کیا جنسی اضطراب و ناآسودگی کو اپنے تئیں آسودہ کرنا ہی آزادی کے زمرے میں شامل کیا جاسکتا ہے؟ یہ آزادی نہیں بلکہ عورت کی عزت کا جنازہ ہے۔ان کی تحریر میں اس بات پر بھی تفکر نظر آتا ہے کہ کیا ہماری یونیورسٹیاں ایک مہذب اور باشعور شہریت کی ثقافت کے قیام اور ملکی قوت جیسے اہم مقاصد کو پایہ تکمیل تک پہنچانے والے نوجوان تیار کرنے سے محروم ہیں؟ ایسی تعلیم سے کیا حاصل جو اقوام عالم میں مسابقتی حس سے محروم ہو اور خودشناسی وخوداعتمادی کے لباس اتار کر ہیجانی جذبات جیسے جملہ امراض میں ملوث ہو رہی ہو اور معیشت روزگار سے دور ہو رہی ہو یہ انتہائی افسوسناک مراحل ہیں۔ یہ فکر ان کے افسانہ 'ایک کمرے والا مکان' میں نظر آرہی ہے۔ بے روزگاری کے سبب نسل نو اپنا مطلوبہ کردار سمجھنے سے قاصر ہے۔ اس کو اس بات کا ادراک نہیں ہو رہا ہے کہ صحت مند سماج کی تعمیر میں اس کا کردار کیا ہے؟ حقیقت تو یہ ہے کہ تعلیم یافتہ نوجوان کی تعداد میں تسلسل اور تیز رفتاری کے ساتھ اضافہ کے باوجود بھی ہماری قوم ہنوز ناپختہ، جذباتی، اضطرابی اور ہیجان انگیزی کا شکار ہے، جس کی وجہ سے تہذیب وثقافت میں مسلسل گراوٹ نظر آرہی ہے۔

زیر تبصرہ کتاب میں موصوف کے افسانوں کو ہندوستانی تہذیب وثقافت، معاشرتی اور اخلاقی گراوٹ کو مرکزیت حاصل ہے۔اگر بہ نظر غائر ان کے افسانوں کا مطالعہ کیا جائے تو جنسیت، تانیثیت اور حقوق نسواں سے پرے وہ وجوہات سامنے آئیں گی جو اس بے راہ روی کا سبب بنیں۔ان کے یہ افسانے ایک حساس قاری کو تلذذ میں مبتلا کرنے کے بجائے تفکر میں مبتلا کردیں گے۔

کھکشاں

مصنفہ: ماریہ سعید

صفحات: 96، قیمت: 80 روپے، اشاعت: 2018

ناشر: ہدایت پبلشرز، شاہین باغ جامعہ نگر، نئی دہلی 25

مبصر: ڈاکٹر رخشندہ روحی مہدی 115 اے، پاکٹ اے، ڈی ڈی اے فلیٹس، سکھدیو وہار نئی دہلی 25

'کہکشاں' اعظم گڑھ کے ایک دینی مدرسہ جامعۃ الفلاح (کلیۃ البنات) میں درجہ عربی ششم کی طالبہ ماریہ سعید کی کاوش ہے جن کی عمر ابھی صرف 17 سال ہے۔ میں نے ایک ہی نشست میں تمام کہانیاں پڑھ ڈالیں۔ ہر کہانی الگ انداز میں الگ بات کہتی ہے۔ ہر کہانی میں انسانیت کا پیغام پنہاں ہے۔ المیہ یہ ہے کہ اس طرح کی سبق آموز کہانیاں اب ہم لوگوں نے لکھنا بند کردی ہیں۔ ہم ہر وقت یہ راگ الاپتے رہتے ہیں کہ اردو ادب قاری سے محروم ہے۔ کیا کبھی ہم یہ فکر کرتے ہیں کہ وہ قلمکار کہاں ہے جو دلوں پہ اپنے قلم سے کوئی تحریر کندہ کر کے دیرپا اثر چھوڑ سکے۔ مجھے اقرار کرتے ہوئے ازحد خوشی ہو رہی ہے کہ ماریہ سعید نے اپنی کتاب میں قلم سے اثر پیدا کیا ہے اور اپنی بات کو رواں دواں زبان کے ذریعہ دلوں تک بخوبی پہنچایا ہے۔ ان کی تخلیق 'کہکشاں' دورِ جدید میں لکھی جانے والی دیگر کہانیوں سے اس طرح منفرد ہے کہ تمام کہانیاں متفکرین و روحانی پیشواؤں کے واقعات پہ مبنی ہیں۔ اس کتاب کی 34 کہانیاں زندگی کے کسی نہ کسی شعبے کا احاطہ کرتی ہیں اور زندگی کو محنت اور صبر و استقامت سے جینے کی ترغیب دیتی ہیں۔

ماریہ دلکش زبان و بیان سے ان واقعات میں صوفیائے کرام کے درویشانہ طرز زندگی کا لائحہ عمل پیش کرتی ہیں۔ صوفیا اس کائنات کے ذرہ ذرہ میں ربِ کریم کا نور نہاں پاتے ہیں اور اسی لیے ہر ذی روح کو اللہ کا بندہ مانتے ہوئے بلا تفریق اس سے محبت کا پیغام دیتے ہیں۔ ماریہ نے ان کہانیوں میں اسی صوفیانہ روش کی آبیاری کی ہے جو فی زمانہ گرتی ہوئی انسانی قدروں کی بقا کے لیے ازحد ضروری ہے۔ 'اللہ کے نام پر' حضرت جنید بغدادی کے ایک حجام سے اخلاق کا درس لینے کا واقعہ ہے تو 'مولا! تیرا شکر ہے' سری سقطی کی دریا دلی اور رحمٰن الرحیم کی پاک ذات میں ان کے عقیدے کی گہرائی کا ذکر، جبکہ 'سعی لاحاصل' میں چڑیا کی زبانی امام غزالی کو خالقِ کونین کی عظمت و رفعت کا اعتراف کرایا گیا ہے جنہوں نے اپنی ایک ہزار کتابوں کو دریا برد کردیا۔ 'بہشتی گھروندہ' میں رب سے حقیقی محبت کا سبق خلیفہ ہارون رشید کے سچے واقعہ سے دیا گیا ہے جس کا یہ جملہ 'بے غرض محبت رب سے ہو یا کسی اور سے ہمیشہ کارگر ہوتی ہے' حاصلِ کہانی ہے۔ افراتفری و نفسانفسی کے عہد میں ماریہ سعید کے قلم سے نکلی یہ بات بے غرض اور پرخلوص بے لوث محبت کے عمل کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ 'سرِ تسلیم خم ہے' میں معراج کے سفر میں خوشبو سے خدائے برتر کے حضور سرِ تسلیم خم کرنے کے جذبے کی نشاندہی کی گئی ہے تو 'آواز کی گونج' میں گراموفون کی ایجاد اور سارے عالم میں اذان کی بازگشت کا تذکرہ ہے۔ 'نیکی کا صلہ' میں بتلایا گیا ہے کہ پنسلین کے موجد معروف سائنسداں الیگزینڈر فلیمنگ کو دوسروں کی مدد کا صلہ ملا اور وہ اعلیٰ تعلیم سے آراستہ ہوئے۔ 'وقت وقت کی بات' میں پری، جن اور بادشاہ کے طلسماتی کردار دل میں ترنگ پیدا کردیتے ہیں۔ اسی کہانی میں 'پڑولا' مٹی اور کاغذ کو گلا کر بنایا گیا مرتبان دلچسپی کا باعث ہے۔

'کالج' اور 'گراہک' جیسے انگلش اور ہندی زبان کے الفاظ کا برمحل استعمال کہانیوں میں اکثر ملتا ہے۔ زبان ادبی اور شائستہ ہے۔ کہیں کہیں زبان و بیان میں مشکل الفاظ سے عام قاری کے پڑھنے میں دشواری کا احساس ہوتا ہے۔ کہانی کی زبان سہل اور عام فہم ہو تو ہر طرح کا قاری اس سے لطف اندوز ہوسکتا ہے۔ کہانیوں میں روانی اور پختگی اس بات کی دلیل ہے کہ ماریہ سعید مستقبل میں بہترین افسانہ نگار ثابت ہوسکتی ہیں۔ ان کی تحریر کی گونج ابھی سے انھیں نئی پہچان دے رہی ہے۔ بظاہر 'کہکشاں' کہانیوں کی چھوٹی سی کتاب ہے جس کی اہمیت اس کی ضخامت سے کہیں زیادہ بڑی ہے۔ اس نوعمری میں یہ ایک بڑا کارنامہ ہے بلکہ اردو افسانے میں ایک قیمتی اضافہ ہیں ماریہ سعید۔ خدا کرے وہ ادب میں نئی منزلیں سر کرتی جائیں اور ایک بہترین کہانی کار کے طور پر اپنی منفرد پہچان بنائیں۔ ماریہ سعید کے تخلیقی سفر کے لیے ڈھیروں دعائیں اور مبارک باد۔

شاعری

تشنہ لب سفر

شاعر: جنوں اشرفی

صفحات: 176، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2018

ناشر: حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: ساحر داؤدنگری، حالی پبلشنگ ہاؤس، 6/275، للیتا پارک، لکشمی نگر، دہلی 92

عہد حاضر میں جب اختصاص کی روش نے فنون لطیفہ بالخصوص شاعری، مصوری اور موسیقی کے مابین فاصلوں کی دیوار کھڑی کردی ہو۔ موسیقار اور مصور بڑی حد تک ایک دوجے سے اجنبی ہوگئے ہوں۔ جنوں اشرفی کے تعلق سے یہ بات نہایت اعتماد کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ وہ جس کیفیت کے ساتھ اشعار کہتے ہیں وہ سوز دروں، وہ گداز، وہ لطافت، وہ ندرت دیکھنے کے لائق ہوتی ہے۔ شعری سطح پر اپنے ہشت پہلو اور گوناگوں اوصاف کی بدولت وہ اپنے ہم عصروں سے منفرد نظر آتے ہیں۔ تحریکوں کے عروج و زوال اور نظریات کی شکست و ریخت کے عمل نے جو موجودہ تصویر پیش کی ہے وہ گمان سے باہر ہے۔ غزل کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے شاعر نے اپنی ہمہ گیر صلاحیت کا سہارا لیا ہے۔ غزل فنی، لسانی اور قواعدی اعتبار سے قابل مطالعہ ہی نہیں قابل اعتبار بھی ہے۔ جنوں اشرفی کی شاعری پر گفتگو کرتے ہوئے عمران عظیم فرماتے ہیں۔

''انھوں نے اپنی شاعری میں اپنے جذبات و احساسات اور دلی واردات کا اظہار جس سلیقے سے کیا ہے وہ لائق مطالعہ ہے۔ ان کی لفظیات و تراکیب سے شگفتگی کا احساس ہوتا ہے۔ عصری شعور کی حامل ان کی غزلیں عہد حاضر کے نئے موضوعات اور روزمرہ کے مسائل کی ترجمانی کرتی نظر آتی ہیں۔ سماجی، نفسیاتی، معاشی اور سیاسی ہر رویے کی پرچھائیں ان کی شاعری میں جابجا دیکھنے کو ملتی ہے۔''

جنوں اشرفی نے اپنے تخلیقی احساس و ادراک کو اپنے مطالعے کا محور و مرکز بنایا ہے۔ وہ نجی محسوسات و مشاہدات کے ساتھ ہم عصر کرب، نیرنگی زمانہ اور گردش ایام کو بھی اپنی شاعری کا حصہ بنالیتے ہیں۔ وہ خود کو ماحول سے الگ کرسکتے ہیں نا ہی ماحولیات سے۔ ان کی شاعری اپنے قاری کو دعوت غور و فکر دیتی ہے۔ ملاحظہ کریں کچھ اشعار:

تذبذب میں پڑا کب سے سفر ہے　　نہ منزل ہے نہ ہے رستہ ہمارا
جو ہوسکے تو قدم روک لو ہواؤں کے　　دیا بجھا تو اجالوں کا پھر سوال کہاں
کس دشت بے پناہ میں لے آئی زندگی　　دیوار سایہ دار نہ اشجار سامنے
مشکلیں کرنے لگیں میرا طواف　　الجھنوں کا مجھ کو محور کردیا
حسد، ضد، جلن، بغض و نفرت کی دولت　　یہ کچھ بھی نہیں تھا رقابت سے پہلے
وصال یار کی معراج ہوگا　　ہمارا عاشقی میں خار ہونا
سینے میں تیر چبھ گیا آکر کمان سے　　واپس ہوئی نہ بات جو نکلی زبان سے
وہی میں ہوں وہی موسم تو پھر کیوں　　تری آنکھوں میں حیرانی بہت ہے

یہ بات بلا مبالغہ کہی جاسکتی ہے کہ ان کی غزل کا ہر شعر یاد رہ جانے والا ہے۔ وہ اپنی شاعری میں آس پاس کی زندگی، سماجی احوال و کوائف زمانہ اور انسانی معاملات کا رس بھی بھر دیتے ہیں۔ کتاب شعر و فن پر انفرادی حیثیت کی حامل ہے۔ جس سنجیدگی کے ساتھ انھوں نے اشعار تخلیق کیے ہیں، اسی اعتبار سے ان کے قاری نے اپنی یادداشت کا حصہ بنانے کی کوشش کی ہے۔

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں
خبرنامہ

National Council for Promotion of Urdu Language
राष्ट्रीय उर्दू भाषा विकास परिषद

سردار ولبھ بھائی پٹیل نے ایک مضبوط اور مستحکم ہندوستان کی تعمیر کی

یوم قومی یکجہتی پر قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد کا خطاب

نئی دھلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے دفتر میں آج 'یوم قومی یکجہتی' کے موقع پر قومی اتحاد کا حلف لیا گیا۔ اس موقع پر قومی کونسل کے ڈائریکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے سردار ولبھ بھائی پٹیل کی قومی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ سردار ولبھ بھائی پٹیل نے ہندوستان کی تمام ریاستوں کو متحد کرکے ایک مضبوط متحدہ ہندوستان کو ہم دیکھ رہے ہیں، وہ انہی کی بے پناہ کوششوں کا نتیجہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ ولبھ بھائی پٹیل مرد آہن اور زمین سے جڑے ہوئے سچے قوم پرست تھے۔ مہاتما گاندھی سے انھیں بے حد عقیدت تھی اور ان کے لیے انھوں نے بے شمار قربانیاں بھی دیں۔

قومی کونسل کے ڈائریکٹر نے اپنے خیالات کا تاکہ ہر طرف ملک میں امن وسلامتی کی ہوائیں چلیں اور ملک روز بروز ترقی کی طرف رواں دواں رہے۔ انھوں نے وزیر اعظم نریندر مودی کے ذریعے ولبھ بھائی پٹیل کے 182 میٹر بلند مجسمۂ اتحاد کے نصب کیے جانے پر کہا کہ ان کا یہ کارنامہ ہندوستان کی تاریخ میں یاد رکھا جائے گا اور موجودہ اور آنے والی نسلیں اس سے محبت و یگانگت اور اتحاد

ہندوستان کی تعمیر کی۔ انھوں نے بلاتفریق مذہب وملت تمام ہندوستانیوں کے اتحاد پر بھی زور دیا اور اس کے لیے عملی کوششیں بھی کیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ آج جس اظہار کرتے ہوئے مزید کہا کہ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ولبھ بھائی پٹیل کی خدمات کو یاد کیا جائے اور ان کے نقش قدم پر چل کر ملک سے سچی محبت بھی کی جائے و یکجہتی کی ترغیب حاصل کرتی رہیں گی۔ اس کے بعد کونسل کے جملہ اسٹاف نے دوڑ برائے خیر سگالی میں بھی حصہ لیا۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 31/ اکتوبر 2018

اقلیتی اداروں کو حکومت کی اسکیموں سے فائدہ اٹھانا چاہیے: شیخ عقیل احمد

نئی دہلی: قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے فروغ اردو کے ساتھ ساتھ اقلیتی اداروں کو حکومت کی اسکیموں سے فائدہ اٹھانے کی ترغیب دیتے ہوئے کہا کہ اقلیتوں کو تعلیمی اور دیگر شعبوں میں دوسرے طبقوں کے مساوی حقوق فراہم کرنا حکومت کی ایک آئینی ذمہ داری ہے۔ ملک کی ترقی میں اقلیتی طبقے کی ترقی بھی ضروری ہے۔ بھارت اس وقت تک پوری طرح ترقی یافتہ نہیں بن سکتا جب تک ملک کی اقلیتیں ترقی نہ کرلیں۔ مرکزی حکومت نے سچر کمیٹی کی سفارشات کو قابل نفاذ بنانے اور اس پر عمل آوری کے مختلف اقدامات کیے ہیں۔ گیارہویں پنچ سالہ منصوبے میں بھی تعلیم کی اہمیت وافادیت

پر خصوصی توجہ دی گئی ہے اور اس بات کو یقینی بنانے کی کوشش کی گئی ہے کہ ملک کی آبادی کے اس بڑے حصے میں تعلیمی بیداری پیدا کی جائے اور انھیں خود کفیل بنایا جائے۔

ملک کی اقلیتوں میں مسلمان سب سے زیادہ پسماندہ اور پچھڑے ہوئے ہیں۔ انھیں قومی تعلیمی دھارے سے جوڑنے کے لیے وزارت برائے فروغ انسانی وسائل نے مختلف اقدامات کیے ہیں جن میں سروشکشا ابھیان، اردو ٹیچروں کی بحالی کو ممکن بنانے، ووکیشنل ٹریننگ مہیا کرانے وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ تین مرکزی یونیورسٹیوں میں اردو میڈیم کے اساتذہ کی پیشہ ورانہ ترقی کے لیے تربیتی مراکز بھی قائم کیے گئے ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ حکومت ہند کی وزارت برائے فروغ انسانی وسائل کے تحت اقلیتی اداروں میں بنیادی سہولیات کے فروغ کی ایک اسکیم چلائی جاتی ہے جس میں اقلیتی اداروں کو بنیادی ڈھانچے کی تعمیر اور فراہمی کے لیے حکومت مالی امداد دیتی ہے۔ یہ اسکیم پورے ملک کے اقلیتی ارتکاز والے بلاکوں میں چلائی جاتی ہے۔ گیارہویں پنچ سالہ منصوبے کے تحت اس اسکیم کے لیے حکومت نے 125 کروڑ روپے مختص کیے ہیں۔ جس کے ذریعہ اقلیتی تعلیمی اداروں، ابتدائی، ثانوی اور سکنڈری اسکولوں میں بنیادی سہولیات کی تعمیر کے لیے ہونے والے خرچ کا 75 فیصد حکومت دے گی۔ اس اسکیم کے تحت ایک ادارہ زیادہ سے زیادہ 50 لاکھ روپے کی مالی امداد حاصل کرسکتا ہے۔ اس پروگرام کے تحت علیحدہ کلاس روم، سائنس وکمپیوٹر لیب، لائبریری روم، بیت الخلا کی تعمیر اور پینے کے صاف پانی کی فراہمی وغیرہ شامل ہے۔ اسکول کے طالب علموں خصوصاً لڑکیوں کے لیے ہاسٹل کی تعمیر بھی اس اسکیم کا حصہ ہے۔ اس پروگرام کے تحت کم از کم تین سال پرانی غیر سرکاری تنظیمیں، ٹرسٹ، ادارے اور ایسے اسکول جو ریاستی یا مرکزی حکومت سے منظور شدہ ہوں درخواست دے سکتے ہیں۔ اسکولوں میں کم سے کم تین سال سے تعلیم دی جارہی ہو اور اقلیتی طلبا کی قابل لحاظ تعداد ہو۔ یہ درخواست ریاست کے متعلقہ سکریٹری کو دی جاسکتی ہے۔ مرکز کی یہ اسکیم ریاستی حکومت کی مدد سے مختلف ضلعوں میں چلائی جاتی ہے۔ ریاستی سطح کی ایک کمیٹی ان درخواستوں پر غور کرتی ہے اس کے بعد وہ مرکزی حکومت کو گرانٹ کے لیے سفارشات بھیجتی ہے۔ جس پر مرکزی حکومت کی تشکیل کردہ ایک کمیٹی حتمی فیصلہ لیتی ہے۔ اس سلسلے میں مزید جانکاری فروغ انسانی وسائل کی ویب سائٹ سے حاصل کی جاسکتی ہے۔ جس کا ویب ایڈریس یہ ہے۔ www.mhrd.gov.in/idmi. اقلیتوں کو چاہیے کہ حکومت کی مختلف اسکیموں سے فائدہ اٹھائیں اور ان پروگراموں اور اسکیموں کی جانکاری زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچائیں۔ پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 2/نومبر 2018

مدارس میں زیادہ سے زیادہ کمپیوٹر مراکز دیے جائیں گے: ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

ملک کے مختلف مدرسہ بورڈوں کے چیئرمین کی میٹنگ میں قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر کا خطاب

نئی دہلی: قومی اردو کونسل کے صدر دفتر 'فروغ اردو بھون' میں ملک کے مختلف مدرسہ بورڈ کے عہدیداروں کی ایک میٹنگ کا انعقاد کیا گیا۔ میٹنگ میں قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے سبھی مہمانان کا استقبال کیا اور اس میٹنگ کی غرض وغایت بیان کی۔ انھوں نے مدرسوں میں دی جارہی موجودہ تعلیم پر روشنی ڈالی اور مدرسہ ایجوکیشن میں بہتری لانے پر زور دیا۔ انھوں نے کہا کہ تمام مدارس کی ایک ڈائرکٹری تیار ہونی چاہیے جس سے مدارس، مدرسین اور طلبہ کی تعداد کا اندازہ ہو تاکہ حکومت کی اسکیموں کے نفاذ میں آسانی ہو۔ انھوں نے کہا کہ قومی اردو کونسل ملک کے مختلف مدرسہ بورڈوں کے ساتھ مل کر فروغ اردو کی ایک حکمت عملی ترتیب دے گی۔

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے مزید کہا کہ میرا اندازہ ہے کہ ملک میں سرکاری اسکولوں کے مقابلے مدارس کی تعداد زیادہ ہے۔ اگر مدرسوں میں کمپیوٹر اور جدید ٹکنالوجی کی تعلیم بھی دی جائے تو یہ ہمارے معاشرے کے حق میں نیک فال ثابت ہوگا۔ مدارس والے کہیں نہ کہیں اس وہم میں مبتلا ہیں کہ اگر مدارس میں عصری تعلیم دی جائے گی تو مدارس کو حکومت اپنے قبضے میں لے لے گی۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ایسا کچھ نہیں ہونے والا۔ حکومت مسلمانوں کی ترقی کی خواہاں ہے اور ملک کے اس بڑے طبقے میں تبدیلی لانا چاہتی ہے۔ پورے ہندوستان کی ترقی تب ہی ممکن ہے جب ملک کے ہر طبقے کی ترقی ہوگی۔ انھوں نے سرسید کی مثال پیش کرتے ہوئے کہا کہ اگر سرسید نے مسلمانوں کو عصری تعلیم کی جانب راغب نہیں کیا ہوتا تو آج ملک کے مسلمانوں کی حالت اور خراب ہوتی۔

مدھیہ پردیش مدرسہ بورڈ کے چیئرمین پروفیسر سید عمادالدین نے مدارس میں زیادہ سے زیادہ کمپیوٹر مراکز دینے کی تجویز پیش کی جس پر کونسل کے ڈائرکٹر نے کہا کہ قومی اردو کونسل مدارس میں زیادہ سے زیادہ کمپیوٹر مراکز کھولنے کی کوشش کرے گی تاکہ مدارس کے طلبا بھی عصری تعلیم اور ٹکنالوجی سے فائدہ اٹھاسکیں۔ راجستھان مدرسہ بورڈ کی چیئرپرسن مہرالنسا ٹاک نے مدارس کے اساتذہ کی تربیت کے حوالے سے تجویز پیش کی کہ مدارس کے اساتذہ کی تربیت کا انتظام قومی اردو کونسل کی جانب سے کیا جائے۔ جس پر ڈائرکٹر نے کہا کہ کونسل اس سلسلے میں پیش رفت کرے گی۔ حاجی اخلاق احمد ڈپٹی رجسٹرار (ایجوکیشن)، اتراکھنڈ نے کہا کہ مدارس میں کئی برسوں سے SPQEM اسکیم کا فنڈ نہیں دیا گیا ہے اس بارے میں بھی حکومت کو غور کرنا چاہیے۔

اس میٹنگ میں مدارس میں ای لائبریری کے قیام، اردو اساتذہ اور اردو کتابوں کی فراہمی، ملک کے تمام مدارس کے نصاب میں یکسانیت، مدرسہ ایجوکیشن

قومی اردو کونسل کے صدر دفتر میں ملک کے مختلف مدرسہ بورڈ وں کے چیئرمین کی قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر کے ساتھ میٹنگ کا منظر

بورڈ میں کمپیوٹر سنٹر کا قیام جیسے موضوعات پر بھی غور وخوض کیا گیا۔

اس میٹنگ میں مدھیہ پردیش مدرسہ ایجوکیشن بورڈ کے چیئرمین پروفیسر سید عمادالدین، راجستھان مدرسہ بورڈ کی چیئرپرسن مہرالنسا ٹاک، مغربی بنگال مدرسہ بورڈ کے صدر ایس کے ابو طاہر قمرالدین، اوڈیشہ مدرسہ بورڈ کے چیئرمین لئیق الدین احمد، چھتیس گڑھ مدرسہ بورڈ کے چیئرمین مرزا اعجاز بیگ موجود تھے۔

پریس ریلیز، رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 5 نومبر 2018

قومی اردو کونسل کے صدر دفتر میں قاضی عبدالستار کے انتقال پر تعزیتی نشست

نئی دھلی: ممتاز فکشن نگار پدم شری قاضی عبدالستار کے انتقال پر گہرے دکھ کا اظہار کرتے ہوئے قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے کہا کہ قاضی عبدالستار کی وفات سے اردو فکشن کے ایک روشن باب کا خاتمہ ہوگیا۔ ان کی تخلیقی نثر میں جو جزالت اور قوت تھی اس سے ان کے بیشتر معاصرین محروم تھے۔ ان کا ہر لفظ بولتا ہوا سا لگتا تھا۔ انھوں نے اردو فکشن کو اقدار پر مبنی تہذیبی منظرنامے سے روشناس کرایا۔ زبان وبیان کی قوت سے اردو فکشن کو مالا مال کیا۔ ان کا بیانیہ ان کے ہمعصر ناول نگاروں سے مختلف ہے۔ انھوں نے زمیندارانہ نظام کی بہت ہی خوبصورت انداز میں عکاسی کی ہے۔ ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے قاضی عبدالستار کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ انھوں نے اردو کو بہت سے اہم تاریخی ناول دیے ہیں جن میں دارا شکوہ، صلاح الدین ایوبی، خالد بن ولید قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ شب گزیدہ، حضرت جان، تاجم سلطان ان کے اہم ناول ہیں

جو معاصر تنقیدی ڈسکورس کا حصہ ہیں۔ وہ صرف فکشن نگار نہیں تھے بلکہ ادب کے عمدہ پارکھ بھی تھے۔ ان کے بہت سے تنقیدی فقرے آج بھی زبان زد خاص وعام ہیں۔ اردو شاعری میں قنوطیت، جمالیات ان کی اہم تحقیقات ہیں۔ ان کے شخصی کوائف پر روشنی ڈالتے ہوئے قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر نے کہا کہ قاضی عبدالستار ایک سچے اور کھرے آدمی تھے۔ انھیں اپنی حق گوئی اور صداقت بیانی کا خمیازہ بھی بھگتنا پڑا لیکن انھوں نے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا۔ انھوں نے اپنی کجکلاہی آخری سانس تک قائم رکھی۔ ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے کہا کہ قاضی صاحب نے مسلم یونیورسٹی کے صدر شعبۂ اردو کی حیثیت سے بہت اہم خدمات انجام دیں اور اپنے شاگردوں کی ایک ایسی نسل تیار کی جس پر پوری ادبی دنیا ناز کرسکتی ہے۔ ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے کہا کہ اردو فکشن کو قاضی عبدالستار کی جو عطا ہے اسے کبھی بھلایا نہیں جاسکتا۔ فکشن تنقید ان کے ذکر کے بغیر ادھوری رہے گی۔

قاضی عبدالستار کے انتقال کی خبر ملتے ہی قومی اردو کونسل کے صدر دفتر میں ایک تعزیتی نشست کا اہتمام کیا گیا جس میں کونسل کے جملہ اسٹاف نے شرکت کی اور دو منٹ کی خاموشی اختیار کر کے قاضی عبدالستار کو خراج عقیدت پیش کیا۔

پریس ریلیز، رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 29 اکتوبر 2018

قومی اردو کونسل کے مالی تعاون سے

اردو زبان اور سائنس: اشتراک و افتراق

سرینگر: (24 ستمبر) نظامت فاصلاتی تعلیم، جامعہ کشمیر کے زیر اہتمام قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے جزوی مالی اشتراک سے دو روزہ بین الاقوامی کانفرنس بعنوان 'اردو زبان اور سائنس، اشتراک و افتراق' کا

انعقاد مورخہ 24 اور 25 ستمبر 2018 کو عمل میں لایا گیا۔ اس کانفرنس کی افتتاحی نشست جامعہ کشمیر کے ہیومنٹیز بلاک کے آڈیٹوریم میں منعقد کی گئی۔ کانفرنس کی افتتاحی نشست میں رجسٹرار کشمیر یونیورسٹی پروفیسر نیلوفر خان نے صدارت کی جبکہ شیخ الجامعہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد پروفیسر محمد اسلم پرویز بطور مہمان خصوصی موجود رہے۔ ایوان صدارت میں نظامت فاصلاتی تعلیم کشمیر یونیورسٹی کے ناظم پروفیسر محی الدین سنگمی اور سابق ناظمہ پروفیسر شفیقہ پروین بھی شریک تھے۔ تقریب میں نظامت فاصلاتی تعلیم کشمیر یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے سربراہ اور منتظم کانفرنس ڈاکٹر الطاف انجم نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ اس کے بعد پروفیسر محمد اسلم پرویز نے کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ اردو اور سائنس کی اہمیت وافادیت کو اجاگر کیا۔ انھوں نے بچوں کی تربیت اور گھریلو زندگی میں شامل افراد کے کردار، ان کے مستقبل کے اثرات اور ممکنات سے متعلق دانشورانہ آرا اور قرآن کی روشنی میں بصیرت افروز معلومات فراہم کیں۔ اس دوران ڈاکٹر عرفان عالم کی کتاب 'اقبال: معروضی تجزیے اور سائنسی مباحث' کی رسم رونمائی انجام دی گئی۔ اس کے بعد ڈاکٹر نیلوفر خان نے اپنے صدارتی خطبہ میں کانفرنس کو منعقد کرنے پر منتظمین اور اراکین کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ اس طرح کی تقریبات علوم وفنون میں سودمند ثابت ہوتی ہیں۔ آخر میں نظامت فاصلاتی تعلیم کشمیر یونیورسٹی کی سابق ناظمہ ناہیدہ روحی نے تحریک شکریہ پر مہمانوں کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا۔ کانفرنس میں تکنیکی نشستوں کا باضابطہ طور پر آغاز ہوا جو بیک وقت کانفرنس ہال نظامت فاصلاتی تعلیم اور کانفرنس ہال شعبہ جغرافیہ میں منعقد کیے گئے۔ تکنیکی نشست اول کی صدارت پروفیسر محمد ظفر الدین (مولانا آزاد یونیورسٹی حیدرآباد)، ڈاکٹر آفاق عزیز، ڈاکٹر نثار احمد ترالی نے کی۔ اس موقعے پر کئی مقالے پیش کیے گئے۔ نظامت کے فرائض زاہد بشیر نے انجام دیے۔ اسی دوران متوازی نشست کی صدارت ڈاکٹر نذیر مشتاق اور ڈاکٹر ریاض توحیدی نے کی۔ اس نشست میں بھی مقالات پیش کیے گئے۔ نظامت کے فرائض صابر شبیر بڈگامی نے انجام دیے۔ ایک نشست کی صدارت ڈاکٹر نذیر مشتاق، شاد حسین اندرابی نے کی۔ اس نشست میں کئی مقالات پیش کیے اور نظامت کے فرائض فدا حسین وانی نے انجام دیے۔ دوسرے سیشن کی صدارت محمد ظفر الدین، ظہیر انصاری اور بنگلہ دیش سے آئے ہوئے پروفیسر شہید الاسلام نے کی۔ اس نشست میں بھی کئی مقالات پیش کیے گئے۔ نظامت کے فرائض شوکت احمد صوفی نے انجام دیے۔

دوسرے دن کی افتتاحی نشست کا آغاز پروفیسر اسلم پرویز نے 'سفر ہے شرط' کے عنوان سے اپنے پرمغز خطبے سے کیا۔ اس اجلاس میں شیخ الجامعہ، جامعہ کشمیر پروفیسر محمد طلعت احمد نے صدارت کے فرائض انجام دیے۔ کانفرنس میں مقامی، قومی اور بین الاقوامی سطح کے کئی ایک دانشوروں نے شرکت کی۔ ان میں پروفیسر ظفر الدین، پروفیسر شہید السلام، پروفیسر کلیم اللہ خان، ڈاکٹر نذیر مشتاق، ڈاکٹر مشتاق احمد گنائی، ڈاکٹر الطاف انجم، ڈاکٹر عرفان عالم، کانفرنس میں شریک رہے۔ اس موقعے پر پروفیسر طلعت احمد نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے نظامت فاصلاتی تعلیم کی اس نرالی کاوش کو سراہتے ہوئے کہا کہ ایسے پروگرام اردو زبان میں نئی روح پھونک دیتے ہیں اور اس طرح کے پروگرام اردو زبان کے لیے نہایت اہم ہیں۔ اس نشست کی نظامت، نظامت فاصلاتی تعلیم، جامعہ کشمیر کے ناظم پروفیسر محی الدین سنگمی نے کی۔ اس کے بعد کانفرنس کی تیسری دو تکنیکی نشستوں کا باقاعدہ آغاز بیک وقت فاصلاتی نظامت تعلیم اور جغرافیہ کے کانفرنس ہالوں میں ہوا جس میں کئی مقالات پڑھے گئے۔

کانفرنس کی چوتھی اور آخری دو تکنیکی نشستیں بیک وقت فاصلاتی نظامت تعلیم اور جغرافیہ کے کانفرنس ہالوں میں منعقد کی گئیں جن میں کئی اہم اور پرمغز مقالے پیش کیے گئے۔ حاضرین مجلس نے سیمینار کے منتظمین ڈاکٹر الطاف انجم اور ڈاکٹر عرفان عالم کے حسن انتظام کو خوب سراہتے ہوئے انہیں اس نوعیت کی تقاریب کے انعقاد کے لیے مبارک باد پیش کی۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر الطاف انجم، اسسٹنٹ پروفیسر اردو، نظامت فاصلاتی تعلیم کشمیر یونیورسٹی، 8 اکتوبر 2018

اردو اور تعلیم سے متعلق دیگر قومی اور علاقائی خبریں

قومی:

اردو، فارسی اور عربی میں تصوف کی روایت

نئی دهلی: جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں 'ورلڈ اردو ایسوسی ایشن' کے زیر اہتمام دو روزہ سیمینار ہوا، جس میں مختلف تعلیمی اداروں کے ریسرچ اسکالرس اور دانشوروں نے اردو، عربی اور فارسی ادبیات میں متصوفانہ روایت پر تبادلۂ خیال کیا۔ سیمینار کے پہلے دن تین نشستیں ہوئیں۔

پہلی نشست افتتاحیہ پر مشتمل تھی، جبکہ دو نشستوں میں اسکالرس نے مقالات پیش کیے۔ افتتاحی نشست میں مہمانِ خصوصی پروفیسر خان مسعود نے کہا کہ صوفیانہ خیالات کو فروغ دینے کی ضرورت ہے۔ پروفیسر عارف ایوبی نے کہا کہ تصوف کا سلسلہ انتہائی قدیم ہے۔ انھوں نے کہا کہ صوفیانہ اصطلاحوں کے تناظر میں ادب پر بہت کچھ لکھا گیا مگر اب تصوف کو سماج سے ہم آہنگ کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے پروفیسر مظفر عالم نے کہا کہ تصوف کے تناظر میں اردو، فارسی اور عربی کی ادبیات میں لطیف رشتہ ہے۔ تصوف کی روایت کو سمجھنے کے لیے ان تینوں زبانوں پر غور و فکر کرنا ضروری ہے۔ پروفیسر سید اختر حسین نے کہا کہ جانب داری اور خود غرضی کے اس دور میں تصوف کے بغیر سماج میں امن و سلامتی کی فضا قائم کرنا انتہائی مشکل ہے۔ پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے کہا کہ ادب و ثقافت کو فروغ دینے اور غیر ملکی ادب سے استفادہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم عالمی سطح پر کام کریں۔ افتتاحی نشست کی نظامت ڈاکٹر ایس خان نے کی، جبکہ دوسرے سیشن کی نظامت مہوش نور نے کی۔ اس سیشن کی صدارت پروفیسر سید اختر حسین، ڈاکٹر توحید خان اور ڈاکٹر محمد کاظم نے کی۔

تیسرے سیشن میں علی الترتیب پانچ اسکالرس نے مقالات پیش کیے۔ اس سیشن کی صدارت پروفیسر علی اشرف، پروفیسر عارف ایوبی اور ڈاکٹر سمیع الرحمٰن نے کی اور نظامت کے فرائض امتیاز رومی نے انجام دیے۔

سیمینار کے دونوں سیشنوں میں بڑی تعداد میں مفکرین ادب اور ریسرچ اسکالرس نے اپنے اپنے مقالات پیش کیے۔ ساتھ ہی ساتھ باضابطہ مباحثہ سیشن کا اہتمام کیا گیا، جس میں متعدد تعلیمی اداروں کے اسکالرس نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور متصوفانہ ادب کے متعدد پہلوؤں پر تبادلۂ خیال کیا۔ اس موقعے پر پروفیسر خواجہ محمد اکرام نے متصوفانہ اور اسلامی شاعری کے مابین پائے جانے والے لطیف رشتوں پر گفتگو کی۔ ڈاکٹر مہتاب عالم نے کہا کہ علاقائی سرحدوں میں صوفیوں کا سلسلہ محدود ہو گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جنوب کے بہت سے صوفی شعرا سے شمال کے بہت سے افراد ناواقف ہیں، اسی طرح شمالی ہند کے بے شمار صوفیا کے متعلق جنوب کے بہت سے افراد علم نہیں رکھتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ تصوف کے معاملات کو بھی ملکی اور عالمی سطحی پر سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ اختتامی نشست میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے نو منتخب ڈائرکٹر شیخ عقیل احمد نے کہا کہ مرکزی حکومت چاہتی ہے کہ قومی اور ملکی سطح پر تصوف کو فروغ دیا جائے، تاکہ عالمی سطح پر امن و آشتی کا ماحول پیدا ہو سکے۔ انھوں نے مزید کہا کہ اب نہ صرف دانشوروں اور پروفیسروں کے معاملات پر توجہ دی جائے گی، بلکہ ریسرچ اسکالرس کی تربیت بھی اہم ایشو ہوگا، تاکہ وہ مستقبل میں بہترین اساتذہ بن سکیں۔ غور طلب ہے کہ ورلڈ اردو ایسوسی ایشن کے بینر تلے منعقد ہونے والے دو روزہ قومی سیمینار کو فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی لکھنؤ، چشتی فاؤنڈیشن اجمیر شریف اور انسٹی ٹیوٹ آف انڈو پرشین اسٹڈیز کا تعاون حاصل تھا۔ دو روزہ قومی سیمینار میں یہ محسوس کیا گیا کہ تلفظات کی سطح پر عام طور پر غلطیاں ہوئیں، اس لیے پروفیسر خواجہ اکرام نے دو دن کے ورکشاپ کے انعقاد کی تجویز رکھی جس پر قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر شیخ عقیل احمد نے اپنے ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اسے ہم کونسل کی جانب سے پورا تعاون پیش کریں گے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 8-17 اکتوبر 2018

اردو شاعری کی بابت سائنسی تحقیق

نئی دهلی: اردو شاعری کے کمالات کا سائنسدانوں نے بھی اعتراف کر لیا ہے۔ ہندوستان کے بہت بڑے اخبار ٹائمز آف انڈیا نے سرخی جمائی ہے اردو اشعار دماغ کے لیے اکسیر ہیں۔ لکھنؤ میں سائنسی تحقیق کا ایک ادارہ ہے جو سنٹر فار بائیو میڈیکل ریسرچ کہلاتا ہے۔ وہ اپنی ایک حالیہ تحقیق کے دوران اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ اردو شاعری پڑھنے سے صرف یہی نہیں کہ دل کو راحت ملتی ہے بلکہ یہ بھی کہ اردو اشعار کے مطالعے سے انسانی دماغ کی کتنی ہی صلاحیتیں فروغ پاتی ہیں۔ سائنس داں کہتے ہیں کہ غزل کے مطالعے سے دماغ کے وہ اگلے حصے متحرک ہوتے ہیں جن حصوں سے دماغ سوچنے سمجھنے کا کام لیتا ہے، مثلاً فیصلہ کرنا، اچھے اور برے میں تمیز کرنا، جذبات پر قابو پانا، ذہنی دباؤ سے نمٹنا، اطلاعات کی چھان پھٹک کرنا اور ان کو ترتیب سے لگانا۔ وہ کہتے ہیں کہ اردو پڑھنے سے بڑھاپے کے ایک مرض کی روک تھام ہوتی ہے، وہ مرض جس میں انسان بھولنے لگتا ہے۔ یہی نہیں، وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اردو پڑھنے سے ان بچوں کو مدد ملتی ہے جنھیں نئی نئی چیزیں سیکھنے میں دشواری ہوتی ہے۔ ادارے کے سائنس داں اتم کمار نے دماغ سے نکلنے والی مقناطیسی لہروں کے نقشے بنا کر یہ سارے نتیجے نکالے ہیں۔ تحقیق کا یہ طریقہ آج کل ساری دنیا میں رائج ہے۔ اتم کمار نے ایک دلچسپ بات بتاتے ہوئے کہا کہ دماغ سے نکلنے والی شعاعوں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ کون سی زبان سیکھنا آسان اور کون سا رسم الخط سیکھنا مشکل ہے۔ ان کو معلوم ہوا کہ دماغ ہندی اور جرمن جیسی زبانیں

آسانی سے اور انگریزی اور فرانسیسی مشکل سے سیکھتا ہے۔ معلوم ہوا کہ ان میں سب سے زیادہ مشکل زبان اردو ہے، اسے پڑھنے کے عمل میں دماغ کے اور کئی حصے متحرک ہوتے ہیں اور یہ بات دماغی صحت کے لیے اچھی ہے۔ اردو پڑھنے میں دو اور بھی فائدے ہیں، ایک یہ کہ اس کے حروف پیچیدہ ہیں دوسرے یہ دائیں سے بائیں جانب لکھی جاتی ہے جو دماغ کی ورزش کے لیے سودمند ہے۔ اسے پڑھتے ہوئے انسانی دماغ کے درمیانی اور اعلیٰ قسم کے اگلے حصے حرکت میں آتے ہیں اور توانائی پاتے ہیں۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 15 اکتوبر 2018

ہندوستان میں زبان وتہذیب

نئی دھلی: ممتاز نقاد اور جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے ہندوستانی زبانوں کے مرکز کے سابق چیئرپرسن پروفیسر انور پاشا کو تاشقند یونیورسٹی میں بطور ویزیٹنگ پروفیسر مدعو کیا گیا تھا۔ جہاں مختلف اہم موضوعات پر ان کے لکچر ہوئے۔ پروفیسر پاشا نے نہ صرف اردو زبان وادب کے حوالے سے بلکہ ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کے حوالے سے بھی کئی اہم لکچر دیے۔ ازبکستان کے سینئر اساتذہ کے علاوہ بڑی تعداد میں نئی نسل کے اسکالرس نے ان کی باتوں کو غور سے سنا اور ان سے ہندوستانی تہذیب و ثقافت کے حوالے سے سوالات کیے۔ اپنے ازبکستان قیام کے دوران پروفیسر انور پاشا نے بخارا، سمرقند اور کئی دیگر اہم شہروں کا دورہ کیا۔ انھوں نے امیر تیمور لنگ کے مزار کے علاوہ مختلف صوفیائے کرام اور بزرگان دین کی ابدی قیام گاہوں کی زیارت بھی کی۔ ازبکستان اور ہندوستان کے درمیان زمانہ قدیم سے ایک رشتہ رہا ہے۔ اس رشتے کی از سرنو دریافت کی کیا کیا صورتیں ہوسکتی ہیں، اس پر بھی پروفیسر پاشا نے غور وفکر کیا۔ ان کی تحقیق اور غور وفکر سے نہ صرف اردو شعر وادب کا دائرہ وسیع ہوگا بلکہ دونوں ممالک کے درمیان تہذیبی وراثت کے حوالے سے رشتوں میں استحکام بھی آئے گا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ اس ملک کے لوگ ہندوستان اور ہندوستانی عوام کے لیے بہترین جذبہ رکھتے ہیں۔ ہندوستانی تہذیب وتمدن میں ان کی گہری دلچسپی ہے۔ اس لکچر کا اہتمام تاشقند کے لعل بہادر شاستر سینٹر آف انڈین کلچر کی جانب سے کیا گیا تھا۔ پروفیسر انور پاشا نے تاشقند کے ہندوستانی سفارت خانہ میں ہندوستان میں زبان وتہذیب کے موضوع پر بے حد معلوماتی، پرمغز اور فکر انگیز لکچر دیا۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 13 اکتوبر 2018

بابائے قوم مہاتما گاندھی کی 150 ویں سال گرہ کے جشن کے موقعے پر بعنوان 'داستان مہاتما' پروگرام کا انعقاد

دھلی:

موہن سے مہاتما

نئی دھلی: اردو اکادمی کے زیراہتمام بابائے قوم مہاتما گاندھی کی 150 ویں سال گرہ کے جشن کی مناسبت سے سری رام سینٹر، منڈی ہاؤس، نئی دہلی میں داستان گوئی کا پروگرام بعنوان 'داستان مہاتما' اور ڈاکٹر ایم سعید عالم کی ہدایت کاری میں اردو ڈراما 'موہن سے مہاتما' پیش کیا گیا۔ اس موقعے پر مہمان خصوصی کے طور پر دہلی کے نائب وزیراعلیٰ و وزیر فن، ثقافت اور السنہ نے کہا کہ گاندھی جی کی شخصیت اتنی عظیم اور بلند و بالا ہے کہ ان کی زندگی کو پیش نظر رکھ کر ہر ہندوستان کو جینا چاہیے۔ گاندھی جی کسی مخصوص پارٹی یا گروہ کے نہیں پورے ہندوستان اور تمام ہندوستانیوں کے لیڈر تھے۔ انھوں نے کہا کہ میں اردو اکادمی کو مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ اکادمی نے دہلی کے عوام کے لیے اتنا خوبصورت پروگرام منعقد کیا۔ اردو اکادمی کے وائس چیئرمین پروفیسر شہپر رسول نے اپنے خیر مقدمی کلمات میں کہا کہ ان پروگراموں کا اصل مقصد عوام کو گاندھی جی کے پیغامات سے روشناس کرانا اور ان کے اندر اخوت ومحبت اور بھائی چارے کے جذبے کو مہمیز کرنا ہے۔ ہمارا مقصد یہ بھی ہے کہ قوم کے بچے اور جوان گاندھی جی کو اچھی طرح جانیں اور انھیں سمجھیں ان کے پیغامات پر عمل بھی کریں۔ اردو اکادمی، دہلی کے سکریٹری ایس ایم علی نے تمام مہمانوں، شرکا، فن کاروں اور سامعین کا شکریہ ادا کیا۔ داستان گو سید ساحل آغا نے داستان مہاتما پیش کی۔ انھوں نے اپنے پروگرام سے گاندھی جی کے اہنسا کے پیغام کو عام کیا، اس داستان میں خصوصی طور پر مہاتما گاندھی کے جذبۂ اخوت ومحبت، قومی ہم آہنگی اور قومی یکجہتی پیش کیا۔ اردو ڈراما 'موہن سے مہاتما' میں ایم سعید عالم سمیت تمام فنکاروں نے بہترین اداکار کا مظاہرہ کیا۔ پروگرام کی نظامت ریشما فاروقی نے کی۔ سری رام سینٹر میں منعقد اس پروگرام میں دہلی کی معزز شخصیات، طلبہ وطالبات اور نوجوانوں نے شرکت کی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 2 نومبر 2018

لوک ادب ہمارے ملک کی اہم وراثت

نئی دھلی: دہلی یونیورسٹی کے گرونانک دیو خالصہ کالج میں ہندی کویتا کی لوک دھرمی پر ایک انٹرنیشنل سیمینار منعقد کیا گیا جس کی افتتاحی نشست کی صدارت کرتے ہوئے پروفیسر ابن کنول نے کہا کہ لوک ادب ہمارے ملک کی

اہم وراثت ہے، اگر اسے کھو دیا تو ہم اپنی تہذیب وثقافت سے کٹ جائیں گے۔ لوک ادب سینہ بہ سینہ اور نسل در نسل چلتا ہے۔ بلگاریہ کی اسکالر گیلینا سوکولووا نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ہندی لوک ادب میں بھارت کی تہذیبی وراثت پوشیدہ ہے۔ اس لیے عصری ادب کے ساتھ ساتھ لوک ادب کو بھی پڑھنا اور سمجھنا چاہیے۔ افتتاحی تقریر کرتے ہوئے ڈاکٹر گرمیندر سنگھ نے کہا کہ اپنی زبان اور اپنے ادب کو ضرور پڑھیں اس لیے کہ یہی ہمارا ورثہ ہے اور اسی کو لے کر ہمیں آگے بڑھنا ہے۔ ممبئی یونیورسٹی کے استاد ڈاکٹر کرونا شنکر اپادھیائے نے کہا کہ لوک ادب سے آج کل کے نوجوان دھیرے دھیرے دور ہوتے جارہے ہیں۔ اس لیے اسی طرح کے موضوع پر سیمینار کرانا بہت ضروری ہے۔ لکھنؤ یونیورسٹی سے آئے پروفیسر پون اگروال نے کہا کہ لوک کتھائیں اور مٹھ وغیرہ کو جاننا اور ان کو مکھیہ دھارا سے جوڑنا بہت ضروری ہے۔ ڈاکٹر رینو دگل نے نظامت کرتے ہوئے موجودہ وقت میں لوک ادب کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالی۔ سیمینار میں ماریشس سے گیان وت دھنک چند، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پروفیسر کرشن کمار کوشک، جواہر لال یونیورسٹی کے پروفیسر رام چندر، پروفیسر سدھیر پرتاپ سنگھ اور دیو شنکر نوین، دہلی یونیورسٹی سے ڈاکٹر نجے کمار، ڈاکٹر من موہن کور، ڈاکٹر شیلجا موہن کے علاوہ کالج کے اساتذہ اور طلبہ کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 2 نومبر 2018

خبر نامہ

'اسعد بدایونی کی شعری کائنات' کے موضوع پر منعقدہ سیمینار کا منظر

اسعد بدایونی کی شعری کائنات

نئی دہلی: بدایوں ایک غیر معمولی سرزمین ہے، ادب سے اس سرزمین کا گہرا رشتہ رہا ہے، اسعد بدایونی کا تعلق بھی اسی سرزمین سے ہے، اسعد بدایونی نفیس الطبع مخلص اور انسانیت کی اعلیٰ اقدار کے حامل شاعر تھے۔ ان خیالات کا اظہار اردو اکادمی کے وائس چیئرمین اور صدر شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ پروفیسر شہپر رسول نے 'اسعد بدایونی کی شعری کائنات' پر منعقدہ ایک روزہ سیمینار میں کیا۔ سیمینار کا انعقاد دہلی اردو اکادمی کے مالی تعاون، شاہین ٹرسٹ، مظہر فاؤنڈیشن اور الحفیظ ایجوکیشنل اکادمی کے اشتراک سے ہوٹل ریویو جامعہ نگر اوکھلا نئی دہلی میں کیا گیا۔ اس موقع پر پروفیسر شہزاد انجم نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ اسعد بدایونی اپنے عہد کے شعرا میں منفرد تھے، ان کے یہاں مایوسی نہیں ملتی۔ ان کے بیشتر اشعار کوٹ کیے جانے کے لائق ہیں۔ دہلی یونیورسٹی کے سابق صدر شعبۂ اردو پروفیسر ابن کنول نے کہا کہ اسعد بدایونی نے بہت کم وقت اور بہت کم عمر میں اس قدر سرمایہ چھوڑا کہ دنیا ہمیشہ یاد رکھے گی، پروفیسر کوثر مظہری نے کہا کہ اسعد بدایونی بہت بڑے فنکار تھے۔ پروفیسر احمد محفوظ نے کہا کہ اسعد بدایونی کا اصل میدان جدید غزل ہے۔ ڈاکٹر نسیم احمد نسیم نے کلیدی خطاب میں کہا کہ اسعد بدایونی کی شاعری میں حزن و ملال کا احساس بہت گہرا ہے، کسی شخصیت اور کسی سسٹم سے وہ مرعوب نہیں ہوتے تھے، ان کے یہاں تہذیبی احیا کا کام ہوا۔ مشہور نقاد حقانی القاسمی نے کہا کہ اسعد بدایونی کے یہاں خیالات اور اسلوب کی ہم آہنگی ہے اور یہی کیمسٹری اور ارتباطی قوت (Cohesive power) ان کی شاعری کا مابہ الامتیاز ہے۔ ڈاکٹر ابرار رحمانی اور انجینئر کلیم الحفیظ نے بھی اسعد بدایونی کے متعلق اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ قبل ازیں سیمینار کا آغاز نسیم الدین کی تلاوت قرآن کریم اور معین قریشی کی نعت پاک سے ہوا، نظامت سیمینار کے کنوینر خان محمد رضوان نے کی۔ مہر فاطمہ، ڈاکٹر محمد اسعد، عبداللہ میری، عرفان احمد، عمران عراقی، شاداب شمیم، محمد انظر، سفینہ خاتون اور صدف وغیرہ نے مقالات پیش کیے۔ ڈاکٹر جاوید حسن نے تعارفی خطاب کیا۔ اس موقع پر امان اللہ کو اسعد بدایونی ایوارڈ 2018 سے سرفراز کیا گیا۔ سیمینار میں کثیر تعداد میں دہلی یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ اور جے این یو کے اسکالرز نے شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 23 اکتوبر 2018

ادب اطفال سائنسی نقطۂ نظر سے

نئی دہلی: آل انڈیا ادب اطفال کے زیر اہتمام اوکھلا وہار میٹرو اسٹیشن کے دہلی پولیس لائبریری ہال میں منعقدہ سیمینار میں مقررین نے اردو میں موجودہ ادب اطفال کی صورت حال کا جائزہ لیا اور آئندہ کے لائحہ عمل پر تجاویز پیش کیں۔ پروفیسر اختر الواسع نے اپنے صدارتی خطاب

میں کہا کہ اردو میں ادب اطفال اب بھی گھاٹے کا سودا نہیں ہے۔ بچوں کے رسالے اب بھی ہزاروں کی تعداد میں شائع ہو رہے ہیں۔ سپریم کورٹ کے سینئر وکیل خلیل الرحمٰن نے اپنے کلیدی خطبہ میں زمانہ جاہلیت سے لے کر اب تک کے ادب اطفال پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ادب اطفال کا مقصد صحیح زبان کی تدریس ہے۔ پروفیسر ابن کنول نے کہا کہ اردو میں بچوں کے ادب کی قدیم روایت ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اس کو بچوں کی پہنچ میں لائیں۔ مولانا آزاد نیشنل یونیورسٹی کے چانسلر فیروز بخت نے ان لوگوں کی خدمات کے اعتراف اور تعاون کی ضرورت پر زور دیا جو بچوں کا ادب تخلیق کرتے ہیں۔ پروگرام کے کنوینر سراج عظیم نے سوسائٹی کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ ان کا مقصد یہ ہے کہ اس تنظیم کے بینر تلے اردو میں ادب اطفال کو ایک تحریک میں تبدیل کر دیں۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر شفیع ایوب نے اور شکریے کے کلمات اس پروگرام کے روح رواں سراج عظیم نے انجام دیے۔ پروگرام میں شعیب رضا وارثی، خورشید اکرم، حقانی القاسمی، ڈاکٹر عبدالحی، ڈاکٹر نعیم فلاحی، ڈاکٹر عزیز احمد کے علاوہ کثیر تعداد میں لوگوں نے شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 5 نومبر 2018

ریختہ کی پہلی آن لائن 'فرہنگ قافیہ' لانچ

نئی دہلی: انٹرنیٹ کی دنیا میں اردو شاعری کی فراہمی کے بعد 'فرہنگ قافیہ' ریختہ فاؤنڈیشن کی ایک اور غیر معمولی پیشکش ہے۔ گزشتہ مہینے اس فرہنگ کو عام استعمال کے لیے پیش کیا گیا ہے جس سے اب تک ہزاروں لوگ جڑ چکے ہیں۔ 'ریختہ فرہنگ قافیہ' تیس ہزار سے زیادہ غزلوں میں مستعمل قافیوں میں مدد کرتی ہے اور کسی بھی لفظ کے تمام تر ممکنہ قافیوں کو پیش کرتی ہے۔ یہ فرہنگ اس لیے بھی خاص ہے کہ اس کا پورا انظام بحر اور وزن کی نوعیت کے لحاظ سے کام کرتا ہے۔ اگر آپ کسی لفظ کے ملتے جلتے قافیوں کو تلاش کریں گے تو آپ کے سامنے متعدد زمروں میں وہی قافیے آئیں گے جو اس لفظ کے بنیادی وزن سے مناسبت رکھتے ہوں اور منتخب بحر میں برتے جا سکتے ہوں۔ ریختہ ویب سائٹ کی طرح فرہنگ بھی اردو، دیوناگری اور رومن تینوں رسم الخط میں دستیاب ہے۔ ریختہ ہوم پیج سے اس فرہنگ تک پہنچا جا سکتا ہے۔ سنجیو صراف کا کہنا ہے 'ریختہ کے پورے سفر میں ہمارے لیے اہم بات صرف یہی رہی ہے کہ ہم اردو کے حوالے سے انٹرنیٹ کی دنیا میں ہر ضرورت کو پورا کر سکیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 1 نومبر 2018

ساہتیہ منچ تقریب کا انعقاد

نئی دہلی: ساہتیہ اکادمی کے زیر اہتمام ساہتیہ منچ کا انعقاد کیا گیا جس میں آئرلینڈ کی شاعرہ برنگٹ گیلگھر نے اپنی کویتاؤں سے سامعین کو مسحور کیا۔ اس موقع پر آئرلینڈ کے سفیر برین میکلڈ لیف مہمان خصوصی کے طور پر شامل رہے۔ تقریب کے آغاز میں ساہتیہ اکادمی کے سکریٹری شری نواس راؤ اور مشہور مصنف نرمل کانتی بھٹا چاریہ نے آئرش شاعرہ برنگٹ گیلگھر کا استقبال کرتے ہوئے ان کا مختصر تعارف پیش کیا۔ جبکہ آئرش سفیر کو انگریزی شاعر کے کے این درولا نے بطور تحفہ کتاب دے کر ان کا استقبال کیا۔ تقریب میں آئرش شاعرہ نے تقریباً ایک درجن سے زائد غزلوں کو سامعین کے سامنے پیش کرتے

ہوئے ان غزلوں سے جڑے اہم پہلوؤں کو بھی بتایا ہے جس میں انھوں نے نقل مکانی، ماحولیات اور حاشیے پر رہ رہے لوگوں کے ساتھ تعصب اور دنیا میں پھیل رہی دہشت گردی شامل تھے۔ تقریب کے بعد سبھی مصنفین نے ان کی غزلوں کا تنقیدی جائزہ بھی لیا۔ تقریب میں مصنف ایس ایچ شیو پرکاش، پر بیرواسو، سودیپ سین، جنرل بخشی، دیپندر چوب، چندر موہن، اے جے تھامس کے علاوہ کثیر تعداد میں سامعین نے شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 1 نومبر 2018

اترپردیش:

اردو تعلیم کے مستقبل پر یک روزہ ورکشاپ

علی گڑھ: اردو تعلیم کے مستقبل پر یک روزہ ورکشاپ کا انعقاد جامعہ اردو علی گڑھ میں کیا گیا۔ اردو تعلیم کے فروغ اور اسے تکنیکی تعلیم کے ساتھ جوڑنے کی ضرورت پر تبادلۂ خیال کیا گیا۔ کئی مراکز نے اس بات کا یقین دلایا کہ انھوں نے اپنے مرکز پر تکنیکی تعلیم کا بندوبست کر رکھا ہے اور طلبہ اس سے مستفید ہو رہے ہیں۔ ورکشاپ میں مراکز کو در پیش مسائل پر غور و خوض کر کے انھیں فوری حل بھی بتایا۔ ورکشاپ میں ملک بھر کے مہتمم مراکز شریک ہوئے۔ کنٹرولر جامعہ اردو رضوان علی خاں نے ورکشاپ کو کامیاب قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ ورکشاپ میں ہندوستان کے طول و عرض کے مہتمم مراکز نے شرکت کی اور اردو زبان و تعلیم کو در پیش مسائل پر تبادلۂ خیال کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 2 نومبر 2018

شیخ جمالی دہلوی کی حیات و خدمات

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (اے ایم یو) کے شعبۂ تاریخ کی ایسوسی ایٹ پروفیسر ڈاکٹر گلفشاں خاں نے آغا خاں یونیورسٹی، لندن کے انسٹی ٹیوٹ فار دی اسٹڈی آف مسلم سویلائزیشن کی جانب سے حال ہی میں منعقدہ بین الاقوامی کانفرنس بعنوان 'بحر ہند کے خطے میں مسلم تہذیبیں: تنوع اور تکثیریت، ماضی اور حال' میں شرکت کی اور خطاب کیا۔ ڈاکٹر گلفشاں خاں نے 'سیر العارفین میں مذکورہ مقامات و خطوں کی تلاش' عنوان سے پیش کردہ مقالے میں پندرہویں و سولہویں صدی کے ہندوستانی اسکالر اور صوفی شاعر حامد بن فضل اللہ (متوفی 1535) المعروف بہ شیخ جمالی دہلوی کی حیات و خدمات پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے بتایا کہ علم کی تلاش اور مختلف بزرگوں اور صوفیا سے ملاقات کی طلب کے تحت شیخ جمالی نے ایشیا اور افریقہ کے متعدد علمی و ثقافتی مراکز کا دورہ کیا۔ ڈاکٹر گلفشاں خاں نے کہا کہ عہد وسطیٰ میں بحیرۂ روم کی طرح بحر ہند کا خطہ معاشی اور ثقافتی تبادلہ کا علاقہ تھا۔ علمی، ثقافت اور اقتصادی تبادلہ اور ساحلی علاقوں کی ترقی میں دانشوروں، تاجروں اور مہاجرین نے اہم رول ادا کیا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 30 اکتوبر 2018

اردو کا جنگ آزادی میں اہم کردار

لھرپور، سیتاپور: اردو نے ملک میں گنگا جمنی تہذیب کو فروغ دینے کے علاوہ جنگ آزادی میں بھی اپنا اہم کردار ادا کیا ہے، جس کو رہتی دنیا تک فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ جب تک اردو زندہ رہے گی اس وقت تک لوگوں میں ادب و تہذیب زندہ رہے گی۔ اس کی سلامتی کی فکر ہم سبھی ہندوستانیوں کو کرنی ہے۔ ان خیالات کا اظہار قصبہ کے محلہ شیخ ٹولہ میں سماجی تنظیم لہرپور ویلفیئر سوسائٹی کے زیر اہتمام منعقدہ مشاعرے سے مہمان خصوصی پولیس قصبہ انچارج رامیشور سنگھ نے کیا۔ تنظیم کے صدر ریاض احمد ہلو نے کہا کہ اردو بولنے اور سمجھنے والے دنیا کے ہر حصے میں موجود ہیں۔ اس کو دنیا کی عظیم اور زندہ زبانوں میں ایک اعلیٰ مقام حاصل ہے۔ حاجی رئیس احمد نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ ہندوستان اپنی گوناگوں تہذیبوں سے ساری دنیا میں جانا اور پہچانا جاتا ہے، اس کی گنگا جمنی تہذیب اپنا ایک الگ مقام رکھتی ہے۔ علاقائی، لسانی اور سماجی حیثیت سے، کھان پان اور لباس کے لحاظ سے ایک دوسرے کے قریب تر ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کی بقا اور فروغ کے لیے کوشش کریں۔ عمر فاروق نے کہا کہ مسلم معاشرہ میں تعلیمی شعور خال خال نظر آرہا ہے، لوگ چند ٹکوں کی خاطر اپنے بچوں کو مزدوری پہ لگا دیتے ہیں جس کی وجہ سے یہ نسل جہالت کے قعر مذلت میں جا گری ہے۔ پروگرام کا افتتاح ذاکر لہرپوری نے نعت رسول سے کیا۔

مشاعرہ میں تقریباً ایک درجن سے زائد شعرا نے اپنا کلام پیش کیا۔ ان میں انور بسوانی، سلیم ندوی، صدر پوری، ڈاکٹر افضل لہرپوری، عمر فاروقی، اقبال اکرم وارثی، مصباح الدین انصاری، مبین لہرپوری، گہر لہرپوری، زینت حیا سیتاپوری، ضیاء الحق تیموری شامل ہیں۔ اس موقعے پر مولانا ریاض خاں، ہریش رستوگی، سنتوش کشیپ، حاجی کمال احمد، حاجی لئیق احمد، سید خالد علی، پپو قریشی، انکت اوستھی، فرقان علی، اکرام الحق، ضیاء الدین انصاری، سراج احمد خاں، صلاح الدین غوری، ماسٹر محمد یامین انصری خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ پروگرام میں بڑی تعداد میں لوگ موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 24 اکتوبر 2018

مجاز کی شاعری کو سمجھنے کے لیے اردو کی تعلیم ضروری

ردولی / فیض آباد: اردو کے مشہور شاعر اسرار الحق مجاز کے وطن قصبہ ردولی نگر پالیکا پریشد ہال میں ان کے یوم پیدائش کے سلسلے میں ایک سمینار کا انعقاد کیا گیا جس میں مہمان خصوصی چودھری محمود سہیل، سماجی کارکن ڈاکٹر نہال رضا اور چیئرمین جبار علی کے علاوہ قصبہ کے معززین نے شرکت کی۔ سمینار سے خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر نہال رضا نے کہا کہ تاریخ گواہ ہے کہ ملک میں ایسی شخصیات پیدا ہوتی رہی ہیں جو اپنی صلاحیت کے ذریعے عظیم کہلانے کی مستحق رہی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اردو دنیا کی مشہور ادبی شخصیتوں میں مجاز ردولی کا نام روشن ستارے کی حیثیت رکھتا ہے۔ سمینار کو خطاب کرتے ہوئے محمود سہیل نے اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا۔ جو سچ پوچھو تو شادا اپنے کیے سے کچھ نہیں ہوتا، خدا کی دین ہے انسان کا مشہور ہو جانا۔ نگر پالیکا پریشد ردولی کے چیئرمین جبار علی نے اسرار الحق مجاز کی شاعرانہ شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ مجاز نے اپنی شاعری کے ذریعے پوری دنیا میں اپنے آبائی وطن ردولی کا نام روشن کیا۔ انھوں نے اعلان کیا کہ مجاز ردولوی کے نام سے ایک آل انڈیا مشاعرہ منعقد کرایا جائے گا اور ایک

سرسید ایک شخص ہی نہیں، مکتبہ فکر کا نام ہے کے موضوع پر منعقدہ سمینار کا منظر

ٹورنامنٹ کا انعقاد کیا جائے گا۔ ان کے نام سے ردولی قصبہ میں ایک گیٹ بھی تعمیر کرایا جائے گا۔ شاہد صدیقی نے مجاز کی زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ مجاز کی شاعری کو سمجھنے کے لیے اردو کی تعلیم ضروری ہے۔ انھوں نے اپنے بچوں کو انگریزی کے ساتھ اردو کی تعلیم دلانے پر زور دیا۔ سمینار میں کثیر تعداد میں لوگوں نے شرکت کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 22 اکتوبر 2018

اردو صحافت اور تحریک آزادی

بلند شهر: انجمن ترقی اردو ہند بلند شہر شاخ کے زیر اہتمام اردو صحافت اور تحریک آزادی ہند پر ایک سمینار اریب منزل اسلام آباد میں منعقد کیا گیا۔ ضلع کی ممتاز علمی اور سیاسی شخصیت جناب بدرالاسلام سابق چیئر مین شبانہ کی صدارت میں منعقدہ سمینار کا آغاز حافظ شکیل احمد کی تلاوت کلام پاک اور ارشاد احمد شرر ایڈوکیٹ کی نعت پاک سے ہوا۔ ایڈوکیٹ صہیب خاں نے نظامت کی۔ کوثر علی نے اردو کی عظمت پر شاندار نظم پیش کی۔ اس موقعے پر اسسٹنٹ پروفیسر عظمت علی خاں نے مہمانان کا خیر مقدم کیا۔ اپنے استقبالیہ کلمات میں پروگرام کے کنوینر ڈاکٹر ظہیر احمد خاں نے مہمانوں اور شرکا کا استقبال کرتے ہوئے سمینار کی غرض وغایت پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریک آزادی میں اردو صحافت کی نمایاں اور بے مثال قربانیوں پر اظہار خیال کیا۔ اپنے صدارتی خطاب میں بدرالاسلام نے کہا کہ 1857 سے لے کر 35-1930 تک ملک گیر پیمانے پر آزادی اور قومی اتحاد کے لیے جنگ کرنے کا سہرا زیادہ تر اردو اخبارات کے سر رہا۔ سمینار کے مہمان خصوصی آفاق الرحیم خاں سابق چیئر مین بگراسی نے کہا کہ 1882 میں کلکتہ سے جام جہاں نما کی اشاعت سے لے کر ملک کی آزادی تک اردو صحافت کا کردار بڑا روشن اور تابندہ ہے۔ سمینار کے مہمان ذی وقار ابوبشیر ممبر سٹی بورڈ نے اس موقعے پر کہا کہ اردو اخبارات کی تحریک سے ہی انقلاب آیا اور ملک کے باشندے حصول آزادی کے لیے سڑکوں پر نکلے۔ سمینار کے معزز مہمان قاری محمد طلحہ قاسمی ناظم اعلیٰ جامعہ فاروقیہ نے اپنے پرجوش اور عالمانہ خطاب میں فرمایا کہ تحریک آزادی میں اردو صحافت کا سرفروشانہ کردار رہا ہے جس پر ہم سب کو ہمیشہ ناز رہے گا۔ اس موقعے پر معزز مہمانان حاجی جاوید غازی حاجی لیاقت علی انجینئر نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ سمینار میں مختلف حضرات نے اردو صحافت اور تحریک آزادی پر اپنے مقالے پیش کیے۔ ڈاکٹر حافظ ابوعبید خاں، ماسٹر ساجد علی نے مقالے پیش کیے۔ ماسٹر ساجد علی نے کہا کہ دہلی اخبار کو تحریک آزادی میں اس لیے بھی اہمیت دی جاتی ہے کہ انگریزوں نے مولوی باقر کو گولی مار کر شہید کر دیا تھا۔ مذکورہ سمینار میں اردو کی بقا و ترقی اور تعلیم کے لیے انجمن ترقی اردو ہند کی ضلع کمیٹی پر فیصلہ کیا گیا جس کے مطابق ڈاکٹر حافظ ابوعبید خاں پرنسپل رائزنگ پبلک اسکول خورجہ کو کمیٹی کا کنوینر منتخب کیا گیا اور طے پایا کہ انجمن کے سرپرست جناب بدرالاسلام صاحب کے مشورے کی بنیاد پر اردو کی خدمت کرنے والے حضرات پر مشتمل کمیٹی تشکیل کی جائے گی۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 18 اکتوبر 2018

مہاتما گاندھی اور اردو ادب کے موضوع پر توسیعی خطبہ

رامپور: رامپور رضا لائبریری کے خیابان رضا کانفرنس ہال میں مہاتما گاندھی کی 150 ویں جینتی پر 'مہاتما گاندھی اور اردو ادب' کے موضوع پر ایک توسیعی خطبہ کا انعقاد عمل میں آیا جس کی صدارت جگدیش پیوش رکن رامپور رضا لائبریری بورڈ نے کی۔ لائبریری کے ڈائرکٹر پروفیسر حسن عباس نے خیر مقدمی کلمات میں پروفیسر علی احمد فاطمی کی ادبی خدمات کا تفصیلی تعارف کرایا گیا۔ اس موقعے پر پروفیسر علی احمد فاطمی (صدر شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی) نے توسیعی خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ پوری عالم انسانیت کے لیے مہاتما گاندھی کہے جانے والے موہن داس کرم چند گاندھی، عام انسان سے مہاتما کس طرح بنے۔ یہ ایثار، آزار، اور جدوجہد سے بھری ایک طویل داستان ہے۔ اسے ہندوستان کی مختلف تاریخ، فلسفۂ سیاست اور علم وادب میں بار بار دہرایا گیا ہے۔ پیدائش کی ایک سو پچاسویں سالگرہ کے موقعے پر مہاتما گاندھی کو ایک زاویے سے یاد کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو کے باضابطہ قومی شاعر برج نرائن چکبست، علامہ اقبال، فراق گورکھپوری، جوش ملیح آبادی، مجاز جیسے بے شمار شاعروں، پریم چند جیسے ناول نگاروں اور ان کے ادبا، افسانہ نگاروں اور صحافیوں نے مہاتما گاندھی کی عظیم خدمات کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ اپنے صدارتی خطبے میں جگدیش پیوش نے کہا کہ ہمارے لیے یہ بڑے فخر کی بات ہے کہ ہم ایسے پروگرام میں شامل ہوئے جو رامپور رضا لائبریری کے ذریعے منعقد کیا گیا ہے۔ انھوں نے اردو زبان سے متعلق گاندھی جی کے خیالات پر روشنی ڈالی۔

لائبریری کے ڈائرکٹر پروفیسر حسن عباس کی تعریف کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ یہ ان کی صلاحیتوں کا نتیجہ ہے کہ ہم ایسی نایاب موضوعات پر توسیعی خطبے سماعت کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ جس انداز سے علی احمد فاطمی نے گاندھی جی کی اردو سے محبت اور اردو سے متعلق قربانیوں کو پیش کیا وہ قابل ستائش ہے۔ تقریب کے اختتام پر لائبریری کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر ڈاکٹر ابوسعد اصلاحی نے تمام حاضرین اور مہمانان کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 15 اکتوبر 2018

سرسید ایک شخص ہی نہیں، مکتبہ فکر کا نام ہے'

دیوبند: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بانی سرسید احمد خاں کے یوم پیدائش کے موقعے پر نواز گرلز پبلک اسکول میں 'سرسید احمد خاں ایک شخص ہی نہیں بلکہ ایک مکتبہ فکر کا نام ہے' کے عنوان سے ایک سمینار کا انعقاد کیا گیا، اس موقعے پر چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی میرٹھ کے شعبۂ اردو کے پروفیسر ڈاکٹر آصف علی نے اپنے خطاب میں کہا کہ سرسید احمد خاں نے علی گڑھ میں یونیورسٹی کا قیام کر کے ایک یادگار تحفہ قوم کو دیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ آج ہم سند یافتہ تو بن رہے ہیں مگر اچھے انسان نہیں بن رہے ہیں، سرسید احمد خاں کا مشن ہے کہ ہم سند یافتہ بھی بنیں اور بہترین انسان بھی۔ دارالعلوم دیوبند کے استاد مولانا شاہ عالم گورکھپوری نے کہا کہ مختلف مذاہب میں تعلیم کو روزی روٹی کا ذریعہ بتایا گیا ہے جبکہ اسلام میں تعلیم کو اجر عظیم اور

اللہ کی رضا حاصل کرنے کا ذریعہ بتایا گیا ہے، ہمیں علم حاصل کرنے کا حکم اللہ تعالی نے دیا، اس لیے ہماری ذمے داری ہے کہ ہم دین و دنیا کا علم حاصل کریں اور دوسروں کو سکھائیں، مدرسہ پھلت کے استاد مفتی راحت علی صدیقی نے کہا کہ وہی قوم اور طبقہ ترقی کرسکتا ہے جو تعلیم کو ترجیح دیتا ہے۔ یہ سماج اور دنیا تعلیم یافتہ افراد کی دنیا ہے۔ اگر آپ آگے بڑھنا چاہتے ہیں تو آپ کو سرسید احمد خاں کے تعلیمی مشن کے ساتھ آگے بڑھنا ہوگا۔ چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی میرٹھ کے شعبہ سائنس لائبریری کے صدر ڈاکٹر جمال احمد صدیقی نے کہا کہ سرسید احمد خاں ایک ادارہ ہے، ایک مکتبہ فکر ہے، 150 سال گزر جانے کے بعد بھی سرسید احمد خاں کے مشن کی اہمیت کم نہیں ہوئی ہے۔ اسکول کے بانی ڈاکٹر نواز دیوبندی نے اپنے خطاب میں کہا کہ سرسید احمد خاں کا مشن 150 سال قبل بھی اہمیت کا حامل تھا اور آج بھی ہے۔ انھوں نے کہا کہ سرسید احمد خاں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی قائم کرکے مسلمانوں پر ہی نہیں بلکہ تمام ہندوستانیوں اور پوری انسانیت پر احسان عظیم کیا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارا ملک اور پوری دنیا اس سے فیضیاب ہورہی ہے۔ انھوں نے آخر میں سبھی مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ صدارت ڈاکٹر آصف علی نے کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 17 اکتوبر 2018

عوامی مرثیے کی روایت پر مذاکرہ

لکھنؤ: ممتاز صحافی و ادیب لئیق رضوی کی تازہ ترین کتاب 'عوامی مرثیے کی روایت' پر میڈیا سنٹر میں اردو رائٹرس فورم کی جانب سے ایک مذاکرہ معروف نقاد اور ناول نگار پروفیسر مجاور حسین کی صدارت اور ڈاکٹر مرزا شفیق حسین شفق کی نظامت میں ہوا۔ مذکورہ شخصیات کے علاوہ پروفیسر شارب ردولوی، پروفیسر فضل امام رضوی اور ریشما پروین نے کتاب کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ اردو کے معروف ناقد پروفیسر مجاور حسین نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ ان کے استاد فراق گورکھپوری کہتے تھے کہ اردو شہری تمدن کی نمائندہ زبان ہے، اسے کبھی عوامی اور دیہاتی نہ بنانا۔ ایسے میں مرثیے کی عوامی روایت پر اردو میں کتاب لکھنا قابل قدر کارنامہ ہے۔ یہ ہماری تہذیبی زندگی کا جز ہے۔ اسے زندہ رکھنے کی کوشش کی جانی چاہیے۔ پروفیسر شارب ردولوی نے اپنے خطاب میں کہا کہ لئیق رضوی کی کتاب 'عوامی مرثیے کی روایت' اردو مرثیے کی تاریخ کی گمشدہ کڑی ہے۔ پروفیسر شارب ردولوی نے کہا کہ اردو نے اپنا رشتہ کبھی ان بنیادی ماخذ سے نہیں جوڑا، صرف شہری و مدنی روایت سے رشتہ رکھا۔ میر عوامی روایت کے شاعر نہیں ہیں۔ میر انیس کے یہاں جو توانائی ہے وہ اسی عوامی روایت کے سبب ہے۔ مرثیے کا آغاز عوامی ادب اور روایت سے ہوتا ہے۔ لئیق رضوی کا یہ کام کافی اہم اور کارآمد ہے۔ پروفیسر فضل امام نے کہا کہ واقعہ کربلا اور رثائی ادب ہندوستان کے ذرّے ذرّے میں رچا بسا ہوا ہے۔ ہندوستان کی روح میں امام حسین سمائے ہوئے ہیں۔ کتاب کے مصنف لئیق رضوی نے اس کتاب کے سلسلے میں اپنے تاثرات کے ساتھ ہی اس تحقیقی کام میں درپیش مسائل اور تجربات کا ذکر کیا۔ ڈاکٹر ریشماں پروین نے بھی اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ آخر میں پروگرام کے کنوینر وقار رضوی نے تمام حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 12 اکتوبر 2018

'معاصر اردو تحقیق اور حنیف نقوی' کے موضوع پر خصوصی لیکچر پیش کرتے ہوئے ظفر احمد صدیقی

'معاصر اردو تحقیق اور حنیف نقوی'

وارانسی: سید حنیف احمد نقوی کا شمار اردو کے اہم ترین محققوں میں ہوتا ہے۔ ان کی تحقیق کا رشتہ اردو کے صف اول کے محققوں حافظ محمود شیرانی، قاضی عبدالودود، امتیاز علی عرشی اور رشید حسن خاں کے تحقیقی اصول اور طریقۂ تحقیق سے قائم ہے۔ انھیں اس سلسلے کا پانچواں محقق کہا جاسکتا ہے۔ ان کے تحقیقی کارناموں میں غالب پر تحقیق بہت اہم ہے۔ گرچہ انھوں نے میر، مصحفی، قائم اور انشا کے تعلق سے بھی تحقیقی انکشافات کیے لیکن ان کا بیشتر وقت غالب تحقیق میں گزرا۔ رجب علی بیگ سرور پر ان کی کتاب حوالے کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان خیالات کا اظہار علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے تشریف لائے اردو کے ممتاز محقق پروفیسر ظفر احمد صدیقی نے 27 اکتوبر 2018 کو شعبۂ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی کے زیر اہتمام منعقدہ خصوصی لیکچر بعنوان 'معاصر اردو تحقیق اور حنیف نقوی' میں کیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ حنیف نقوی محققوں کے محقق ہیں، یعنی اردو محققین سے ان کی تحقیقی خدمات میں جو فروگذاشتیں ہوئی ہیں ان کی نشاندہی اور اصلاح کا کام سید حنیف نقوی نے کیا۔ پروگرام کی ابتدا میں صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی نے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے شعبۂ اردو کے تحت منعقدہ مختلف لیکچرز کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ پروفیسر حنیف نقوی اس شعبے کے ان اساتذہ میں سے ایک ہیں جنھوں نے اپنی علمی و تحقیقی کاوشوں سے شعبے کو وقار اور امتیاز عطا کیا۔ جلسے کی صدارت شعبۂ اردو کاشی ودیاپیٹھ کی سابق صدر پروفیسر شاہینہ رضوی نے کی۔ انھوں نے مہمان مقرر پروفیسر ظفر احمد صدیقی کی علمی و ادبی نیز تحقیقی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ موصوف معاصر اردو تحقیق میں اپنی تحقیقی خدمات کے باعث بے حد محترم اور معتبر ہیں۔ اپنے صدارتی خطبے میں انھوں نے اردو تحقیق کی موجودہ صورت حال پر افسوس کا اظہار کیا۔ پروفیسر شاہینہ رضوی نے پروفیسر ظفر احمد صدیقی کے لیکچر کو فکر انگیز اور معلوماتی قرار دیتے ہوئے کہا کہ اس طرح کے لیکچر سے طلبا کے ساتھ ساتھ اساتذہ کے علم میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ پروگرام کی نظامت شعبۂ اردو کے استاد ڈاکٹر مشرف علی نے کی جبکہ اظہار تشکر کی رسم شعبہ کے استاد ڈاکٹر محمد قاسم انصاری نے ادا کی۔

پریس ریلیز: عبدالسمیع، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانسی، 27 اکتوبر 2018

بہار:

امداد امام اثر اور سہیل عظیم آبادی کو خراج عقیدت

پٹنہ: سہیل عظیم آبادی اور امداد امام اثر بہار کے ایسے دو سپوت ہیں جن پر صرف اہل بہار کو ہی نہیں بلکہ پوری اردو دنیا کو

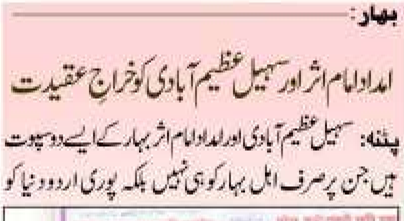

فخر ہے۔ اردو ڈائرکٹوریٹ نے 10 اکتوبر کو ابھیلیکھ بھون میں ان دونوں برگزیدہ شخصیات کی یاد میں تقریبات کا

اہتمام کیا تھا۔ اس موقعے پر سہیل عظیم آبادی کی دلچسپ یادوں اور ان سے اپنے شاگردانہ تعلقات پر روشنی ڈالتے ہوئے افسانہ نگار شوکت حیات نے کہا کہ سہیل عظیم آبادی اردو افسانہ کے ایک اسکول کا نام ہے۔ وہ ایک بہت ہی شفیق استاد و مربی بھی تھے اور ان سے رہنمائی حاصل کرنے والوں کی تعداد درجنوں ہوگی۔ جبکہ پروفیسر عبدالصمد نے کہا کہ سہیل عظیم آبادی کو پریم چند کا پرتو کہنا غلط ہوگا۔ ان کی تحریر دور سے پکار کر ان کا پتہ دیتی ہے اور ڈاکٹر ابوظہیر ربانی نے کہا کہ 'سہیل عظیم آبادی پریم چند کے متاثر تھے مقلد نہ تھے۔' پروفیسر عبدالصمد نے اپنے صدارتی خطاب سے کہا کہ سہیل کی شخصیت کے مربیانہ پہلو اور لوگوں کے کام آنے کے ان کے جذبے کو جذباتی انداز میں یاد کیا اور ان کی مکتوب نگاری کے حوالے سے کہا کہ ان کا کوئی خط ایسا نہیں ہے جس میں کوئی ایسی بات نہ ہو جس سے مکتوب الیہ کو رہنمائی نہ ملتی ہو۔ سہیل عظیم آبادی کی صحافت کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر سرور حسین نے کہا کہ وہ ایک اصول پسند انسان تھے جس نے کبھی اپنے ضمیر کی آواز سے سمجھوتہ نہیں کیا۔ اس سے قبل اردو ڈائریکٹوریٹ کے ڈائرکٹر امتیاز احمد کریمی نے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ اردو کے ساتھ میٹرک امتحان میں ٹاپ کرنے والے طالب علم کو ایک لاکھ روپے کا انعام دیا جائے گا۔ شاعروں اور ادیبوں کے اعزاز میں سمینار اور جلسے کا مقصد اردو کے تئیں بیداری اور شوق پیدا کرنا ہے۔ دوسری نشست میں امداد امام اثر کی شخصیت اور ان کی تنقید پر مدلل اور سیر حاصل گفتگو ہوئی۔ پروفیسر آفتاب احمد آفاقی، ڈاکٹر نسیم احمد نسیم، ریسرچ اسکالر رحمت یونس، کالج کے طالب علم امام سرور علی اور محمد آصف رضا نے مقالے پیش کیے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 11 اکتوبر 2018

فروغ اردو اور ہماری کوشش

گیا: شیر گھاٹی کے حمزہ پور میں واقع جینئس کڈس گلیکسی اسکول میں فروغ اردو اور ہماری کوشش کے عنوان سے

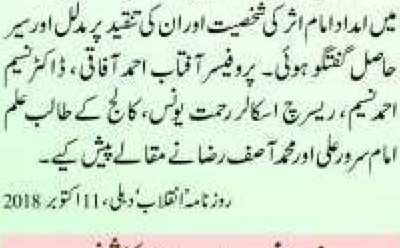

مذاکرے کا انعقاد ہوا جس کی صدارت معروف شاعر ناوک حمزہ پوری نے کی۔ یہ مذاکرہ عوامی اردو نفاذ کمیٹی مگدھ کمشنری، شیر گھاٹی اکائی کے زیر اہتمام ہوا جس میں پرائیویٹ اسکولوں کے ذمہ داران اور ائمہ مساجد شامل ہوئے۔ اس کا آغاز تلاوت قرآن سے ہوا۔ کمیٹی کے صدر جمشید اشرف نے استقبالیہ خطبہ پیش کیا۔ پروگرام کی نظامت عمران علی نے کی، جبکہ حاجی ابوار یہ عرف شبو نے کمیٹی کے اغراض و مقاصد پیش کیے۔ اس موقعے پر ناوک حمزہ پوری نے کہا کہ اردو ہماری مادری زبان کے ساتھ ساتھ ہماری مکمل تہذیب بھی ہے۔ اگر یہ زبان مٹ گئی تو ہماری تہذیب بھی مٹ جائے گی اور جب ہماری تہذیب مٹ جائے گی تو ہماری حیثیت ایک چلتے پھرتے مردے کی ہو جائے گی۔ اس لیے اس زبان کی حفاظت ہماری اولین ذمے داری ہے۔ ڈاکٹر ایس رضاء اللہ نے کہا کہ تقسیم ہند سے قبل اردو تمام ہندوستانیوں کی زبان تھی لیکن تقسیم کے بعد اردو کو مسلمانوں کی زبان قرار دے دیا گیا۔ ائمہ مساجد نے خطاب میں کہا کہ اردو نہ صرف ہماری مادری زبان ہے بلکہ ہمارے دین و مذہب کا عظیم سرمایہ اسی زبان میں محفوظ ہے۔ پرائیویٹ اسکولوں کے ذمے داران نے کمیٹی کے اس قدم کی ستائش کی اور کہا کہ ہمارے اسکولوں میں اردو کی تعلیم ہو رہی ہے، مگر اس میں اور بہتری لانے کی ضرورت ہے۔ اس موقعے پر کمیٹی کے اراکین الحاج ابوار یہ، عمران علی، حاجی ظہیر انور، محمد نسیم الدین، محمد کلام، احسان احمد، سرور عالم کے علاوہ کئی افراد موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 22 اکتوبر 2018

اردو نظم – قدیم و جدید رجحانات

دربھنگہ: متھلا یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے زیر اہتمام بہار اردو اکادمی اور یو جی سی کے مالی تعاون سے منعقدہ دو روزہ قومی سمینار بعنوان 'اردو نظم – قدیم و جدید رجحانات' اتوار کی سہ پہر اختتام پذیر ہو گیا۔ سمینار کے دوسرے اور تیسرے مشترکہ ٹیکنیکل سیشن کی مجلس صدارت میں پروفیسر شاکر خلیق، عبدالمنان طرزی، پروفیسر ممتاز احمد خاں، پروفیسر آفتاب احمد آفاقی، صدر شعبہ ہندی پروفیسر چندر بھان اور بہار یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے صدر ڈاکٹر محمد حامد علی خان شامل تھے، جبکہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر آفتاب

'اردو نظم – قدیم وجدید رجحانات' کے موضوع پر منعقدہ سمینار کا منظر

اشرف اور ڈاکٹر ابرار احمد اجراوی نے مشترکہ طور پر کی۔ پروفیسر ممتاز احمد خاں نے اپنے مقالے میں سردار جعفری کی نظم نگاری پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ انسانی حرمت و شرافت، سماجی عدل و انصاف، عالمی امن اور معاشی مساوات کے مسائل جب تک زندہ ہیں سردار جعفری کی شاعری زندہ رہے گی۔ پروفیسر صفدر امام قادری (پٹنہ) نے جدید شاعر شہریار کی نظم 'زوال کی حد' کا تنقیدی جائزہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ اس میں جدیدیت کے عہد کے موضوعات کے ساتھ زندگی کی آفاقی قدریں بھی شامل ہیں اور صوفیانہ آہنگ بھی پایا جاتا ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ڈاکٹر ندیم احمد نے قدیم نظمیہ اصناف اور اردو میں طویل نظم کے عنوان پر مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ انسانی زندگی کی بسیط حقیقتوں، تہذیبی و سیاسی، سماجی اور اخلاقی مسائل کے اظہار کے لیے جب بڑے کینوس کی ضرورت ہوئی تو نظم گو شعرا نے طویل فارم اختیار کیا۔ ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی (پٹنہ) نے اپنے مقالے میں کہا کہ جمیل مظہری کے یہاں انسان اور آدمیت کے مجرد تصور کی بجائے عہد کے مسائل سے نبرد آزما انسان ملتا ہے جو جینے کے حق کا طلبگار ہے۔

انوارالحسن وسطوی نے ذکی چندن پٹوی کی قادرالکلامی کا ثبوت پیش کرتے ہوئے کہا کہ بحیثیت نظم نگار ان کا مقام بہت بلند ہے اور بالخصوص ادب اطفال کے زمرے میں ان کی شاعری اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ ڈاکٹر قیام نیر نے اپنا مقالہ ترقی پسندانہ انقلابی نظموں کا علم بردار: کیفی اعظمی پیش کیا۔ ڈاکٹر امتیاز احمد نے پروفیسر لطیف الرحمٰن کی شاعری کے امتیاز کو پیش کرتے ہوئے کہا کہ ان کی شاعری میں وہ سب کچھ ہے جو اچھی شاعری کے مطالبات رہے ہیں۔ اے ایم اظہار الحق نے کہا کہ نظمیہ شاعری زمانے اور حالات کے تحت خود کو ڈھالتی رہی۔ پروگرام کو کامیاب بنانے میں کنوینر پروفیسر انیس صدری آرگنائزنگ سکریٹری ڈاکٹر فاراں شکوہ یزدانی، ڈاکٹر آفتاب اشرف اور کالج کے طلبہ وطالبات سرگرم تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 1 اکتوبر 2018

تلنگانہ

حیرت بدایونی کی خدمات کا اعتراف

حیدر آباد: حیدر آباد دکن میں امجد حیدر آبادی کے بعد جس عظیم شخصیت کا نام ہمیشہ سرفہرست رہا ہے وہ علامہ حیرت بدایونی کا نام ہے جنھوں نے شمال اور جنوب کے حسین ادبی امتزاج کے ذریعے ایک انوکھا شعری مزاج عطا کیا جس میں علامہ نے روایتی انداز شاعری کو باقی رکھنے کے باوجود اس میں جدید سوچ وفکر کو جگہ دی تھی۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر ایس اے شکور ڈائرکٹر سکریٹری تلنگانہ اردو اکادمی نے انجمن قلم کاران دکن حیدر آباد کی جانب سے بنجارہ ہلز کے تہذیبی مرکز 'الامکان' میں منعقدہ ایک تقریب سے صدارتی خطاب کے دوران کیا۔ یادرفتگاں سلسلے میں دکن میں استاد الاساتذہ علامہ حیرت بدایونی کی ادبی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے مہمان خصوصی جناب ایس اے ہدی، آئی پی ایس، سابق ڈائرکٹر جنرل پولیس آندھرا پردیش نے کہا کہ بدایونی ہونے کے باوجود علامہ کا حیدر آباد پر اور حیدر آبادیت پر فخر کرنا اور بارہا اس کا تحریری اور تقریری اظہار اور اعتراف کرنا ان کی ادبی عظمت کی دلیل ہے۔ اس خصوصی ادبی اجلاس کے ایک مہمان خصوصی سابق صدر نشین نظام ٹرسٹ جناب شاہد حسین زبیری نے علامہ حیرت بدایونی کے ساتھ گزارے لمحات کو یاد کیا اور کہا کہ بچوں سے ان کی محبت وہ تمام کتابیں ہیں جو آج ایک عظیم ادبی سرمایہ ہیں اور جن پر تحقیقی کام ہونا چاہیے۔ ممتاز ماہر نشریات شاعر اور ادیب صدر نشین انجمن قلمکاران دکن اسلم فرشوری نے حاضرین کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ سلسلہ یادرفتگاں کے ذریعے ہم ادب کے فروغ وترویج کے سلسلے میں دکن میں حیدر آبدیوں کی کاوشوں کو منظر عام پر لانے کی کوشش کر رہے ہیں جس میں آپ کا تعاون لازمی ہے۔ انھوں نے کہا کہ وہ بہت جلد ہی علامہ حیرت بدایونی کی ادبی خدمات کے اعتراف میں کل ہند سطح پر سمینار اور مشاعرہ منعقد کریں گے۔ مہمانانِ اعزازی پروفیسر رفیعہ سلیم حیدر آباد سنٹرل یونیورسٹی نے کہا کہ وہ علامہ حیرت بدایونی کی ادبی خدمات پر جلد ہی تحقیقی مقالے کا کام شروع کروانے والی ہیں۔ ممتاز اور معروف شاعر یوسف روش اور ولی محمد زاہد ہریانوی نے علامہ حیرت بدایونی کی شاعرانہ عظمت کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔ ممتاز ادیبہ وافسانہ نگار شبینہ فرشوری نے علامہ کی مزاح نگاری اور علامہ کے شاگرد عزیز طالب رزاقی مرحوم کے صاحب زادے ڈاکٹر ناقد رزاقی نے علامہ حیرت بدایونی کے ساتھ گزاری۔ بچپن کی یادوں کو اپنی یادوں میں تازہ کیا۔ ادبی اجلاس کے بعد طرحی مشاعرہ منعقد ہوا جس میں علامہ حیرت بدایونی کا مصرعہ طرح تھا 'زندگانی درحقیقت موت کی تاخیر ہے' اسلم فرشوری کی نظامت میں منعقدہ اس مشاعرے کی صدارت پروفیسر انور معظم سابق ڈین جامعہ ہمدرد دلی نے کی۔ حصہ لینے والے مدعو شعرا کرام سمیع اللہ سمیع، جناب زعیم، اطیب اعجاز، عارف نعیم، لطیف الدین لطیف، گوبند اکشے ودیگر شرکا تھے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 30 اکتوبر 2018

راجستھان:

شیخ اشرف آفندی کا استقبالیہ

جودھپور: جرمنی کے دارالحکومت برلن میں واقع صوفی سینٹر ربانیہ کے ترک نژاد روحانی رہنما اور نقشبندیہ سلسلے کے مرشد حضرت شیخ اشرف آفندی اپنے 12 مریدین کے ساتھ مولانا آزاد یونیورسٹی تشریف لائے، جہاں یونیورسٹی کے صدر پدم شری پروفیسر اختر الواسع کے ساتھ مارواڑ مسلم ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی کے صدر حاجی عباد اللہ قریشی، جنرل سکریٹری جناب نثار احمد خلجی، خازن اور سی ای او جناب محمد عتیق اور معزز ممبران سوسائٹی جناب ذکی احمد، جناب حنیف لوہانی، جناب فیروز قاضی، جناب خالد قریشی نیز یونیورسٹی کے رجسٹرار ڈاکٹر عمران خان پٹھان نے ان کا استقبال کیا۔ معزز مہمانوں نے مولانا آزاد یونیورسٹی جودھپور کے قیام کی ستائش کی اور اس کے طرز تعمیر اور طریق تعلیم کو خصوصی طور پر سراہا۔ بعد ازاں وفد نے جودھپور شہر میں واقع مارواڑ مسلم ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی کے ذریعے چلائے جارہے اداروں کا جائزہ لیا۔ ایک خصوصی تقریب میں شیخ اشرف آفندی نے طلبہ، طالبات، اساتذہ اور مہمانوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ آپ کا مذہب کوئی بھی ہو لیکن آپ کو اپنے رب کو نہیں بھولنا چاہیے اور ہر کام کی شروعات اس کے نام سے کرنی چاہیے، اسی میں خیر بھی ہے اور برکت بھی۔ اس موقعے پر مشہور اسلامی اسکالر پدم شری پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ ہندوستان میں تمام اہم صوفی سلسلے موجود ہیں اور ہندوستان ایک طرح سے اسلامی تصوف کی راجدھانی ہے۔ تقریب کے آخر میں مہمانان گرامی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے جناب محمد عتیق نے کہا کہ ہم آپ اور آپ کے ساتھیوں کی آمد پر آپ کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ آپ نے جو روحانی پیغام دیا ہے، ہم اور ہمارے بچے اس پر عمل کرنے کی بھرپور کوشش کریں گے۔

پریس ریلیز: انور حسین عباسی، مولانا آزاد یونیورسٹی، جودھپور، راجستھان، 15 اکتوبر 2018

یومِ سرسید کا اہتمام

جودھپور: مولانا آزاد یونیورسٹی جودھپور میں مارواڑ مسلم ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی کے زیر اہتمام یومِ سرسید کا اہتمام کیا گیا، جس کی صدارت سوسائٹی کے صدر حاجی عباد اللہ قریشی نے کی اور مہمانِ خصوصی کے طور پر پدم شری پروفیسر اختر الواسع شریک ہوئے۔ اس موقعے پر تقریر کرتے ہوئے مشہور صحافی اور سماجی بنیاد گزار سلیم خلجی نے سرسید کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے تعلیم کی جوجوت جگائی اور علی گڑھ میں کالج قائم کیا۔ یہ اسی کا اثر ہے کہ راجستھان کے اس ریگزار میں مولانا آزاد یونیورسٹی قائم ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ سرسید نے مسلمان کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک ہندوستانی کی حیثیت سے اپنے موقف اور راستے کا تعین کیا۔ اس موقعے پر پدم شری پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ ہندوستان اس پر جتنا بھی فخر کرے کم ہے کہ سرسید نے تمام عالم اسلام میں جدید تعلیم کا پہلا ادارہ علی گڑھ میں قائم کیا اور افریقہ وایشیا میں تعلیمی بیداری میں سرسید تحریک کا نمایاں رول ہے۔ سرسید ادارہ ساز، افراد ساز، فکر وعمل کے پیکر، ماضی آگاہ اور مستقبل شناس شخصیت کے مالک تھے۔ انھوں نے ہمارے مذہب، زبان، ادب، تہذیب اور علمی، فکری سوچ کو ایک نئی مثبت سمت اور رفتار عطا کی۔ سرسید کو سچا خراج عقیدت یہ ہوگا کہ ہم ان کی طرح اپنی آنے والی نسلوں کے بہتر مستقبل کے لیے نئی منصوبہ بندی کے ساتھ سرگرم عمل رہیں۔ پروگرام کے آخر میں مارواڑ مسلم ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی کے ٹریزرار اور سی ای او محمد عتیق نے کہا کہ ہمارے تمام تعلیمی ادارے سرسید کی تحریک سے روشنی لے کر قائم کیے گئے ہیں اور آج سے تیس سال پہلے ہم نے پری پرائمری سے جو تعلیم کا سفر شروع کیا تھا وہ اب مولانا آزاد یونیورسٹی کی صورت میں رواں دواں ہے۔ یومِ سرسید کی اس خصوصی تقریب میں مہمانِ ذی وقار کے طور پر جودھپور کے سب سے سینئر علیگ اور مشہور ڈاکٹر غلام ربانی شریک ہوئے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 17 اکتوبر 2018

مہاراشٹر:

میرے جھروکے سے

ممبئی: ساہتیہ اکادمی ممبئی کے آڈیٹوریم میں گذشتہ روز 'میرے جھروکے سے' عنوان کے تحت معروف نقاد، شاعر اور اسکالر شمیم طارق نے اردو کے ایک اہم نقاد وارث علوی کے افکار واحوال پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ان

کے مطالعے کی وسعت کے علاوہ زبان پر قدرت قابل رشک تھی۔ انھوں نے اس الزام کی تردید کی کہ وارث علوی پھکڑپن کا مظاہرہ کرتے تھے یا جملہ بازی ان کا وطیرہ تھا۔ ان کی شخصیت میں جو ذہین قاری بیٹھا ہوا تھا وہ اس نقاد سے زیادہ اہم تھا جس کو بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ تنقید اور نقاد کو انھوں نے بے لگام ہونے کی آزادی بھی نہیں دی۔ ہاں، چند تحریروں میں ان کا ذاتی تعلق ان کے تنقیدی منصب پر غالب آ گیا ہے۔ اس لیے وہ جانب داری کے مرتکب نظر آتے ہیں مثلاً ان کا یہ لکھنا حقیقت پر مبنی ہے کہ اردو میں ماں پر جو نظمیں لکھی گئی ہیں ان میں فراق کی نظم 'جگنو' اور ندا کی نظم نما غزل 'یادگار' رہ جائیں گی۔ اقبال کی نظم 'والدہ محترمہ کی یاد میں' کلاسک کا درجہ حاصل کر چکی ہے۔ کوئی دوسری نظم اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ عمومی حیثیت سے یہ کہنا درست ہے کہ وارث علوی نے خاکے لکھے، تنقیدی مباحث پر رائے زنی کی، شاعری کا تجزیہ کیا۔ بیدی اور منٹو پر انھوں نے جو کچھ لکھا اس کو نظرانداز کرنا مشکل ہے۔ سودا، ن۔ م۔ راشد اور شوق لکھنوی کی شاعری پر ان کی تحریریں بہت ہی قابل قدر ہیں۔ ہم عصر نقادوں پر انھوں نے جو رائے دی ہے وہ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں تنقید کے نام پر دیا جانے والا فریب بے نقاب ہوتا ہے۔ کہیں کہیں وہ خود بھی اپنی تحریر یا تنقید کی زد میں آ گئے ہیں۔ آزاد، حالی اور شبلی کی تنقیدی نگارشات کو انھوں نے اس دور میں بھی اہم تسلیم کیا جبکہ ان کے ہم عصر ان کو رد کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 30 اکتوبر 2018

ہریانہ:

یوم ہریانہ کے موقعے پر اکادمی بھون میں مشاعرے کا انعقاد

پنچکولہ: ہریانہ اردو اکادمی اور ہریانہ ساہتیہ اکادمی کے زیر اہتمام یوم ہریانہ کے موقعے پر اکادمی بھون پنچ کولہ میں مشاعرے کا انعقاد کیا گیا، بحیثیت صدر مرکزی ساہتیہ اکادمی کے نائب صدر مادھو کوشک نے شرکت کی۔ مہمان خصوصی کے طور پر اپنچ کے لال شریک ہوئے۔ یوم ہریانہ کے تناظر میں منعقد تقریب کے موقعے پر ہریانہ اردو اکادمی کے ڈپٹی چیئرمین و ڈائرکٹر ڈاکٹر چندر ترکھانے کہا کہ کسی بھی زبان میں ادب کے عناصر فکر، جذبہ، اور خیال فن پارے کی شکل ہمارے سامنے آتے ہیں تو اس کی شیریں حلاوت ہمیں اس کی طرف متوجہ کرتی ہے، بعد میں خارجی عوامل کے ذریعے اس کا اظہار کیا جاتا ہے۔ اردو اکادمی کی اردو کے تعلق سے یہ تقریب بھی اسی طرز کا ایک یادگار حصہ ہے۔ ذی وقار شخصیات میں رادھے شیام شرما، ہریانہ گرنتھ اکادمی کے نائب صدر پروفیسر وریندر چوہان، ہریانہ سنسکرت اکادمی کے ڈائرکٹر ڈاکٹر سومیکشر دت شرما، گرنتھ اکادمی کے سابق ڈائرکٹر مکتا، کے علاوہ اردو اکادمی کے رسالہ جمنا تٹ کے مدیر سید عبدالحنان کے ساتھ شاعر جتیندر پرواز بھی شامل تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 1 نومبر 2018

اعزاز و اکرام:

گیارہویں سالانہ اعزازی تقریب

برہانپور: دسویں اور بارہویں جماعت میں امتیازی نمبرات حاصل کرنے والے مسلم طلبا و طالبات کے اعزاز میں مدھیہ پردیش مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی ضلع برہان پور کے زیر اہتمام 30 ستمبر بروز اتوار کو دوپہر 2 بجے گجراتی دھرم شالہ میں ایک اعزازی تقریب کا اہتمام کیا گیا جس میں 85 طلبا و طالبات کی خدمت میں سرٹیفکیٹ اور مومنٹو پیش کیے گئے۔ مذکورہ پروگرام کی صدارت شہر کی مشہور صنعت کار شخصیت جناب سید فرید صاحب نے فرمائی اور مہمان معظم محترمہ ارچنا چٹنس صاحبہ (ریاستی وزیر شعبۂ خواتین و اطفال برائے ترقیاتی امور) نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ بیٹی بچاؤ بیٹی پڑھاؤ کے تحت صوبائی و مرکزی سرکار کی جانب سے تعلیم کے فروغ کے لیے بہت سی سہولتیں فراہم کی گئی ہیں جن کا ہمیں فائدہ اٹھانا چاہیے۔ انھوں نے مزید کہا کہ آج سے 11 سال پہلے ہمارے شہر میں مسلم بچوں کا امتیازی نمبر 74% ہوا کرتا تھا آج یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ مسلم طلبا و طالبات کا امتیازی نمبر 96% تک پہنچ چکا ہے جس کے لیے میں اپنی طرف سے دلی مبارکباد پیش کرتی ہوں۔ اس موقعے پر انھوں نے اپنے ہاتھوں سے تمام طلبا و طالبات کو انعامات تقسیم کئے۔ سوسائٹی کے صدر سید جوزر علی کے مطابق گذشتہ 10 سالوں میں سوسائٹی کی جانب سے مسلم طلبا و طالبات کی حوصلہ افزائی کے لیے تقریباً 700 بچوں کو اعزاز سے نوازا جا چکا ہے۔ ساتھ ہی مختلف میدانوں میں اپنی خدمات پیش کرنے والی شخصیات میں 70 افراد کو اعزاز و اسناد سے نوازا جا چکا ہے۔ اس سال بھی برہان پور کے جناب ماسٹر صابر شیخ (مدرس و کاتب)، مشہور شاعر جناب نعیم اختر خادمی، جناب خلیل اسد (جانشین استاد مسرور شفقی)، جناب ڈاکٹر اشفاق خان (معلم)، صحافت کے میدان سے جناب صداقت پٹھان، جناب رحمٰن پہلوان صاحب کو مختلف ایوارڈ اور توصیفی سند سے نوازا گیا۔ جس کی نظامت اردو رابطہ کمیٹی کے صدر اور نامور شاعر شعور آشنا نے فرمائی۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے اشوک مشرا شریک تھے۔

رپورٹ: تنویر رضا برکاتی، مدیر سہ ماہی دارالسرور برہان پور، 8 اکتوبر 2018

ایک شام علمبردارِ اردو کے نام

نئی دھلی: بزم اردو دبئی کے زیر اہتمام دبئی میں ریختہ فاؤنڈیشن کے بانی سنجیو صراف کے اعزاز میں ایک پروقار محفل شعر و سخن کا انعقاد عمل میں آیا۔ اس محفل کی صدارت عالمی شہرت یافتہ استاد شاعر ڈاکٹر عاصم واسطی نے کی۔ ڈاکٹر واسطی نے اپنے صدارتی خطبے میں سنجیو صراف کو ریختہ فاؤنڈیشن کی کوششوں کی کامیابی پر مبارکباد پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ اردو ادب کے لیے جو کام ریختہ فاؤنڈیشن کر رہی ہے، اردو والے ان کے مقروض ہیں۔ اس موقعے پر بزم اردو کے جنرل سکریٹری ریحان خان نے سنجیو صراف نے کی۔ دبئی آمد پر مسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ بزم اردو دبئی، اردو کی خدمت اور فروغ کے لیے ریختہ فاؤنڈیشن کا ہر طرح سے تعاون کرنے کو تیار ہے۔ بزم اردو دبئی کے صدر شکیل خان نے سنجیو صراف کا استقبال کرتے ہوئے انھیں گلدستہ پیش کیا۔ پروگرام کی نظامت شاداب الفت نے کی۔ مقامی شعرا نے اپنا کلام سنا کر حاضرین سے خوب داد وصول کی۔ اس موقعے پر اعجاز شاہین، احیا بھوج پوری، شاداب الفت، سرور نیپالی، عائشہ عاشی وغیرہ موجود رہے۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 1 اکتوبر 2018

جامعہ کی پروفیسر کو نائب صدر جمہوریہ کا ایوارڈ

نئی دھلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ انٹرڈسپلنری ریسرچ ان بیسک سائنس کی اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر شمع پروین کو ممتاز خواتین سائنسی ایوارڈ 2018 سے نوازا گیا۔ ان کو یہ ایوارڈ نائب صدر جمہوریہ ہند شری ایم وینکیا نائڈو نے اپنے ہاتھوں سے دیا جس میں ایک لاکھ روپے نقد کے علاوہ توصیفی سند بھی شامل ہے۔ ڈاکٹر پروین نے سالماتی حیاتیات تحقیق کے میدان میں کام کیا ہے جس کے مطابق ڈینگو، زکا، انفلوئنزا اور سارس سے متعلقہ وائرس کی تشخیص اور علاج آسان ہوگا۔ شمع پروین کی تحقیقی کاوشوں کو دنیا کے کئی معتبر سائنسی جریدوں میں جگہ مل چکی ہے۔ یہ ایوارڈ جامعہ ہمدرد کے بانی اور معروف حکیم عبدالحکیم کی بیوی سعیدہ بیگم کی یاد میں دیا جاتا ہے۔ اس ایوارڈ کے ذریعے ملک کے تعلیمی اداروں میں تحقیق و تدوین میں نمایاں کام کرنے والی خواتین سائنسدانوں کے قابل ذکر تعلیمی کاموں کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ روزنامہ 'صحافت' دہلی، 25 اکتوبر 2018

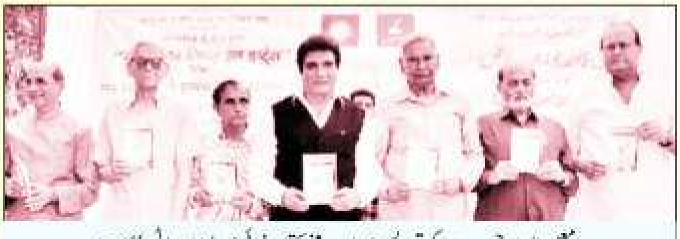

معین الدین حسن مرحوم کی تدریسی خدمات پر مبنی کتاب 'مائی فادر لوزان ہارٹس' کا اجرا

اعجاز فرخ کی کتاب 'مرقع حیدر آباد' کا اجرا

غالب انسٹی ٹیوٹ کو بہترین ادارے کا ایوارڈ

نئی دھلی: ملک اور بیرون ملک میں غالبیات اور اردو فارسی زبان و ادب اور ثقافت کو فروغ دینے والا عالمی شہرت کا نامور ادارہ غالب انسٹی ٹیوٹ کو ادے پور کی سرجن دا اسپارک نامی معروف تنظیم نے ادے پور لٹریچر فیسٹول کے موقعے پر اپنے سب سے بڑے اعزاز سے سرفراز کیا۔ غالب انسی ٹیوٹ کو یہ ایوارڈ بین الاقوامی سطح پر علمی، ادبی اور ثقافتی خدمات کے اعتراف میں بہترین ادارے کے طور پر دیا گیا۔ اس موقعے پر غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر سید رضا حیدر اور ایڈمنسٹریٹو آفیسر ڈاکٹر ادریس احمد کو بھی ان کی علمی اور انتظامی صلاحیت کو مدنظر رکھ کر اعزازات سے نوازا گیا۔ سرجن دا اسپارک راجستھان کی ایک معروف ادبی اور ثقافتی تنظیم ہے جو ہر سال ادے پور میں لٹریچر فیسٹول کا انعقاد کرتی ہے۔ اس دفعہ اس تنظیم نے 'جشن پرواز' کے نام سے تین دنوں کے بڑے جلسے کا انعقاد کیا جس میں مشاعرہ، محفل غزل اور دیگر جلسوں کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اس جلسے کے افتتاحی اجلاس میں تقسیم ایوارڈ کا پروگرام رکھا گیا تھا جس میں ممتاز غزل سنگر پنکج اداس اور ادے پور کی نامور ہستیوں کی موجودگی میں غالب انسٹی ٹیوٹ اور ادارے کے ذمے داران کو اس اعزاز سے سرفراز کیا گیا۔ گذشتہ دنوں غالب انسٹی ٹیوٹ نے ادے پور میں پہلی مرتبہ غالب پر ایک بڑے سیمینار کا انعقاد کیا تھا جسے وہاں کے اہل علم نے بے حد پسند کیا تھا۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 6 اکتوبر 2018

رسم اجرا:

کس سے منصفی چاہیں

نئی دھلی: قومی اقلیتی کمیشن کے سابق چیئرمین اور لاء کمیشن آف انڈیا کے سابق رکن معروف ماہر قانون پروفیسر طاہر محمود کی اردو زبان میں تازہ کتاب 'کس سے منصفی چاہیں' 29 اکتوبر کو منظر عام پر آئی جو اردو کی معروف تنظیم ریختہ کی ویب سائٹ پر بھی آگئی ہے۔ سابق نائب صدر جمہوریہ محمد حامد انصاری اور جموں و کشمیر ہائی کورٹ کے سابق چیف جسٹس بدر دریز احمد نے اس کی اشاعت پر تحسین اور مسرت کا اظہار کیا ہے۔ 400 صفحات پر مشتمل پروفیسر محمود کی اردو میں یہ تازہ کتاب گذشتہ دو سالوں میں راشٹریہ سہارا کے نیشنل پیج پر شائع ہونے والے ان کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ کتاب کے آخر میں مصنف سے متعلق پروفیسر گوپی چند نارنگ، مرحوم رفعت سروش اور خاور ہاشمی کی مختصر تحریریں شامل ہیں۔ پروفیسر محمود، انگریزی اور اردو میں متعدد کتابوں کے مصنف ہیں جن میں سے کئی کے سو سے زائد عدالتی فیصلوں میں حوالے کردیے گئے ہیں۔ اس سے پہلے بھی پروفیسر محمود کے اردو مضامین کے پانچ مجموعے شائع ہوچکے ہیں اور وہ بھی ریختہ کی ویب سائٹ پر موجود ہیں جن میں 2009 اور 2011 میں 'قصہ درد سناتے ہیں' اور 'ہم دشت میں دیتے ہیں اذاں' کے خیال آفریں عنوانات سے شائع ہونے والے مجموعے سب سے زیادہ مقبول ہیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا'، دہلی 31 اکتوبر 2018

مائی فادر لوزان ہارٹس

لکھنؤ: اردو ہمارے ملک میں جنمی، پلی بڑھی زبان ہے، جو آج پوری دنیا میں بولی اور سمجھی جارہی ہے۔ یہ بڑے فخر کی بات ہے کہ اس زبان کو سیکھنے اور سمجھنے کے لیے بیرون ممالک کے لوگ یہاں آرہے ہیں۔ ان خیالات کا اظہار فلم اداکار اور سیاست داں راج ببر نے اسلامیہ کالج لال باغ میں کالج کے سابق انگریزی استاد معین الدین حسن مرحوم کی تدریسی خدمات اور اوصاف پر مبنی انگریزی کتاب 'مائی فادر لوزان ہارٹس' کی تقریب رونمائی کرنے کے بعد کیا۔ انھوں نے کہا کہ یہ کتاب ایک ایسے استاد کے بارے میں ہے جس کے شاگرد انھیں اپنے والد کی طرح مانتے تھے اور وہ استاد خود اپنی اولاد کو اپنے لائق شاگرد کی اہمیت دیتے تھے۔ تبھی تو انھوں نے شاعری کے منظوم ترجمے کے لیے اپنے بیٹے بلکہ لائق شاگرد کو ترجیح دی۔ راج ببر نے سہیل کاکوری کی قلمی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کی طویل مثنوی 'آم نامہ' کے حوالے سے کہا کہ اس کتاب کا بہت تذکرہ سنا تھا، آج مجھے حاصل بھی ہوگئی۔ کالج کے ایکٹنگ منیجر اور معین الدین حسن علوی کے شاگرد ظفریاب جیلانی ایڈوکیٹ نے کہا کہ یہ ان کا حق تھا کہ ان کی صلاحیت اور خدمات پر مبنی کتاب کی رونمائی کالج میں کرائی جائے۔ مسٹر جیلانی نے ایک صدی قدیم کالج اور اقلیتی اداروں کی تاریخ سے واقف کراتے ہوئے کہا اس وقت ہمارے اسلاف نے اقلیتوں کے تحفظ کا پختہ بندوبست کردیا تھا۔ سہیل کاکوری نے استقبالیہ خطبے میں اپنے والد کی خدمات اور اسلامیہ کالج سے ان کے تعلق، اس وقت کے ہمعصروں اور شاگردوں کا تفصیلی خاکہ پیش کیا۔ پروفیسر شارب ردولوی نے معین الدین حسن علوی اور سہیل کاکوری کی زبان و ادب کی خدمات پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ تقریب کی نظامت حسن کاظمی نے کی۔ تقریب میں حسن غنی، سابق وزیر فرید محفوظ قدوائی، ڈاکٹر انیس انصاری، کالج کے منیجر شفیق مرزا وغیرہ نے بطور خاص موجود ہے۔ اس موقعے پر ادبی سنستھان کی جانب سے راج ببر کو مومنٹو پیش کیا گیا۔ اس کے علاوہ تعلیمی شعبے میں بہترین خدمات انجام دینے کے لیے راشد مینائی، شبانہ فاطمہ کاکوروی اور اپوروا مشرا کو بھی راج ببر کے بدست اعزاز سے نوازا گیا۔ تقریب میں پروفیسر خان محمد عاطف، اطہر نبی ایڈوکیٹ، سلام صدیقی، عائشہ صدیقی، ڈاکٹر مسعود الحسن عثمانی، ایف اے ایس جرچلی، اشعر علیگ، عرفان علیگ، حبیب انور علوی، پرویز ملک زادہ، نلنج مشرا، صابرہ حبیب، فضل انعام، ڈاکٹر احتشام حسین، ڈاکٹر مسیح الدین، عطیہ بی، ریحانہ عباسی سمیت بڑی تعداد میں معززین شہر موجود رہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 16 اکتوبر 2018

مرقع حیدر آباد

لکھنؤ: حیدر آباد سے لکھنؤ تشریف لائے معروف مورخ، محقق اور ادیب اعجاز فرخ کے اعزاز میں یونائیٹڈ اسپتال سبھاش مارگ کے آڈیٹوریم میں ایک 'ادبی مخاطبہ' کا انعقاد ہوا۔ پروگرام کی ابتدا میں منتظمین ڈاکٹر عدنان عزیز، ڈاکٹر محمد مجیب، ڈاکٹر فیصل اور ڈاکٹر شمائلہ نے اعجاز فرخ کی خدمت میں گلدستہ پیش کیا۔ اس کے بعد اعجاز فرخ کی تازہ ترین کتاب 'مرقع حیدر آباد' کی رسم اجرا عمل میں آئی۔

اعجاز فرخ نے موجودہ زوال پذیر صورت حال پر ارباب سیاست کی بے حسی اور اپنوں کی بے اعتنائی پر تشویش کا اظہار کیا۔ پروگرام کے آغاز میں کنوینر شاہد کمال نے اعجاز فرخ کی تہذیبی و علمی شخصیت کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ موجودہ عہد میں اعجاز فرخ حیدرآبادی تہذیب و ادب کا زندہ مرقع ہیں۔ جس طرح لکھنؤ کی تہذیب کو سرشار، عبدالحلیم شرر، مرزا رسوا، مرزا جعفر حسین اور دہلی کو محمد حسین آزاد، سرسید اور خواجہ حسن نظامی نے عالمی منظرنامہ پر اپنی تحریروں کے ذریعے شاخت دی لیکن حیدرآباد کو اس طرح کا کوئی مورخ اور ادیب نصیب نہ ہو سکا۔ اعجاز فرخ نے اس بار گراں کو اپنے شانوں پر اٹھایا اور حیدرآباد کو علمی سطح پر صحیح تاریخ سے متعارف کرانے کا کام کیا۔ اس سلسلے کی اہم کڑی 'مرقع حیدرآباد' ہے۔ ادبی مخاطبے میں اعجاز فرخ سے لکھنؤ اور حیدرآباد کی تہذیبی و لسانی مماثلت اور بگڑتی تہذیبی و لسانی صورت حال پر مکالمہ ہوا جس میں عادل فراز اور پرویز ملک زادہ نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ادبی مخاطبہ میں شعری نشست کا اہتمام بھی کیا گیا تھا جس میں وکرم شری واستو، سلمان خیال، اسریٰ رضوی، حنا رضوی، عائشہ ایوب، ڈاکٹر احمد ایاز، دیدار اکبرپوری، قمر عباس قمر، واصف فاروقی، ظفر نقی اور پروگرام کے کنوینر شاہد کمال نے اپنا کلام پیش کیا۔ نظامت عادل فراز نے کی۔ پروگرام کے اختتام پر یونائیٹڈ اسپتال کے منتظمین اور کنوینر شاہد کمال نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ یہ پروگرام ملت ایجوکیشنل ٹرسٹ کے زیر اہتمام منعقد ہوا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 16 اکتوبر 2018

انبیائے کرام کا منہج دعوت

پانی پت: انبیائے کرام کا منہج دعوت نامی کتاب کے اجرا کے موقعے پر مولانا محمد کلیم صدیقی نے کہا ہے کہ بنی نوع انسان کی اکثریت آج بھی مذہبی خیالات کی حامل ہے، فرق اتنا ہے کہ بڑی تعداد میں لوگوں کو آب حیات کی تلاش ہے، حسن اتفاق کہ مطلوبہ آب حیات اہل اسلام کے پاس ہے اور وافر ہے، مگر سوئے قسمت کہ یہ خیر امت اس آب حیات کو دوسروں تک پہنچانے میں ناکام ہے۔ اسی کوتاہی کے سبب آج مسلمان ادبار کا شکار ہے۔ واضح ہو کہ زیر بحث کتاب کو نوجوان عالم دین مولانا مسرت ندوی یمنا نگری نے ترتیب دیا ہے، جس میں امت مسلمہ کا فریضہ، موجودہ دور میں دعوت کا طریقہ کار، انسانی برادری کے حقوق کی ادائیگی، توحید کی دعوت، اجر سے استغنا، قوم کی زبان میں دعوت، حلم وعفو کی تربیت، تدریج و ترتیب، عدل، ایفائے عہد، صدق و امانت، مدعو کے پاس خود جانا، ایثار و قربانی، اسلام میں انسانی حقوق کا تصور، پیام انسانیت، قوموں کے عروج و زوال کے اسباب عفت و پاک دامنی جیسے موضوعات پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ مسلم پرسنل لا بورڈ کے شہر قاضی مفتی محمد عاشق صدیقی نے کہا ہے کہ یہ کتاب اپنے موضوع کے لحاظ سے اچھوتی کتاب ہے اور اس کا انداز منفرد ہے۔ آخر میں کتاب کے مصنف مسرت ندوی نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 2 نومبر 2018

فاروق ارگلی کی کتاب 'جواہر عظیم آباد' پر مذاکرہ

نئی دهلی: غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام شام شہریاراں کے موقعے پر معروف صحافی و مصنف فاروق ارگلی کی کتاب 'جواہر عظیم آباد' پر مذاکرے کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقعے پر اپنی صدارتی گفتگو میں مولانا آزاد نیشنل یونیورسٹی، جودھپور کے وائس چانسلر اور معروف اسکالر پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ اس کتاب میں فاروق ارگلی نے ذرہ برابر بھی تعصب سے کام نہیں لیا ہے۔ فاروق ارگلی کی خاصیت یہ ہے کہ انھوں نے قلم کی بنیاد پر اپنے آپ کو منوایا ہے۔ فاروق ارگلی کی فکر بڑی زرخیز ہے۔ انھوں نے ادب و ثقافت، تاریخ و تہذیب اور مختلف موضوعات پر قلم اٹھایا ہے اور اپنے تدبر سے صاحبان فہم کو ہمیشہ علمی تحفظ پیش کیا ہے۔ جواہر عظیم آباد میں بہار کی اہم شخصیات کی خدمات کو سراہا گیا ہے۔ فاروق ارگلی کی یہ کتاب ادب سے متعلق ریسرچ کرنے والے طلبہ و اسکالرس کی بھرپور مدد کرے گی۔ جواہر عظیم آباد کے مصنف فاروق ارگلی نے کہا کہ میں غالب انسٹی ٹیوٹ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ اس ادارے نے میری کتاب پر اتنے اہم مذاکرے کا انعقاد کیا۔ میں نے اب تک مختلف موضوعات پر تقریباً ڈیڑھ سو سے زائد کتابیں تحریر کی ہیں۔ جواہر عظیم آباد تنقید پر مبنی کتاب نہیں ہے۔ اس میں میں نے جن شخصیات پر قلم فرسائی کی ہے ان کی خدمات کو سراہا ہے اور ان کے علمی کاموں کو ایک جگہ اکٹھا کرنے کی کوشش کی ہے۔ پروفیسر مولا نا بخش نے کہا کہ آزادی کے بعد جن مصنفین نے اپنی تحریروں سے ادب میں اپنا ایک اہم مقام پیدا کیا ہے ان میں فاروق ارگلی ہمیشہ نمایاں نظر آتے ہیں۔ ماہنامہ 'آجکل' کے ایڈیٹر ڈاکٹر ابرار رحمانی نے کہا کہ یہ کتاب موجودہ دور کے تذکروں میں قابل ذکر ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تعریف کے ساتھ تنقید بھی کی جائے، کتاب میں حفظ مراتب کا خیال نہیں رکھا گیا ہے۔ اگر شخصیات کو کتاب میں جگہ دیتے وقت ان کی عمر یا جدید تحقیق کے طریقۂ کار کو اختیار کیا جاتا تو اچھا ہوتا۔ حقانی القاسمی نے کہا کہ مادی عہد میں لفظوں سے تعلق کو استوار رکھنے والے اہم مصنفین میں ایک اہم نام فاروق ارگلی کا بھی ہے۔ فاروق صاحب نے غیر جانبدارانہ انداز میں کتاب لکھی ہے۔ کتاب میں بہار کی اہم تاریخی اور موجودہ شخصیات میں متحرک و فعال شخصیات کا انتخاب کیا ہے۔ بہار اردو اکادمی کے سابق سکریٹری مشتاق احمد نوری نے کہا کہ میں اس کتاب پر فاروق ارگلی کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر سید رضا حیدر نے اپنی استقبالیہ تقریر میں کہا کہ یہ کتاب ایک دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں بہار کی اہم ترین شخصیتوں کو اکٹھا کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ اس پروگرام کی نظامت کرتے ہوئے نورین علی حق نے کہا کہ تذکروں کی فہرست میں اس کتاب کا نام زریں حروف سے لکھا جائے گا۔ اس موقعے پر دہلی کی معزز شخصیات نے شرکت کی اور پروگرام کو کامیاب بنایا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی 27 اکتوبر 2018

کشمکش

نئی دهلی: پٹنہ شہر صوبہ بہار کی مشہور و معروف افسانہ و فکشن نگار اور شاعرہ معصومہ خاتون تہذیب نو کے دفتر آرام پارک شاستری میں تشریف لائیں جہاں ان کے افسانوی مجموعہ 'کشمکش' کی رسم اجرا عمل میں آئی۔ اس موقعے پر پروفیسر شہریار ایڈیٹر این سی ای آر ٹی نے کہا کہ معصومہ

خاتون اردو افسانہ نگاری کے میدان میں اعتبار حاصل کر رہی ہیں۔ ان کے افسانوں کو پڑھنے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ اردو ادب کی جڑیں ابھی مستحکم ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ معصومہ خاتون پہلو بدل بدل کر نثری ادب کی تخلیق میں اپنا نام رقم کر رہی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ تخلیق کار اپنا سرمایہ بانٹ رہا ہے۔ ہم مقروض ہو رہے ہیں اور یہ قرض نسل در نسل قرض حسنہ کی صورت میں باقی رہتا ہے یہ وہ خزانہ ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتا۔ پروفیسر چمن آرا این سی ای آر ٹی نے کہا کہ آج کے لکھنے والوں کے سامنے سماجی اور تہذیبی مسائل ہیں۔ شاعر سرور نگینوی نے کہا کہ معصومہ خاتون بیک وقت ناول، افسانہ اور شاعری کے میدان میں سرگرم عمل ہیں۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ دراصل کس صنف ادب سے ان

کی روحانی وابستگی ہے۔ ادب سے ان کی وابستگی جنون کی حد تک ہے۔ واضح رہے کہ معصومہ خاتون نے ناول اور متعدد افسانے لکھے ہیں۔ ان کی شاعری کا سرمایہ بھی کم نہیں ہے۔ معصومہ خاتون کے اندرون میں جو تیز ابی بہاؤ ہے، وہ یقیناً انھیں اس منزل پر پہنچا کر دم لے گا جہاں تک پہنچنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ اس موقعے پر محمد شاہق، زیبا خاتون، مشرف عالم اور عالیہ فلاحی موجود تھے۔

روز نامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 22 اکتوبر 2018

رو برو

دیوبند: شاعر دلشاد خوشتر کے مجموعہ کلام 'روبرو' کی رسم اجرا معروف شاعر ڈاکٹر نواز دیوبندی، ممتاز قلمکار مولانا نسیم اختر شاہ قیصر اور پروفیسر الف ناظم کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ نواز گرلز پبلک اسکول میں منعقد تقریب رونمائی کی صدارت دارالعلوم وقف دیوبند کے استاد مولانا نسیم اختر شاہ قیصر نے کی۔ پروگرام سے خطاب کرتے ہوئے اترپردیش اردو اکادمی کے سابق چیئرمین و معروف شاعر ڈاکٹر نواز دیوبندی نے کہا کہ دلشاد خوشتر ایک کہنہ مشق شاعر ہیں جو گذشتہ تیس سال سے دیوبند کی ادبی محفلوں کو پر رونق کر رہے ہیں، ان کا مجموعہ کلام ان کے ادبی ذوق اور ادب کے میدان میں ان کی محنتوں اور مشقتوں کا گواہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ جو بھی نوجوان شاعر مستقبل میں اپنا مجموعہ کلام مرتب کرے گا، اس کی اشاعت کے لیے نواز گرلز پبلک اسکول کی جانب سے پچیس فیصد کا تعاون دیا جائے گا۔ مہمان خصوصی دیوبند ڈگری کالج کے پروفیسر الف ناظم نے اپنے خطاب میں کہا کہ پورا مجموعہ کلام روایتوں کی پاسداری کرتا ہے، ہر شعر غزل، نعت و حمد بھی معیاری ہیں اور طویل مدت تک سامعین کے دلوں میں زندہ و تابندہ رہیں گی۔ تمام احوال کو انھوں نے اپنے انداز اور لب و لہجہ میں بیان کیا ہے۔ پروگرام کا آغاز قاری سلیم احمد کی تلاوت کلام پاک اور سہیل اکمل کی نعت پاک سے ہوا۔ پروگرام کی نظامت سید وجاہت شاہ نے انجام دی۔ دلشاد خوشتر نے تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

روز نامہ 'خبریں' دہلی، 15 اکتوبر 2018

'ڈنک'

کرلا: ادارہ ادب اسلامی و ہفت روزہ خبر مشن، ممبئی کے زیر اہتمام معروف افسانچہ نگار محترم ایم اے حق کے افسانچوں کے مجموعہ 'ڈنک' کا اجرا کرلا کے سماجی خدمت گار اور میونسپل کاؤنسلر جناب عبدالرشید کپتان ملک کے دست مبارک سے عمل میں آیا جبکہ اس پُر وقار تقریب کی صدارت انجمن اسلام کے نائب صدر عالی جناب ڈاکٹر شیخ عبداللہ نے

فرمائی۔ انٹرنیشنل افسانچہ فاؤنڈیشن کے صدر ڈاکٹر نخشب مسعود (مالیگاؤں) نے بطور مہمان خصوصی نیز ڈاکٹر تسلیم عارف (رانچی) نے بطور مہمان اعزازی شرکت کی۔ ڈاکٹر عبداللہ نے صدارتی خطبہ دیتے ہوئے کہا کہ واقعی ایم اے حق صاحب کے افسانچے مثل ڈنک ہیں جو براہ راست قاری کے ذہن و دل پر ڈنک مارتے ہیں اور قاری تادیر اس کے زیر اثر رہتا ہے، یہ بات ان کی کامیابی کی ضمانت ہے۔ پروگرام کے کنوینر عبداللہ مسرور کے شکریے پر تقریب کا اختتام ہوا۔

پریس ریلیز: اشتیاق سعید، ممبئی 14 اکتوبر 2018

پسینہ کی خوشبو

لکھنؤ: عصر حاضر کے ترقی پسند شاعر خالد اعظمی کے تازہ ترین شعری مجموعہ کلام 'پسینہ کی خوشبو' کی تقریب رونمائی میڈیا اینڈ انٹرٹینمنٹ ریسرچ فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام انٹگرل یونیورسٹی کے سینٹرل آڈیٹوریم میں ہوئی۔ مہمانوں کا استقبال و تعارفی کلمات عابد حبیب نے ادا کیے اور نظامت کا مشترکہ فریضہ سید معراج اور شکیل گیاوی نے انجام دیا۔ 'پسینہ کی خوشبو' کا اجرا جن مہمان گرامی کے دستہائے مبارک سے عمل میں آیا۔ ان میں پروفیسر ایم اے خالد، مولانا محمد قاسم کچھوچھوی، پروفیسر نفیس بانو بنارس ہندو یونیورسٹی، سریندر راجپوت سوشل ورکر، پروفیسر مطیع الرحمٰن شیروانی علی گڑھ یونیورسٹی، بی ڈی نقوی سابق جج کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ اس موقعے پر دوسرے سیشن میں ایک شاندار مشاعرے کا اہتمام بھی ہوا جس میں سامعین میں ڈاکٹر جہاں سلیم، مسز بالی کے علاوہ یونیورسٹی کے طلبہ و طالبات نے خوب شعری استفادہ کیا۔

روز نامہ 'انقلاب' دہلی، 29 اکتوبر 2018

'مظہر امام کا اکلوتا افسانہ: تجزیہ'

دربھنگہ: پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کی تازہ ترین کتاب 'مظہر امام کا اکلوتا افسانہ: تجزیہ' کی رونمائی کرتے ہوئے معروف ادیب، شاعر، افسانہ نگار اور صحافی ف س اعجاز (مدیر ماہنامہ 'انشا' کولکاتا) نے گذشتہ سنیچر 27 اکتوبر کو ماہنامہ 'انشا' کے دفتر واقع زکریا اسٹریٹ، کولکاتا میں کہا کہ مظہر امام کو دنیا شاعر، ادیب و صحافی کی حیثیت سے جانتی ہے تاہم انھوں نے افسانہ نگاری بھی کی ہے۔ اس کا انکشاف میرے ہاتھوں میں موجود کتاب سے ہوا، جس میں ان کے ستر سال قبل مطبوعہ افسانہ 'آخر اس درد کی دوا کیا ہے' کا بھر پور جائزہ لیتے ہوئے مناظر عاشق ہرگانوی نے اسے ایک کتاب کی شکل عطا کر دی اور اسے ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا۔

روز نامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 1 نومبر 2018

وفیات:

قاضی عبدالستار

نئی دہلی: اردو کے مشہور فکشن نگار اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے سابق استاد پروفیسر قاضی عبدالستار کا مختصر علالت کے بعد 29 اکتوبر 2018 کو پچھلے پہر انتقال ہو گیا۔ وہ 85 برس

کے تھے۔ وہ شری گنگا رام اسپتال میں پچھلے ڈیڑھ مہینے سے زیر علاج تھے۔ جسد خاکی علی گڑھ لے جایا گیا جہاں تدفین عمل میں آئی۔ ساہتیہ اکادمی ایوارڈ یافتہ قاضی عبدالستار کے ایک سے زیادہ شاگرد مختلف شعبہ ہائے زندگی میں نمایاں خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ان کے مداحوں کی بھی فہرست طویل ہے۔ وہ ایک انتہائی اچھے استاد تھے۔ ان کا شمار اپنے عہد کے نمایاں افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کے افسانوں میں پیتل کا گھنٹہ اور ناولوں میں حضرت جان اور دارا شکوہ بہت مقبول ہوئے۔ ان کو زبان و بیان پر جو غیر معمولی قدرت حاصل تھی، اس کا اندازہ ان کی تحریروں سے بہ آسانی لگایا جا سکتا ہے۔

روز نامہ 'انقلاب' دہلی، 30 اکتوبر 2018

قمر گونڈوی

گونڈہ: اردو ادب کے عظیم شعرا اصغر و جگر کی روایتوں کے امین کوچۂ جگر کے روح رواں بزرگ شاعر و ادیب

قمرالدین خاں (قمر گونڈوی) نے طویل علالت کے بعد 29 اکتوبر کو الوداع کہہ دیا اور اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ ان کا انتقال گونڈہ ضلع اسپتال میں دل کا دورہ پڑنے سے ہوا۔ وہ تقریباً دو سال سے لقوے کی زد میں تھے اور زیر علاج تھے۔ ان کی عمر تقریباً 84 سال تھی۔ بعد نماز عشا انھیں اترولہ روڈ واقع قلعہ قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔ قمر گونڈوی کے انتقال کی خبر سے اردو حلقہ میں

صف ماتم بچھ گئی۔ وہ آئی ٹی آئی میں فارماسسٹ تھے جہاں سے 1993 میں ریٹائرڈ ہوئے تھے۔ بعد از ریٹائرمنٹ مسلسل ادب کی خدمت انجام دینا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ 2009 میں ان کی اہلیہ رضیہ خاں اس دارفانی سے کوچ کرگئی تھیں۔ ان کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ اہلیہ کے انتقال کے بعد جب وہ نہایت گم صم رہنے لگے تو بڑے بھائی کے پوتے داراب خاں یوسف زئی نے انھیں سہارا دیا اور اخیر دم تک ان کی خدمت انجام دیتے رہے۔

قمرالدین خاں عرف قمر گونڈوی گونڈہ شہر کے فیض آباد روڈ توپ خانہ محلے کے علیم الدین خاں کے گھر 6 جولائی 1935 میں پیدا ہوئے تھے۔ ابتدائی تعلیم مکتب میں حاصل کی۔ اس کے بعد ہائی اسکول کرنے کے بعد وہ کوچۂ جگر میں جانے لگے اور پھر حضرت جگر کی محفلوں نے انھیں ہمیشہ کے لیے اپنا ہی بنا لیا۔ اس کے بعد سے بس جگر صاحب کی خدمت کرنا ان کا مشغلہ ہوگیا۔ جگر صاحب اپنے ساتھ انھیں مشاعروں میں بھی لے جایا کرتے تھے۔ انھوں نے بھی دھیرے دھیرے شاعری شروع کردی جگر صاحب کے انتقال کے بعد انھوں نے معروف شاعر واصف نانپاروی سے تلمذ حاصل کیا۔ کم دنوں میں ہی ہندوستان کے مشاعروں کے ساتھ پاکستان اور برصغیر کے دیگر ممالک کے مشاعروں میں قمر گونڈوی کی دھوم مچنے لگی۔ قمر گونڈوی نے شاعری کے ساتھ ساتھ نثری خدمات کو بھی انجام دیا۔ شروعات میں انھوں نے روزناموں و رسالوں میں ادبی مضامین لکھے۔ آگے چل کر انھوں نے کئی ادبی کتابیں تصنیف کیں جن میں شعلۂ شوق، میر سنگ میل، مجروح سلطانپوری 'فن اور شخصیت'، موج رواں، پروفیسر وسیم بریلوی کے نام سرفہرست ہیں۔ انھوں نے ایک درجن سے زیادہ ادبی کتابیں تصنیف کیں جو اردو اکادمی اترپردیش سے شائع ہوکر منظر عام پر آئیں۔ ان کی ادبی خدمات کے لیے اردو اکادمی اترپردیش نے 2013 میں 'موج رواں' کے لیے 'پروفیسر ملک زادہ منظور احمد ایوارڈ' سے نوازا گیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 30 اکتوبر 2018

مضطر مجاز

مہاراشٹر: ادبی دنیا کے ایک قدآور شاعر ترجمان غالب و اقبال کا 19 اکتوبر 2018 کو 7 بجے شام اچانک انتقال ہوگیا۔ وہ 83 سال کے تھے۔ اپنی تمام زندگی شعر و ادب کی آبیاری میں صرف کردی۔ شاعر کے ساتھ بلند پایہ مترجم نقاد اور صحافی بھی تھے۔ ان کے دو شعری مجموعے 'موسم سنگ' اور 'اک سخن اور' کے علاوہ ان کی شاعری کی کلیات طلسم مجاز شائع ہوچکی۔ وہ فارسی کے بھی ماہر تھے انھوں نے اقبال کے کلام کو فارسی کا روپ دیا۔ روزنامہ 'منصف' کے ادبی ایڈیشن 'آئینۂ ادب' کے مرتب بھی تھے انھیں غالب ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر م ق سلیم صدر شعبۂ اردو شاداں کالج، حیدرآباد، 20 اکتوبر 2018

عنایت اختر

ممبئی: ممبئی کے معروف ترقی پسند ادیب عنایت اختر جن کا پورا نام اختر حسین محمد یوسف تھا۔ 92 سال کی عمر میں مختصر علالت کے بعد اس دنیا سے کوچ کرگئے۔ وہ بہت مخلص، نفیس، سادہ اور کریم النفس انسان تھے۔ وہ اخبارات میں ترقی پسند ادب اور تحریک کے حوالے سے مضامین لکھا کرتے تھے۔ انھوں نے ٹی وی پر نکڑ، منورجن، سرکس، یہ زندگی، رجنی، اور 'الف لیلیٰ' کے نام سے سریلز لکھی۔ عنایت اختر مرحوم اپنی نوعمری کے زمانے سے اپنے انقلابی اور ترقی پسند مزاج کے سبب ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہوگئے۔ وہ سکہ بند مارکسزم سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ اور وہ اس تحریک کے 'گراس روٹ لیول' کے نظریاتی کارکن تھے اور ترقی پسند سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ وہ تاحیات اپنے انقلابی اور یساریت پسند نظریات پر سختی سے قائم رہے۔ وہ اس سلسلے میں سودے بازی نہیں کرتے تھے۔ لہٰذا لوگوں نے ان کو نظر انداز کرنا شروع کردیا تھا۔ وہ یعقوب گلی کے ایک چھوٹے سے کمرے میں 'ادارہ قلم' کے نام سیادبی علمی اور نظریاتی محفلیں منعقد کرتے تھے۔ عنایت اختر تاحیات معاشی طور پر آسودہ زندگی نہیں گزار سکے وہ اپنی انحرافی ذہنی دانش اور انقلابی سرشت کے باعث کوئی کام لگ کر نہیں کرسکے۔ انھوں نے اپنی مختصر یاداشتوں کو اخبارات کے لیے قلم بند کیا۔ جن سے ان کی زندگی کے مختلف پہلوں پر روشنی پڑتی ہے۔ ان کے چند کالم ممبئی کے ادبی جریدے 'نیا ورق' میں بھی شائع ہوتے۔

مجگاوں کے رحمت آباد قبرستان پیوند زمین ہوئے۔ انھوں نے پس ماندگان میں بیوہ دو بیٹے سمیر اور عرفی اختر حسین اور ایک بیٹی سیما چھوڑی ہے۔

پریس ریلیز: احمد سہیل، 22، ٹریل ہولوپین، پیلس ٹین، ٹی ایکس 75801 (یو ایس اے)، 13 نومبر 2018

انیس چشتی

نئی دہلی: مشہور انگریزی صحافی انیس چشتی کا 10 اکتوبر کو مختصر علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر تقریباً 80 برس تھی۔ ان کی اہلیہ کا دو برس قبل انتقال ہوگیا تھا۔ پسماندگان میں ان کی بیٹی معروف انگریزی صحافی سیما چشتی (ڈپٹی ایڈیٹر روزنامہ 'انڈین ایکسپریس') ہیں۔ انیس چشتی کا وطنی تعلق اترپردیش کے دیوریا ضلع سے تھا۔ انھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد دہلی کو اپنا مسکن بنایا تھا۔ وہ انگریزی جریدے 'مین اسٹریم' اور 'سیمینار' کے لیے مسلسل مضامین تحریر کرتے تھے۔ انھوں نے مختلف پبلشنگ ہاؤسوں کے لیے درجنوں انگریزی کتابوں کی ایڈیٹنگ کے فرائض بھی انجام دیے۔ اس کے علاوہ اپنی اہلیہ کے ساتھ مل کر 'اپ جن' کے نام سے ایک سہ ماہی جرنل بھی نکالا کرتے تھے۔ وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے فاؤنڈر ممبر تھے۔ انھیں آج سیکڑوں سوگواروں کی موجودگی میں بعد نماز مغرب جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قبرستان میں سپرد خاک کردیا گیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 11 اکتوبر 2018

پروفیسر غلام مجتبیٰ انصاری

پٹنہ: فارسی اور اردو کے شعبے میں ایوارڈ یافتہ اور سابق پروفیسر غلام مجتبیٰ انصاری کا انتقال ہوگیا۔ غلام مجتبیٰ انصاری مشہور ادبی شخصیت اور فارسی کے محتاط محقق رہے ہیں۔ اردو زبان و ادب اور فارسی کے شعبے میں ان کی نمایاں کارکردگی پر صدر جمہوریہ ہند کی جانب سے انھیں ایوارڈ سے نوازا گیا۔ بلاشک ان کے وصال سے فارسی اور اردو ادبی دنیا کا بھی بہت بڑا نقصان ہوا ہے۔ فارسی اور اردو کے شعبے میں ان کی ادبی حصولیابیاں مصنفین، دانشوران اور ناقدین کی حوصلہ افزائی جاری رکھیں گی اور محققین کے لیے مفید ثابت ہوں گی۔ وہ ایک اچھے انسان تھے۔ وہ مہذب، خوش اخلاق، خوش مزاج اور ضمیر شناس تھے۔ خداوند تعالیٰ ان کے اہل خانہ و افراد اور جمیع متعلقین کو صبر جمیل و استقامت نصیب فرمائے۔ اس موقعے پر خالد انور انصاری، پروفیسر حسن نشاط انصاری اور قیوم انصاری نے اظہار تعزیت پیش کی۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 17 اکتوبر 2018

خراج عقیدت:

قاضی عبدالستار گنگا جمنی تہذیب کے امین تھے

علی گڑھ: شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں پدم شری پروفیسر قاضی عبدالستار کی یاد میں تعزیتی جلسے کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت معروف استاد پروفیسر مسعود الحسن نے کی۔ اس موقعے پر خطاب کرتے ہوئے شعبہ اردو کے صدر پروفیسر طارق چھتاری نے کہا کہ قاضی صاحب منفرد اور ممتاز تھے۔ انھوں نے جب تاریخ پر لکھا تو اس میں حق ادا کردیا۔ سماج پر لکھا تو اس کا بھی حق ادا کیا۔ ان کی جو زبان تھی اس کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ انھوں نے کہا کہ قاضی صاحب کے انتقال سے سب سے بڑا نقصان ان کے شاگردوں کو ہوا ہے۔ ان کے کئی شاگرد ایسے ہیں

جن کو قاضی صاحب نے اپنے بچوں کی طرح رکھا اور ادبی تربیت کی۔ رسالہ 'تہذیب الاخلاق' کے مدیر پروفیسر صغیر افراہیم نے کہا کہ قاضی صاحب گنگا جمنی تہذیب کے امین تھے وہ آج ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن ان کے افکار و خیالات زندہ جاوید رہیں گے۔ پروفیسر مولا بخش نے کہا کہ قاضی عبدالستار نے اپنی تاریخی ناولوں میں کمپوزٹ کلچر کو بہت خوبصورتی سے دکھایا ہے جو انہی کا کمال ہے۔ اللہ انھیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا کرے۔ پروفیسر راشد انور راشد نے کہا کہ قاضی صاحب ایک صاحب اسلوب ادیب تھے۔ انھوں نے تاریخی ناول کے ذریعے جو وقار اردو فکشن کو عطا کیا وہ بے نظیر ہے۔ ڈاکٹر زبیر شاداب نے کہا کہ اردو کا سب سے بانکا فکشن نگار ہم سے جدا ہوگیا، اسلوب کا معاملہ ہو یا مضمون کا معاملہ انھوں نے ہر انداز میں اپنی منفرد شناخت قائم کی۔ مجھے نہیں لگتا کہ اب اردو دنیا میں کوئی دوسرا قاضی عبدالستار پیدا ہوگا۔

ڈاکٹر مشتاق صدف نے کہا کہ قاضی عبدالستار جیسے تخلیق کار صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ تعزیتی جلسے سے پروفیسر غضنفر، پروفیسر انور علی، پروفیسر سید محمد امین میاں قادری، پروفیسر آذرمی دخت صفوی، پروفیسر قاضی افضال حسین، پروفیسر سعید، پریم کمار وغیرہ نے بھی خطاب کیا جبکہ نظامت کے فرائض پروفیسر سراج اجملی نے انجام دیے۔ اس موقعے پر پروفیسر لطیف حسین شاہ کاظمی، پروفیسر عاصم صدیقی، پھر پروفیسر اے جے بسماریہ، پروفیسر عاشق علی، پروفیسر شمبھو ناتھ، پروفیسر عبدالعلیم، پروفیسر خورشید، پروفیسر قمرالہدیٰ فریدی، پروفیسر سید محمد ہاشم، پروفیسر تصدق حسین، پروفیسر مہتاب حیدر نقوی، ڈاکٹر راحت ابرار، ڈاکٹر اقبال صدیقی، ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب، ڈاکٹر سیما صغیر، ڈاکٹر نیلم فرزانہ، ڈاکٹر خالد سیف اللہ، ڈاکٹر امتیاز، معید رشیدی، مہر الٰہی ندیم، خالد فریدی کے علاوہ بڑی تعداد میں مسلم یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلبا نے شرکت کی اور قاضی عبدالستار کے لیے دعائے مغفرت کی۔ وہیں دوسری جانب جامعہ اردو علی گڑھ میں بھی ایک تعزیتی نشست کا انعقاد کیا گیا جس سے خطاب کرتے ہوئے او۔ ایس۔ ڈی فرحت علی خاں نے کہا کہ قاضی عبدالستار ایک دور کے نمائندہ تھے اور آج وہ دور ختم ہوگیا۔ انھوں نے کہا کہ قاضی صاحب کے ناول 'داراشکوہ' اور 'شب گزیدہ' وہ تخلیقات ہیں جو صرف قاضی صاحب کے قلم سے ہی ممکن تھیں۔ جامعہ اردو سے انھیں 'بابائے ادب' اور 'سلطان اردو' کے ایوارڈ سے بھی سرفراز کیا گیا تھا۔ رجسٹرار شمعون رضا نقوی نے کہا کہ صاحب کے انتقال سے اردو ادب کو جو خسارہ ہوا ہے اس کی بھرپائی ممکن نہیں۔ کنٹرولر رضوان علی خاں نے کہا کہ قاضی صاحب جیسا ناول نگار اب پیدا ہونا ممکن نہیں۔ وہ ایک منفرد تخلیق کار تھے۔ شیخ الجامعہ مساعد قدوائی نے کہا قاضی عبدالستار ایک شخصیت کا نام نہیں تھا بلکہ قاضی عبدالستار ایک عہد کا نام تھا۔ آخر میں جامعہ اردو کے انتظامیہ اور اراکین نے قاضی صاحب کے لیے دعائے مغفرت کی۔ وہیں اردو دنیا کے معروف نقاد پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے قاضی صاحب کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ قاضی صاحب اردو کے ان مایہ ناز افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں میں تھے جن کی وفات کی تلافی نہیں ہوسکتی۔ ان کے ناول صلاح الدین ایوبی اور داراشکوہ تاریخی حیثیت کے ناول ہیں۔ انھیں ترقی پسند مصنفین میں شمار کیا جاتا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ ترقی پسندی اور جدیدیت سے بہت بلند تھے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 2 نومبر 2018

Subscription Form "Urdu Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'اردو دنیا' کا رکن سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

150 روپے کا ڈرافٹ/ منی آرڈر.................. بتاریخ.................. بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِ تعاون سالانہ -/150 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: SYNB0009009 میں جمع کروا دیا ہے۔

آپ 'اردو دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

دستخط

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159، E-mail.:sales@ncpul.in

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

اردو لوک ناٹک: روایت اور اسالیب (حصہ اوّل)

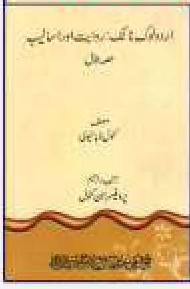

مصنف: کنول ڈبائیوی

ترتیب وترمیم: پروفیسر ابن کنول

صفحات: 482

قیمت: 170 روپے

حفظانِ صحت

ادارہ

صفحات: 682

قیمت: 285 روپے

جدید ہندی شاعری پر اردو کا اثر

مصنف: ڈاکٹر نریش

صفحات: 155

قیمت: 90 روپے

ملاقاتیں (مشاہیر کے انٹرویو)

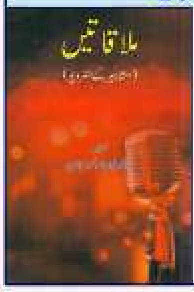

ترتیب: پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین

صفحات: 578

قیمت: 241 روپے

فرہنگ ادبیات (لسانی وادبی اصطلاحات کا توضیحی وتنقیدی مطالعہ)

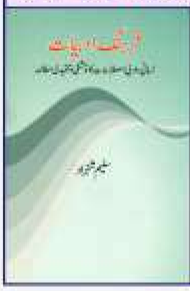

مصنف: سلیم شہزاد

صفحات: 831

قیمت: 345 روپے

عروجِ فن کلیات خلیل الرحمٰن اعظمی

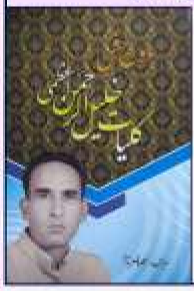

مرتب: ہما مرزا

صفحات: 260

قیمت: 145 روپے

فدائے لکھنؤ

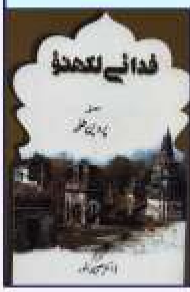

مصنفہ: پروین طلحہ

مترجم: ڈاکٹر صبیحہ انور

صفحات: 182

قیمت: 100 روپے

سماجی تحقیق

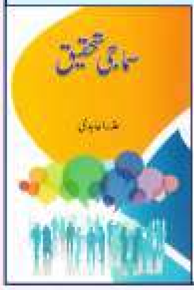

مصنف: عذرا عابدی

صفحات: 490

قیمت: 215 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2017-19
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:**24/11/2018**
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

URDU DUNIYA Monthly, December-2018, Vol.20, Issue:12
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم وآگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان وادب سے متعلق اہم تنقیدی وتحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش وجستجو کو صحیح سمت دینے والے
مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language,
and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025